بہار ۱۹۹۱

آج

ترتیب : اجمل کمال

معاصر اردو فکشن

تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

نیّر مسعود اسد محمد خاں
حسن منظر مسعود اشعر
انور خاں قمر احسن
فہمیدہ ریاض صغیر ملال

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

فروری ۔ مارچ ۱۹۹۲

مینجنگ ایڈیٹر
زینت حسام
اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی شاؤی شپ کراچی ۷۵۸۵۰

کمپوزنگ
پبلشرز یونائٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ابی حسن پرنٹنگ پریس
پاکی اسٹیڈیم کراچی

آج کا یہ شمارہ اردو کے معاصر فکشن کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اردو کے ادبی جریدوں کی مروّج اصطلاح میں اسے افسانہ نمبر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ایک کامیاب کوشش ہے تو آپ اس شمارے کی پینٹ اور اس کے مزاج کو افسانہ نمبروں سے قدرے مختلف پائیں گے۔ رواج سے روگردانی کرتے ہوئے، اس میں بڑے بڑے تسلیم شدہ ناموں کا انبار لگانے کی کوشش سے دانستہ احتراز کیا گیا ہے، کیونکہ ایسی کوشش کا نتیجہ بعض اوقات معیار کے سوال پر مفاہمت کی صورت میں نکلتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس انتخاب کو اردو فکشن میں موجود تمام یا اکثر رجحانات اور دبستانوں کا نمائندہ بنانے سے بھی گریز کیا گیا ہے، جو بذاتہ ایک لحاظ سے قابلِ قدر بات ہوتی۔ لیکن یہ اس جریدے کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔ ممکن ہے سوئے ظن اس احترازوگریز کو ایک نئی گروہ بندی کی کوشش سمجھنے پر مائل کرے۔ لیکن پُرخلوص اور بےتعصّب مطالعہ یقیناً اس بدگمانی کی تردید کر سکے گا۔

اس شمارے میں ایک مکمّل ناول اور تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ آٹھ ادیبوں کی یہ تخلیقات ان کے مخصوص ذاتی تخلیقی عمل اور فنّی ترجیحات کی آئینہ دار ہیں اور، اردو کے بعض ادبی دبستانوں کے طرزِعمل کے برعکس، کسی عائدکردہ ادبی یا غیرادبی نظریے کی پیروی یا تسلیم شدہ شخصیات یا رجحانات کی تقلید کا ناروا بوجھ نہیں اٹھاتیں۔ البتہ ان تخلیقات کا ایک جلد میں یک جا ہونا ایک حائز معنویت کو ضرور راہ دیتا ہے، جو اس جریدے کے مزاج اور سمت کی تشکیل کرتی ہے۔

اس شمارے کو تین حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں نیر مسعود، اسد محمد خاں، حسن منظر، مسعود اشعر، انور خاں اور قمر احسن کی تازہ کہانیاں شامل ہیں۔ دوسرا حصہ قہمیدہ ریاض کے ناول پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ ایک بےحد باصلاحیت اور تازہ کار ادیب صغیر ملال کی کہانیوں کا انتخاب ہے جو جنوری ۱۹۹۲ میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ممکن ہے یہ مختصر انتخاب پڑھنے والوں کے ایک نسبتاً بڑے حلقے کی توجہ صغیر ملال کے سنجیدہ ادبی کام کی طرف مبذول کرا سکے جو اگر مہلت پاتا تو یقیناً اردو کے ادبی سرمائے میں بہت قابلِ قدر اضافہ کرتا۔

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

ترتیب

۱

نیّر مسعود

۹
رے خاندان کے آثار

اسد محمد خاں

۲۴
غصّے کی نئی فصل

حسن منظر

۳۴
بومیدیں

۴۸
سونی بھوک

مسعود اشعر

۶۱
نامحرم

انور خاں

۸۲
پھول کی پتّی سے

قمر احسن

۸۹
شیرِ آہوخانہ

۲

فہمیدہ ریاض

۹۹
گوداوری

rekhta

Scanned with CamScanner

انتخاب

صغیر ملال
بادنما

۱۸۶
آثار

۱۹۱
بکری کا بچّہ

۲۰۱
شناخت

۲۰۷
کج رو

۲۱۳
معذور

۲۱۷
پیوند

کہانیاں

نیّر مسعود　　اسد محمد خاں
حسن منظر　　مسعود اشعر
انور خاں　　قمر احسن

rekhta
Scanned with CamScanner

نیّر مسعود

رے خاندان کے آثار

۱

مجھے عظیم آباد میں پانچواں دن تھا۔ میں وہاں اپنے ایک افسر دوست کے بلاوے پر کچھ دن ان کے ساتھ رہنے کے لیے پہنچا تھا، لیکن میرے اس دورے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مجھ کو اپنے آبائی مکان سے الگ رہنے کی تھوڑی سی عادت ہو جائے اور افسر دوست کے بلاوے کا بھی اصل مقصد شاید یہی تھا۔

اپنے آبائی مکان میں آدھی صدی سے زیادہ کی مدّت گزارنے کے بعد آخر میں نے فیصلہ کیا کہ کسی چھوٹے مکان کی سکونت اختیار کروں۔ اس فیصلے پر خود کو آمادہ کرنے کے لیے مجھے صرف دیر دیر تک سوچنا اور راتوں کو جاگ جاگ کر ٹہلنا پڑا۔ لیکن اس فیصلے پر عمل درآمد کا ایک مرحلہ اپنے مکان کو سامان سے خالی کرنا تھا۔ میرے مکان میں صرف تخت پلنگ اور میز کرسی قسم کی سالم اور شکستہ چیزیں اتنی تھیں کہ اب جس مکان میں مجھے منتقل ہونا تھا اس کے سے تیں مکان بھی ان کی سمائی کے لیے کافی نہ ہوتے، اس لیے ضروری تھا کہ مکان کی فالتو چیزوں کو علیحدہ اور بےکار چیزوں کو ضائع کر دیا جائے۔ میں پہلے بھاری سامان کی طرف متوجّہ ہوا، اور دماغ کو اُلجھانے والا یہ مرحلہ بھی کسی طرح سر ہو گیا۔ لیکن جب چھوٹی چھوٹی چیزوں کی باری آئی تو دماغ کے ساتھ میرا دل بھی الجھ گیا۔ جس چیز کو بھی میں بےکار سمجھ کر اٹھاتا وہ اچانک بہت کام کی معلوم ہونے لگتی، اور اگرچہ اس کا کوئی مصرف میری سمجھ میں نہ آتا لیکن میرا دل اسے ضائع کرنے پر آمادہ نہ ہوتا اور میں اسے وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

اسی الجھن کے زمانے میں ایک دن میں نے ایک صحنچی کی اُس دیواری الماری کو کھولا جس میں میرے بچپن کے زمانے کی فضول چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ الماری کے پٹوں کی لکڑی گل گئی تھی اور اندر کی کچھ چیزیں باہر سے بھی نظر آ رہی تھیں۔ خانوں کے تختے نیچے کو جھک گئے تھے اور پُشت کی دیوار کی مٹّی پھُول پھُول کر ان پر ڈھیر ہو رہی تھی۔ تمام چیزوں پر گرد کی تہہ آ گئی تھی اور ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز کسی بھی کام کی نہیں ہے، پھر بھی میں تختوں پر کی مٹی کریدتا اور ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر

دیکھتا اور نیچے زمین پر ڈالتا رہا۔ میرے بڑے بھائی، جو اب پردیس میں بس گئے تھے، اُن کا سامان بیچ والے خانے میں تھا۔ اس میں زیادہ تر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ادھوری کہانیاں، پسندیدہ شعروں کی کاپیاں اور رسالوں سے کاٹی ہوئی تصویریں تھیں۔ ایک مکمّل مگر بلاعنوان افسانہ کسی کی نایختہ تحریر اور غلط سلط زبان میں تھا، اور یہ "نوبہار گل ریز" یا ایسے ہی کسی رومانی نام سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اسے سرسری پڑھا۔ یہ ایک بچرزدہ مفلس عاشق کی نامراد محبت کی داستان تھی جو دولت مند محبوبہ کے نام خطوں کی شکل میں لکھی گئی تھی، اور اس میں میرے بچپن کے چلتے ہوئے فلمی گیتوں کے مُکھڑوں سے بہت کام لیا گیا تھا۔ آخری خط میں محبوبہ کو اس کی شادی کی مبارک باد اور پھُولنے پھَلنے کی دعائیں دینے کے بعد ایک مکمّل فلمی گیت سے کام لیتے ہوئے خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔

خود میرا سامان اوپر اور نیچے والے خانوں میں تھا۔ اس میں میرے وقتی مشغلوں کے باقیات، چٹخے ہوئے قلم، چاقوؤں کے زنگ کھائے ہوئے پھل، جادوئی تماشے دکھانے کا ٹوٹاپھوٹا سامان، بچّوں کے پھٹے پرانے رسالے وغیرہ تھے۔ ایک کونے میں کسی زمانے کی مشہور ولایتی خوشبو کی دو خالی شیشیاں تھیں۔ یہ خوشبو اپنے وقت میں اتنی مقبول تھی کہ افسانوں میں اس کا نام آتا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی ان چپٹی شیشیوں کے ڈھکن غائب تھے۔ میں نے شیشیوں کو باری باری سونگھا، خوشبو بھی غائب تھی۔

اُس افسانے کی طرح ان شیشیوں کو بھی دیکھ کر مجھے کچھ یاد نہیں آیا، لیکن جب میں نے افسانے کے کاغذوں میں شیشیوں کو لپیٹ کر صحن میں پھینکنے کے لیے ہاتھ گھمایا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ بھی کام کی چیزیں ہیں۔ میرا ہاتھ رُکنے لگا اور میں نے انھیں وہیں نیچے زمین پر ڈال دیا۔ الماری کی باقی تمام چیزوں کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ یاد آتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ان میں سے ایک چیز کو بھی الگ نہیں کر سکتا۔ اور جب میں نے انھیں پھینکنے پر خود کو آمادہ کرنے کی کمزور سی کوشش کی تو پتا چلا کہ میں اپنا مکان چھوڑنے پر بھی خود کو آمادہ نہیں کر سکا ہوں۔ یہاں تک کہ صحنچی کی میلی دیواروں پر سفیدی کی ڈھلکی ہوئی بوندیں جنھیں معماری کی اصطلاح میں آنسو کہا جاتا ہے، میں انھیں بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں۔ اس وقت ان ڈھلکی ہوئی بوندوں پر نظریں جما کر میں نے خود کو ایسی ایسی باتیں سوچتے ہوئے پایا جنھیں اگر لکھ لیتا تو ان پر نوبہار گل ریز کے کسی افسانے کا گمان ہوتا، لیکن اس کا احساس مجھے دیر کے بعد ہوا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ الماری کو کھول کر میں نے صرف وقت ضائع کیا ہے۔ میں نے زمین پر ڈالی ہوئی سب چیزوں کو، افسانے میں بندھی ہوئی نیلی شیشیوں کی پڑیا کو بھی، سمیٹ کر پھر سے الماری میں بھر دیا اور اس کے پٹ کھلے چھوڑ کر صحنچی سے باہر آ گیا۔

میں نے سفر کا مختصر سا سامان درست کیا، راستے میں پڑھنے کے لیے ایک کتاب اٹھائی اور اسی دن عظیم آباد روانہ ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

۲

دوست نے تپاک سے میرا خیرمقدم کیا۔ وہ وہاں ڈاک کے محکمے کے سربراہ تھے اور ایک بڑے رقبے کے سرکاری مکان میں رہتے تھے۔ میرے کہنے پر انھوں نے سب سے پہلے مجھ کو اس مکان کی سیر کرائی۔ میں نے اس کی کشادگی کی تعریف کی تو انھوں نے اس کی خرابیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ سب سے بڑی خرابی انھوں نے یہ بتائی کہ اس کے ایک درجے سے دوسرے درجے میں جانے کے لیے لمبا فاصلہ طے کرنا ہوتا تھا۔

"اب اتنے بڑے مکانوں کا زمانہ نہیں رہا۔" انھوں نے آخر میں کہا، "خاص کر..." پھر وہ رُک گئے اور دوسری باتیں کرنے لگے۔ کئی دن تک دفتری مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے مقامی دوستوں سے میری ملاقاتیں کرواتے رہے۔ وہ مجھ کو اپنے دفتر بھی ساتھ لے جاتے تھے، جہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کے عملے کا کوئی نہ کوئی آدمی ان سے احکام لینے آتا رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں ان کو مجھ سے باتیں کرنے کا بھی وقت مل جاتا تھا، لیکن میرا زیادہ وقت وہ کتابیں پڑھنے میں گذرتا تھا جو میں چلتے وقت دوست کے کتب خانے سے نکال لیتا تھا۔

ایک دن میں اپنے گھر سے ساتھ لائی ہوئی کتاب لے کر اُن کے دفتر پہنچا۔ عملے کے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ دوست نے اپنی سرکاری زندگی کی پیچیدگیوں کا ذکر کیا۔ سب سے زیادہ افسوس ان کو اس کا تھا کہ شہربھر میں ان کے محکمے کے ملازم پھیلے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے ان کا گلی کوچوں میں بےمقصد گھومنا پھرنا ممکن نہیں رہا۔

"کہیں بھی جاؤں۔" انھوں نے بیزاری کے ساتھ کہا، "کوئی نہ کوئی پہچاننےوالا دیکھ لے گا اور سوچنے لگے گا صاحب یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"تو سوچنے دیجیے۔" میں نے کہا۔

"پھر اپنی طرف سے کچھ قیاس کرے گا۔"

"پھر؟"

"پھر؟ پھر اس قیاس پر یقیں کر لے گا۔ پھر دوسروں کو یقیں دلائے گا۔ پھر کوئی ایسی بات مشہور ہو جائے گی جو میں نے خواب میں بھی نہ سوچی ہو۔"

"ہاں،" میں نے کہا، "شہرت کی کچھ قیمت تو چکانا ہی پڑتی ہے۔"

"شہرت کی قیمت!" انھوں نے حقارت سے کہا اور پہلے سے بھی زیادہ بیزار ہو گئے۔

"کم سے کم آپ کے محکمے میں..."

"میرے محکمے میں..." وہ کہتے کہتے رُکے اور اچانک ان کی بیزاری ختم ہو گئی۔ "آپ کو شاید خبر نہیں، میرے محکمے میں تو اس وقت آپ کی شہرت گونج رہی ہے۔"

"میری؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"سب سخت پریشان ہیں کہ یہ پُراسرار شخص کون ہے جس کو صاحب سائے کی طرح ساتھ رکھتے ہیں۔"

"یا جو سائے کی طرح صاحب کے ساتھ لگا رہتا ہے۔"

"یا صاحب جس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔" انھوں نے کہا اور ہنسنے لگے۔

"تو میرا نام پتا بتا کر بےچاروں کی پریشانی ختم کیجیے۔"

"بےچاروں کی پریشانی تو ختم ہو جائے گی، لیکن اس کے بعد آپ کی پریشانی جو شروع ہو گی..."

پھر انھوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ان تک سفارش پہنچانے کے لیے لوگوں کو ان کے قریبی دوستوں کی تلاش رہتی ہے، اور سب کو یقیں ہو گیا ہے کہ ان کے پُراسرار دوست سے زیادہ کسی کی سفارش ان پر اثر نہیں کر سکتی، اور اگر ان لوگوں کو میرا نام پتا معلوم ہو گیا تو میں کبھی چین سے نہ بیٹھ سکوں گا۔

"لیکن میں تو کچھ دن میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔"

"کہیں بھی چلے جائیے۔" وہ بولے، "میرے محکمے کے لیے آپ کو ڈھونڈھ نکالنا کیا مشکل ہے۔"

"پھر مجھے گم نام رہنے دیجیے۔"

"جی ہاں، میں اس کی خاص احتیاط کر رہا ہوں۔ آپ بھی احتیاط رکھیے گا۔"

کچھ دیر بعد ان کی مصروفیت کا وقت آ گیا اور وہ عملے کے لوگوں کو بلوا بلوا کر ہدایتیں دینے لگے، اور میں اپنے ساتھ لائی ہوئی کتاب بےتوجّہی سے پڑھتا رہا۔ میں نے شروع کے آٹھ دس صفحے پڑھے ہوں گے کہ دوست کی آواز سنائی دی:

"کیا پڑھا جا رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کتاب اُن کے ہاتھ میں دے دی۔ "گھر سے چلتے وقت اٹھا لایا تھا۔ راستے میں پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔"

انھوں نے بلند آواز سے کتاب کا نام پڑھا۔

"میری پسندیدہ کتاب تھی۔" میں نے کہا۔

"میں خود اس کا دیوانہ تھا۔" وہ بولے۔ "مجھے تو اس کے بعض حصّے آج تک زبانی یاد ہیں۔"

"مجھے بھی۔" میں نے کہا۔

"اور آپ کو معلوم ہے؟" انھوں نے کہا، "اس کا مصنّف اسی شہر میں زندہ موجود ہے۔"

"معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"سوچتا ہوں کسی دن ملا جائے۔" وہ بولے اور کتاب کے ورق پلٹنے لگے۔ پھر انھوں نے جُھک کر زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی، کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے، پھر میری طرف بڑھا کر بولے:

"آپ کی تعریف؟"

یہ ایک جواں لڑکی کی تصویر تھی۔ کاغذ کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا لیکن تصویر بہت صاف اُتی تھی۔ لڑکی اپنے رُوکھے بال کندھوں پر پھیلائے، آنکھوں میں رازوں بھری چمک اور ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتی ہوئی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے تصویر کو کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد دوست سے کہا:

"آپ ہی بتائیے۔"

Scanned with CamScanner

"وہ میرے بھائی صاحب سے افسانوں پر اصلاح لیتے تھے۔" میں نے انھیں بتایا، "مگر ان کے افسانے چھپنے کے قابل نہیں ہو پاتے تھے۔"

"اصلاح کے بعد بھی؟"

"ان میں افسانے کم، فلمی گانے زیادہ ہوتے تھے۔ گیتوں بھری کہانیاں سمجھیے۔"

"نوبہار گل ریز؟" دوست نے پھر بُرا سا منھ بنایا۔ "اور ان خاتون کا نام؟"

"وہی یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اُس خوشبو کا نام تو یاد آ رہا ہے جو وہ استعمال کرتی تھیں۔ اس کی شیشیاں خالی ہو جانے پر وہ مجھے دے دیتی تھیں۔"

"خالی شیشیاں؟"

"مجھے اُن کا نیلا رنگ اچھا لگتا تھا۔"

"نیلے رنگ پر یاد آیا۔" انھوں نے کہا، "حکیم جالینوس کا نیا خواب آپ نے سنا؟ کچھ دن ہوئے ان کا خط آیا تھا کہ وہ فالج کے ایک مریض کا نیلے رنگ سے علاج کر رہے ہیں اور اس کو قریب قریب ٹھیک کر لائے ہیں۔ آپ کے پاس خط نہیں آیا؟"

"آیا تھا، مگر اس میں صرف یہ لکھا ہے کہ مجھ کو کئی کئی رنگوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

"اور وہ کون کون سے مخدوش رنگ ہیں؟"

"جتنے رنگوں کے نام مجھے معلوم ہیں، وہ سب، اور ان کے علاوہ بھی کئی، جن میں سے دو کو وہ میرے مزاج کے آدمی کے لیے قاتل بتاتے ہیں۔"

دفتر کا باقی وقت انھیں حکیم کے لطیفوں میں گذر گیا۔ بڑھاپے نے ان کے دماغ پر اثر کیا تھا۔ وہ مجھے اور میرے دوست کو لمبے لمبے خط لکھتے تھے جن میں اُن کے طبّی کارناموں کا تذکرہ زیادہ ہوتا تھا۔ اُن کو یقین تھا کہ ساری دنیا میں ہم دو ہی ان کے قدردان رہ گئے ہیں۔ انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہم نے ان کا نام حکیم جالینوس رکھا ہے۔

۳

میری واپسی کا وقت قریب تھا۔ دوست کے یہاں تین دن کی چھٹیاں ہونے والی تھیں جن کے بعد میرا جانا طے تھا۔ چھٹیاں شروع ہونے سے ایک دن پہلے میں دفتر میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ اپنے ڈرائیور کو کچھ ہدایتیں دے رہے تھے۔ ڈرائیور واپس جانے لگا تو انھوں نے اس کو روکا اور مجھ سے بولے،

"اگر آپ کو یہاں کسی سے ملنے جانا ہو تو گاڑی حاضر ہے۔"

"یہاں جو آپ کے دوست ہیں انھیں میں کچھ میرے بھی دوست ہیں۔ سب سے ملاقات ہو گئی، اب آپ ہی رہ گئے ہیں۔"

وہ زور سے ہنسے، پھر سنجیدہ ہو کر اپنی دفتری مصروفیتوں کی شکایتیں کرنے لگے۔

"کل سے جم کر گفتگو ہوں گی۔" انھوں نے ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور کے جانے کے بعد مجھے یاد آیا اور میں نے کہا،

"اُس دن کتاب میں سے جن کی تصویر نکلی تھی..."

"آپ بتائیے۔" وہ بولے، "یہ خاتون آپ ہی کے قبضے سے برآمد ہوئی ہیں۔"

انھوں نے کھلی ہوئی کتاب مجھ کو دکھائی۔ اس کا کاغذ مٹ میلا ہو چکا تھا لیکی داہنے اور بائیں صفحے پر تصویر کی ناپ کے چوکھٹے سفید رہ گئے تھے۔ میں نے تصویر کو ہتھیلی پر رکھ کر ذرا دیر تک غور سے دیکھا۔ گردن تھوڑی اڑی کیے میری طرف دیکھتی ہوئی صورت مجھے آشنا سی معلوم ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے مجھ کو اس پر ایک پرانی فلمی اداکارہ کا گمان ہوا۔ لیکی یہ اُس کی تصویر نہیں تھی۔ میں نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا۔ پُشت پر بہت کچّی تحریر میں صرف اتنا لکھا تھا،

"میں وہم نہیں حقیقت ہوں۔"

میں اس فقرے سے آشنا تھا۔ یہ اُسی اداکارہ کا، غالباً اس کی پہلی فلم کا، بولا ہوا ایک مکالمہ تھا جو بہت مقبول ہوا تھا۔ میں نے پلٹی ہوئی تصویر اپنے دوست کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ تحریر کو دیکھ کر زور سے ہنسے، پھر اس فقرے کو مختلف ڈرامائی لہجوں میں بار بار دُہرانے لگے، اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا ذہن اُلٹے قدموں چلتا ہوا مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ تصویر پھر میرے ہاتھ میں تھی اور اس کے پیچھے مجھ کو طرح طرح کے منظر اُبھرتے اور دُھندلا کر غائب ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ آخر مجھے اپنے دوست کی آواز پھر سنائی دی،

"میں وہم نہیں۔" وہ کسی زبردست راز کا انکشاف کرنے والے لہجے میں کہہ رہے تھے، "حقیقت ہوں۔"

پھر انھوں نے اسی تصویر کی سی صورت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے میری طرف دیکھا، اور میں نے کہا،

"یہ میری بڑی بہن کی دوست تھیں، اینگلوانڈین۔"

"تو ان کی تصویر آپ کیوں لیے پھرتے ہیں؟"

"یہ میری بہن کی کتاب ہے۔" میں نے کہا، "اور آج کوئی چالیس برس کے بعد کھولی گئی ہے۔ تصویر میں نے اُس وقت دیکھی تھی جب یہ تازہ تازہ کھینچی تھی۔"

انھوں نے تصویر میرے ہاتھ سے لے لی۔ کچھ دیر تک سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھتے رہے، پھر بولے،

"اینگلوانڈین، تو یہ آپ لوگوں سے کہاں ٹکرا گئیں؟"

"میری بہن کے ساتھ پڑھتی تھیں، عیسائی اسکول تھا۔ کئی لڑکیاں ساتھ مل کر امتحان کی تیاری کرتی تھیں، ہمارے ہی گھر میں۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔"

دوست نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا۔

"میں وہم نہیں حقیقت ہوں۔" انھوں نے پڑھا۔ "ادب سے بھی شوق فرماتی تھیں؟"

"نہیں، فلمی فقرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکی ان کے بھائی افسانے لکھتے تھے، نوبہار گل ریز کے نام سے۔"

"نوبہار گل ریز؟" دوست نے بُرا سا منھ بنایا۔ انھیں بھی شاعرانہ فلمی ناموں سے چڑ تھی۔ "کبھی نام نہیں سنا۔"

Scanned with CamScanner

"وہی جو وہم نہیں حقیقت تھیں؟"

"تھیں یا ہیں،" میں نے کہا۔ "ہاں وہی، وہ شاید یہیں رہتی ہیں۔"

"نام یاد آیا؟"

"صرف اتنا یاد آیا ہے کہ ان کا خاندانی نام رے تھا۔"

"اور وہ یہاں، عظیم آباد میں، رہتی ہیں؟"

"برسوں پہلے، یاد نہیں کس طرح، معلوم ہوا تھا کہ وہ عظیم آباد میں ہیں۔ معلوم نہیں اب بھی ہیں یا نہیں۔"

"معلوم ہو جائے گا۔"

"مشکل ہے۔"

"ہمارے محکمے کے لیے مشکل نہیں۔ دیکھتے جائیے۔"

انھوں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور کہا،

"فرینک کو بھیج دو۔"

فرینک ادھیڑ عمر کے خوش پوشاک آدمی تھے۔ میں انھیں دفتر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ انھوں نے اندر آ کر ہم دونوں کو سلام کیا اور دوست کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"فرینک،" دوست نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "انھیں یہاں ایک کرسچین خاتون سے ملنا ہے۔ وہ رے خاندان کی ہیں۔ نام پتا کچھ نہیں معلوم۔"

"اینجلا ان کا نام ہے۔" اچانک مجھے یاد آ گیا، "اینجلا رے۔"

"ان کا اتاپتا معلوم کرنا ہے۔ یہ تین دن بعد واپس جا رہے ہیں۔"

"معلوم ہو جائے گا سر،" فرینک مستعدی سے بولے، "کل، زیادہ سے زیادہ پرسوں، بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم گھر ہی پر رہیں گے۔"

فرینک سلام کر کے واپس جاتے جاتے رکے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا،

"سر، اگر وہ مل جائیں تو انھیں کیا بتاؤں؟"

دوست نے جواب دیا،

"کہنا آپ کے ایک پرانے دوست..." وہ ذرا رکے۔

"پرانی دوست کے بھائی۔" میں نے کہا۔

"پرانی دوست کے بھائی یہاں آئے ہوئے ہیں،" دوست نے کہا، "آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"سر، اگر وہ نام پوچھیں؟"

"نام بھی بتا دیا جائے گا۔" دوست نے کہا، "پہلے ان کا پتا تو لگاؤ۔"

۴

فرینک تیسرے دن سہ پہر کو آئے۔ کچھ تھکے ہوئے اور شرمندہ سے معلوم ہو رہے تھے۔ آتے ہی کہنے لگے،

"سر، رے فیملی کا کوئی پتا نہیں چل رہا ہے۔"

دوست نے میری طرف دیکھا۔

"چھوڑیے،" میں نے کہا، "وہ لوگ کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔"

"ہاں،" دوست نے کہا، "انھیں بہت پہلے معلوم ہوا تھا کہ..."

"نہیں سر،" فرینک بولے، "وہ لوگ اگر کبھی بھی یہاں رہے ہوتے تو معلوم ہو جاتا۔ چھوٹی کمیونٹی ہے، سب کو ایک دوسرے کی خبر رہتی ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے، "سر، معاف کیجیے گا، آپ کو ان کا نام ٹھیک یاد ہے؟"

"ہاں بھئی،" میں نے کہا، "اینجلا رے ان کا نام تھا۔ ان کے بھائی..."

"وہی گلشنِ ہمیشہ بہار؟" دوست نے مسکرا کر سرگوشی کی۔

"نوبہار گل ریز،" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا، پھر فرینک سے کہا، "بھائی کا نام جُولیس رے تھا۔ ایک بہن میڈلین رے۔ ان سب سے بڑی ایک اور بہن تھیں۔" مجھے وہ بھی یاد آئیں، "اور ہاں..." مجھے کچھ اور یاد آ گیا، "ان کی ماں کی وفات لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ انھیں کینسر ہو گیا تھا۔"

اور مجھے ایک جُھرجُھری آئی۔

ooo

اینجلا کی ماں کو میں نے دیکھا نہیں تھا، لیکن اُن کی بیماری کا چرچا ہمارے یہاں ہوتا تھا اور میں سُنتا تھا کہ ان کے بچنے کی امید نہیں ہے۔ ہم لوگ ان کے آخر وقت میں انھیں دیکھنے گئے تھے۔ وہ پہلا اور آخری موقع تھا جب میں نے اینجلا کا گھر اور اینجلا کو گھر میں دیکھا تھا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا مکان اور اس کے آگے گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ تھا جسے پھولوں کی دو تین کیاریوں اور مورپنکھی کے ایک درخت کی وجہ سے باغیچہ کہا جا سکتا تھا۔ مکان کی پُشت پر دور کسی اور جگہ لگے ہوئے یوکلپٹس کے درخت جھومتے نظر آ رہے تھے۔ ہم لوگ سورج ڈوبتے وقت وہاں پہنچے تھے۔ باغیچے کے پھاٹک کے آگے اینجلا معمولی لباس پہنے انتظار میں کھڑی تھیں۔ انھوں نے میری بہن اور دوسری سہیلیوں کو باری باری چمٹایا۔ اسی میں ان کی نظر مجھ پر پڑی اور انھوں نے کہا،

"تم بھی آ گئے؟"

پھر انھوں نے ہم سب کو مکان کے باہر کی طرف والے کمرے میں بٹھایا اور کمرے سے نکل گئیں۔ فوراً ہی واپس آئیں اور سہیلیوں سے دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگیں۔ کمرے کا سامان معمولی مگر بڑے قرینے سے سجا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہر چیز کی ابھی ابھی جھاڑپونچھ ہوئی ہے۔ میں نے ایک ایک چیز کو دل چسپی سے دیکھا۔ کچھ دیر بعد میڈلین کمرے میں داخل ہوئیں اور اینجلا اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"آؤ۔" انھوں نے اپنی سہیلیوں سے کہا، اور جب ہم کمرے سے باہر نکلنے لگے تو وہ مجھ سے بولیں،

Scanned with CamScanner

"تم چاہے یہیں بیٹھو۔"

لیکی میں سب کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ پتلے برآمدے میں داہنے ہاتھ پر ایک اور دروازہ تھا، اور اس سے کچھ آگے بڑھ کر ایک اور۔ ہم اس آخری دروازے میں داخل ہوئے۔ یہ چھوٹا سا کمرا تھا۔ میری ناک میں دواؤں کی بُو آئی جس سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ کمرے میں دواؤں کی میز کے علاوہ بچوں والی ایک پلنگڑی اور ایک بڑی مسہری تھی۔ پلنگڑی کی سفید چادر پر بغیر تہہ کیا ہوا کتھئی رنگ کا ایک سُوتی کمبل پڑا تھا۔ پلنگڑی سے ملی ہوئی مسہری پر بھاری بدن کی ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں آنکھیں کھلی رکھنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ سب لڑکیوں کی نظریں انہیں پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھ کو وہ اتنی بیمار نہیں معلوم ہوئیں کہ ان کے بارے میں مایوسی کی باتیں کی جائیں۔ البتہ وہ خود مایوسی کی باتیں کر رہی تھیں۔ کسی کے کچھ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ رانوں کو لگاتار جاگنے کی وجہ سے اُن کا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جولیں کو تار دے دیا گیا ہے کہ آ کر ماں کو دیکھ لیں، اور جولیں کے ابھی تک نہ پہنچنے پر تشویش ظاہر کی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے اینجلا سے کچھ پوچھا اور اینجلا نے جواب دے کر آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ میں پلنگڑی کی پٹی پر گھٹنے ٹکائے کھڑا اُن خاتون کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا پلنگڑی نے ہلکی سی جُھرجُھری لی ہے۔ اُسی وقت میری بہن نے کوئی تسلی کی بات کہی اور خاتون نے مایوسی کا جواب دے کر پلنگڑی کی طرف اشارہ کیا۔ پلنگڑی نے پھر ہلکی سی جُھرجُھری لی اور میں نے دیکھا کہ کتھئی کمبل ذرا سا ہلا۔ کمبل میں لپٹا سکڑا ہوا بدن مجھے نظر نہیں آیا، لیکن کھلے ہوئے چہرے کو میں نے غور سے دیکھا۔ یہ میری طرف کروٹ لیے ہوئے ایک بوڑھی عورت کا جُھلسا ہوا کتھئی چہرہ تھا جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور بند تھیں۔ چہرے سے اذیت ظاہر تھی لیکن وہ عورت ہنس رہی تھی، اس طرح کہ سفید دانتوں کی دونوں قطاروں کی آخری ڈاڑھیں تک دکھائی دے رہی تھیں۔ کمرے کی خاموشی میں مجھے اینجلا کی تیز سسکی اور گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی:

"اُدھر نہ دیکھو!"

لیکن میں نے دیکھا کہ اُس ہنستی ہوئی عورت کے مرجھائے ہوئے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے ہیں۔ مگر اس کے دانت اب بھی اُسی طرح نظر آ رہے تھے۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ ہنس نہیں رہی ہے۔ ہونٹوں کے کونے سے لے کر کان کے قریب تک اس کے داہنے رخسار کا سارا گوشت گل کر غائب ہو چکا تھا۔

کوشش کے باوجود میری نظریں کھلے ہوئے دانتوں پر سے ہٹ نہیں پا رہی تھیں اور میرے گھٹنے پلنگڑی کی پٹی سے چپک کر رہ گئے تھے۔ میری یہ کیفیت کسی کسی ڈراونے خواب میں ہو جاتی تھی اور اس کا علاج آنکھ کا کھل جانا ہوتا تھا، لیکن اس وقت، جاگتے میں، میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ آنکھیں بند کر لینے کی کوشش کروں۔ میں نے کوشش کی لیکن آنکھوں نے بند ہونے سے انکار کر دیا۔ میں نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن پلنگڑی کی پٹی نے میرے گھٹنوں کو جکڑ رکھا تھا۔ اس کشمکش میں مجھ کو اینجلا کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس

ہوا۔ انہوں نے مجھ کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اُس کمرے سے باہر لے آئیں۔ وہ مجھے پیچھے برآمدے کے درمیانی کمرے میں لائیں جہاں کھانے کی میز پر چُنے ہوئے سامان، شیشے کے گلاسوں اور گلاسوں میں پھنسے ہوئے سفید کاغذی رومالوں کو میں نے دُھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ کمرے میں تازہ پھولوں اور پیسٹری کی خوشبو تھی لیکن اُس نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ اینجلا نے ایک طشتری میں کئی چیزیں نکال کر میری طرف بڑھائیں لیکن میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اور گھٹی ہوئی آواز میں صرف اتنا پوچھا:

"وہاں جو مسہری پر بیٹھی ہوئی تھیں، وہ کون تھیں؟"

اینجلا نے بتایا کہ وہ اُن کی سب سے بڑی بہن ہیں جو ماں کی تیمارداری کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ پھر انہوں نے مجھ کو سمجھانا بجھانا شروع کیا۔ وہ بار بار زور دے کر کہہ رہی تھیں کہ اُن کی ماں ہمیشہ سے ایسی نہیں تھیں۔ انہوں نے رومال سے میرا چہرہ پونچھا۔ مجھے رومال میں اُن کے آنسوؤں کی نمی اور نیلی شیشی والی خوشبو کی ہلکی سی لپٹ محسوس ہوئی۔ اینجلا تیزی سے کمرے کے باہر گئیں اور ہاتھ میں ایک البم لیے ہوئے واپس آئیں۔ انہوں نے مجھ کو اپنی ماں کی پرانی تصویریں دکھائیں۔ اُن کی شکل اینجلا سے بہت ملتی تھی اور مسکراتے میں بیٹی کی طرح اُن کے بھی گال میں گڑھا پڑتا تھا۔ اینجلا بتاتی جا رہی تھیں کہ کون سی تصویر کس موقعے کی ہے۔ کئی تصویروں پر مجھ کو اینجلا کا دھوکا ہوا، لیکن اُن تصویروں میں اینجلا خود بھی موجود نہیں، کبھی ماں کی گود میں، کبھی ان کی انگلی پکڑے ہوئے۔ میں دل چسپی کے بغیر ان تصویروں کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ میڈلین کے ساتھ میری بہن اور دوسری سہیلیاں کمرے میں آ گئیں۔

ooo

فرینک اور میرے دوست کسی بات پر ہنسے اور مجھے محسوس ہوا کہ اینجلا کا ہاتھ ابھی ابھی میرے کندھے پر سے ہٹا ہے۔ وہ دونوں شہر کے مختلف ڈاک خانوں اور اُن کے عملے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ فرینک ایک بار پھر معافی مانگتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے:

"سر، اُن لیڈی کی شادی ہو گئی تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم،" میں نے جواب دیا، "ہو ہی گئی ہو گی۔ چالیس سال پہلے تک تو نہیں ہوئی تھی۔"

"میرا مطلب ہے شادی کے بعد ان کے نام میں رہ گئی جگہ..."

"ہاں، اس کا تو ہم نے خیال ہی نہیں کیا۔" دوست نے چونک کر کہا، "اگر اُن کی شادی، فرض کیجیے، ہمارے فرینک کے ساتھ ہو گئی..."

"سر..." فرینک نے کچھ کہنا چاہا، پھر شرما کر ہنسنے لگے۔

"...تو اب وہ اینجلا فرینک ہوں گی، بلکہ صرف مسز فرینک... کیوں جی،" وہ فرینک کی طرف مڑے، "اب کے کرسمس میں مسز فرینک سے ان کا نام پوچھ لوں؟"

فرینک پھر "سر" کہہ کر شرما گئے۔

Scanned with CamScanner

"آپ کو خواہ مخواہ پریشان ہونا پڑا۔" میں نے فرینک سے کہا۔

"ہاں، میرا خیال ہے اب اُن خاتون کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔" دوست بولے، "فرینک ایسی چیز ہیں کہ اینجلا کے نام سے بھی ان کو ڈھونڈھ نکالتے۔ اگر وہ انھیں بھی نہیں ملیں تو سمجھ لینا چاہیے..."

"نہیں سر، میں اینجلا سے زیادہ رے پر دھیان دے رہا تھا۔"

"پھر بھی،" دوست نے کہا، "میں سمجھتا ہوں وہ عظیم آباد میں کبھی رہتی ہی نہیں تھیں۔"

"جی ہاں،" میں نے کہا، "شاید مجھ کو غلط یاد آیا۔"

دوست نے فرینک کا شکریہ ادا کیا، میں نے معذرت کی، اور فرینک "کوئی بات نہیں، سر" کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے مجھ کو ایک بار غور سے دیکھا، کچھ پوچھتے پوچھتے رُکے، اور سلام کر کے چلے گئے۔

"اور اس طرح،" میرے دوست نے مکالمہ بولنے کے انداز میں کہا، "اس طرح، بی بی اینجلا رے، یا اینجلا کوئی اور! ہم آپ کی تلاش میں ناکام ہوئے۔"

"ہمیں اُن کی تلاش تھی ہی نہیں،" میں نے کہا، "پھر ناکامی اور کامیابی..."

"اور اس طرح، بی بی اینجلا رے، یا اینجلا کوئی اور؟" دوست اسی انداز میں بولے، "اس طرح، ثابت ہوا کہ آپ حقیقت نہیں، وہم ہیں۔"

"لیکن چالیس سال..."

"اگرچہ چالیس سال پہلے، بی بی اینجلا، آپ وہم نہیں، حقیقت تھیں۔"

"اور اگر آپ اسی رنگ میں بولتے رہے تو آپ کو بی بی اینجلا کی بددعا لگ جائے گی! پھر آپ اسی رنگ میں بولتے... بولنے ہی نہیں لکھنے بھی لگیں گے۔"

"بی بی اینجلا، اگر مجھ کو آپ کی بددعا لگ گئی تو میں حکیم جالینوس کے کسی قاتل رنگ سے خودکشی کر لوں گا۔" انھوں نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔

اُسی رات ہم حکیم جالینوس کے نام اپنے مشترکہ خط کا مسوّدہ تیار کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوست نے رسیور اٹھایا۔ کچھ دیر تک کچھ سنتے رہے، پھر "ایک منٹ" کہہ کر میری طرف مڑے۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے کہا:

"عظیم افسانہ نگار، گلزار پُربہار، غالباً دریافت ہو گئے ہیں۔"

"جولیس رے؟" میں نے پوچھا۔

"جی۔" وہ رسیور میری طرف بڑھا کر بولے، "بات کر لیجیے۔"

"کیا وہ خود ہیں؟" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں فرینک ہیں۔"

"تو آپ ہی بات کر لیجیے۔" میں نے کہا، اور بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی، فرینک..." دوست نے فون میں کہا اور دیر تک خاموشی کے ساتھ دوسری طرف کی آواز سنتے رہے، پھر بولے:

"کہاں؟... اور یہ کب کی بات ہے؟... ظاہر ہے... نہیں، ڈینیل کو میں جانتا ہوں، خبطی ہو گئے ہیں، ہر سال تو اپنی عمر میں دس پانچ سال گھٹا بڑھا دیتے ہیں... ہاں، کچھ بھی نہیں... خیر، دیکھ لو۔"

انھوں نے رسیور رکھ دیا اور کہنے لگے:

"فرینک نے ایک صاحب کو ڈھونڈھ نکالا ہے جن سے کسی زمانے میں رے خاندان کا ایک نوجوان گٹار بجانا سیکھتا تھا۔ انھیں اُس کا پہلا نام یاد نہیں، ہو سکتا ہے پوچھا ہی نہ ہو۔"

"یہ کون صاحب ہیں؟"

"ڈینیل بار۔ یہ شہر شہر گھوم کر گٹار سکھانے کے عارضی اسکول کھولتے تھے۔ گٹار فروخت بھی کرتے تھے۔ خریدار، ظاہر ہے، زیادہ تر اُن کے شاگرد ہوا کرتے تھے۔"

"جولیس... اُس نوجوان رے سے اُن کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"یہی تو مصیبت ہے،" دوست نے کہا، "ڈینیل ہمارے حکیم جالینوس سے بھی زیادہ بوڑھے ہیں اور اُن کے زمان و مکان کچھ اور ہو گئے ہیں۔ بتاتے ہیں رے سے اُن کی ملاقات بیس سال پہلے ہوئی تھی، لیکن اُن کے بیس سال کا مطلب دو سال بھی ہو سکتا ہے اور دو سو سال بھی۔"

"ملاقات کہاں ہوئی تھی؟" میں نے پھر پوچھا۔

دوست نے کسی پوپلے بوڑھے کی سی تھرتھراتی اور اٹکتی ہوئی آواز بنا کر کہا:

"ساؤتھ کے کسی شہر میں، نہیں تو نارتھ کے..." پھر دانت پیس کر بولے، "پاگل کر دینے والا آدمی ہے۔ مگر اپنے فن کا استاد تھا۔"

"غرض کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔"

"نہیں، بہرحال تھوڑا امکان ہے کہ ڈینیل والے رے آپ کے جولیس ہی ہوں۔" دوست نے کہا اور عجیب طرح سے مسکرائے، "اور فرینک دُعا کر رہے ہیں کہ وہی ہوں۔"

"اس سے کیا حاصل ہو گا؟"

"حاصل؟ آگے سنیے۔ ڈینیل کو وہ نوجوان رے اس لیے یاد رہ گیا کہ گٹار کے سبق شروع ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد اُس نے خودکشی کر لی۔ ڈاکٹروں نے اسے کینسر بتا دیا تھا۔"

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"اس سے بھی کیا حاصل؟" آخر میں نے پوچھا۔

"حاصل یہ کہ ڈینیل کا وہ شاگرد اگر نوبہار... اگر جولیس رے تھا تو، فرینک کو امید ہے، اُس کے حوالے سے اینجلا کا سُراغ مل جائے گا۔" وہ پھر اُسی طرح مسکرائے، "کسی بےنشان اینگلوانڈین عورت کے مقابلے میں ایسی اینگلوانڈین عورت کا پتا چلانا آسان ہے جس کے بھائی نے خودکشی کر لی ہو۔"

۵

افسر دوست کی اپنی بھی کچھ پریشانیاں تھیں۔ اُس رات سونے سے پہلے بہت دیر تک ہم انھیں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور دوسرے دن میں دیر تک سوتا رہا۔ میری آنکھ ناشتے کے

Scanned with CamScanner

برتنوں کی آواز سے کھلی، پھر مجھے اپنے سرھانے دوست کی اونچی آواز سنائی دی:

"بھیانک سازش کا پُراسرار سرغنہ کب تک سوتا رہے گا؟"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اگر خطاب مجھ سے ہے،" میں نے کہا، "تو میں جاگ رہا ہوں۔"

"خطاب آپ سے ہے اور آپ کے سوا کسی سے نہیں ہے۔"

پھر انھوں نے دو ورق کا، میلے کاغذ پر بہت بُرا چھپا ہوا ایک اخبار میری گود میں ڈال دیا اور بولے:

"ملاحظہ کیجیے۔"

یہ آئےدن جاری ہونے اور بند ہو جانے والے اُن اخباروں میں سے معلوم ہوتا تھا جن میں خبریں کم، سُرخیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ پہلے صفحے پر کئی سُرخیوں میں کسی انتخابی امیدوار کی ایک تقریر کی خبر تھی جس میں فرقہ وارانہ فسادات کو ملک کی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ بتایا گیا تھا۔ میں سرخیوں کے بیچ میں خبر تلاش کر رہا تھا کہ دوست نے کہا:

"اسے چھوڑیے، تیسرا صفحہ دیکھیے۔ اصل مال وہاں ہے۔"

تیسرے صفحے کی سُرخیوں میں بتایا گیا تھا کہ تین چار دن سے کچھ نامعلوم لوگ خود کو ڈاک کے محکمے کا آدمی ظاہر کر کے، ایک 'موہوم عورت' کا پتا معلوم کرنے کے بہانے شہر کے عیسائی گھرانوں کے بارے میں خفیہ معلومات اکٹھا کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ ایک امن پسند اقلیت کے خلاف کوئی بہت گہری سازش ہے جس کے سرغنہ کا پتا لگانے میں اخبار کے نمائندے سرگرم ہیں۔ اقلیت کو اطمینان بھی دِلایا گیا تھا کہ اس تازہ فتنے کو اُبھرنے سے پہلے ہی کُچل دیا جائے گا۔

میں نے اخبار تہہ کر کے بستر پر رکھ دیا اور پوچھا:

"اسے کون صاحب نکالتے ہیں؟"

دوست نے پہلے صفحے والے امیدوار کے نام پر اُنگلی رکھ دی اور بولے:

"اُن کے انتخابی حلقے میں عیسائی گھرانے بھی ہیں۔"

"یہ خبر کوئی فتنہ تو نہیں کھڑا کر دے گی؟"

"نہیں۔ کسی خبر کا اس اخبار میں چھپ جانا اُس خبر کی تردید کا کام کرتا ہے۔"

"پھر بھی۔ فرینک کو احتیاط کرنا چاہیے۔ بلکہ اب اُن کو روک ہی دیجیے۔"

"انھیں تو پہلے ہی روک دیا گیا تھا۔ لیکن..." وہ رُک گئے، "موہوم عورت؟" انھوں نے منہ بنا کر کہا، "لیکن اب فرینک کے پاس اُس نوجوان رے کا حوالہ ہے جس کے وجود کا کم سے کم ایک گواہ موجود ہے، وہ ڈینئل ہی سہی۔"

"ڈینئل اُس کے وجود سے زیادہ اس کے عدم کے گواہ ہیں،" میں نے کہا، "خیر، آپ فرینک کو روک دیجیے۔"

"وہ نہیں رُکیں گے۔"

"انھیں بتا دیجیے کہ میں آج واپس جا رہا ہوں۔"

"وہ جانتے ہیں۔ اب فرینک کو نہیں جانتے۔ وہ آپ کے جانے سے پہلے ہی پہلے کوئی خبر لائیں گے۔"

رات کو میں ٹھیک سے سویا نہیں تھا۔ سفر میں بھی نیند آنے کی امید نہیں تھی، اس لیے دوپہر کو پھر سو گیا۔ شام کے قریب آنکھ کھلی۔ دوست نے میرے انتظار میں چائے نہیں پی تھی۔ میرے جاگتے ہی انھوں نے ملازم کو چائے کے لیے آواز دی۔

ہم نے خاموشی کے ساتھ چائے پی اور ملازم ٹرے اُٹھا لے گیا۔

"مسز مُور،" دوست نے دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ "اب وہ مسز مُور ہیں۔"

میں نے ان کی طرف دیکھا۔

"فرینک آئے تھے،" وہ بولے۔ "آپ اس طرح سو رہے تھے کہ جگانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔"

میں خاموشی کے ساتھ اُن کی طرف دیکھتا رہا۔

"ڈینئل والے نوجوان رے کا حوالہ کام آ گیا۔" انھوں نے بتایا، "سباسٹن اس کا نام تھا۔"

"سباسٹن؟"

"وہ اینجلا کا بھائی نہیں، بھتیجا تھا۔ اینجلا نے اُسے گود لے لیا تھا۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔"

مجھے جُولیس رے یاد آئے۔ دوست نے کچھ دیر تک شاید میرے بولنے کا انتظار کیا، پھر بولے:

"اینجلا نہیں ہیں، لیکن..." وہ کچھ کہتے کہتے رُکے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ معلومات کو اپنے ذہن میں ترتیب دے رہے ہیں، "وہ بیوہ ہو چکی ہیں۔ ذاتی مکان فروخت کر دیا ہے۔ اب اپنے شوہر کے کچھ سوتیلے رشتےداروں کے ساتھ رہتی ہیں۔ لاولد ہیں اور..." انھوں نے ذہن میں پھر کوئی ترتیب درست کی، "...اُن کے اپنے خاندان میں اب اُن کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

مجھے میڈلین اور اُن کی سب سے بڑی بہن یاد آئیں۔ دوست شاید پھر میرے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

"آپ نے کہا تھا وہ نہیں ہیں۔"

"ہاں۔ فرینک نے معلوم کر لیا ہے۔"

"فرینک اُن سے ملے تھے؟"

"مل کے کیا کرتے؟"

میں نے دوست کی طرف دیکھا۔

"وہ مفلوج ہیں۔ کئی برس سے۔ قریب قریب سب حواس جواب دے گئے ہیں۔ کچھ دن سے بالکل غافل ہیں۔ خیال ہے کہ کوما میں چلی گئی ہیں۔"

"کچھ ہی ہر ہیں؟ یا..."

"ابھی کچھ ہی ہر ہیں۔ اگر آپ ان سے ملنا... ان کو دیکھنا چاہیں تو فرینک انتظام کر سکتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

"نہیں اب وقت نہیں،" میں نے کہا، "سفر کا سامان کرنا ہے۔"

مجھے گاڑی میں بٹھانے کے بعد دوست کچھ دیر تک میرے ساتھ بیٹھے رہے۔ گاڑی چھوٹنے کی سیٹی بجی تو اٹھ کھڑے ہوئے۔

"فرینک نے سب کچھ بہت تفصیل کے ساتھ معلوم کر لیا ہے،" انھوں نے کہا، "آپ چاہیں تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔"

"نہیں، سب کچھ تو آپ نے بتا ہی دیا،" میں نے کہا، "البتہ فرینک کوئی نئی بات بتائیں تو لکھ دیجیے گا۔"

"لکھ دوں گا،" انھوں نے کہا۔

گاڑی رینگ چلی۔ انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا،

"اپنا نیا پتہ لکھ دیجیے گا۔"

"لکھ دوں گا،" میں نے بھی کہا۔

دوست نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور پلیٹ فارم پر اتر گئے۔

rekhta

اسد محمد خاں

غصّے کی نئی فصل

حافظ شکراللہ خاں اپنی بات اجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔

حافظ شکراللہ خاں اچھاخاصا صاحب علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے اپنی بات اجمالاً کہنا پسند کرتا تھا، چناں چہ اسے تفصیلات سے اور وقت ضائع کرنے سے الجھن ہوتی تھی۔

گٹھے ہوئے ورزشی بدن کا یہ پڑھالکھا روہیلہ اس پاس کے دیہات میں غصّے ور مشہور تھا، شاید اسی لیے پیٹھ پیچھے اسے حافظ گینڈا کہا جاتا تھا۔

یہ بات حافظ شکراللہ خاں کے علم میں تھی کہ اسے حافظ گینڈا کہا جاتا ہے، مگر وہ ایک نوع کے حلم و درگزر سے کام لیتا تھا۔ اس نے اب تک صرف ان لوگوں کو زدوکوب کیا تھا جنھوں نے توہین کے ارادے سے اور عمداً اسے اس کے منھ پر حافظ گینڈا کہا تھا۔ نادانستہ گینڈا کہنے والوں، بچوں، اور ہم چشموں کی بےتکلفانہ بےادبی کو وہ منھ پھیر کر ٹال دیا کرتا تھا۔

حافظ شکراللہ خاں گینڈے میں ایک عجیب بات اور بھی تھی۔ وہ لادین لوگوں اور دوسرے مذہبوں مسلکوں والوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ کہتا تھا بھلے منسی میں کچھ خرچ نہیں ہوتا، وہ ہمارا کیا لیتے ہیں جو ہم سے متفق نہیں؛ وہ بےچارے تو ویسے ہی نقصان میں ہیں۔

دیہات میں بسے ہوئے کسی بھی ملّاں کا یہ رویہ عامۃ المسلمین کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے تھا، مگر لوگ حیران نہیں ہوتے تھے۔ انھیں حافظ شکراللہ خاں کا مزاج معلوم تھا۔

حافظ شکراللہ خاں، کوہ سلیمان کے دامن میں دریائے گومل کے کنارے آباد ایک گاؤں روہ ری میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ روہ ری گاؤں صاحب السیف سلطان عادل، شیرشاہ سوری کے بزرگوں کا آبائی وطن ہے۔ شیرشاہ کے دادا ابراہیم خاں سوری اپنے نوعمر بیٹے میاں حسن خاں کے ساتھ روہ ری سے چلے تھے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ ابراہیم خاں نے پنجاب کے شہر نارنول میں اور میاں حسن خاں سوری نے سہسرام، بہار، میں انتقال کیا تھا، سب کی طرح حافظ شکراللہ خاں بھی سمجھتا تھا کہ جب باپ اور دادا نہیں آئے تو اب سلطان شیرشاہ اس بھولے بسرے گاؤں میں کیا آئیں گے۔ اس طرح استدلال کر کے حافظ شکراللہ

خاں نے طے کیا کہ اگر پہاڑ میری طرف نہیں آتا تو لاؤ میں ہی پہاڑ کی طرف چلوں۔ پس شکراللہ خاں گینڈے نے گھروالوں سے مشورے کے بعد دارالخلافہ جانے کا ارادہ کر لیا اور تیاریاں شروع کر دیں۔ شکراللہ خاں نے ملک پنجاب و ملتان سے آگے سرہند، بہار، بنگال، مالوہ اور خاندیش کے نظم و نسق اور خوش حالی کے قصّے، اور عالموں، دانش مندوں کا احوال سنا تھا۔ اس نے روہ ری گاؤں کے فرزندِ جلیل فرید خاں شیرشاہ کے قصے سنے تھے جس نے قلیل مدت میں سات آٹھ سو کوس لمبی شاہ راہ بنوائی تھی، زمینوں کا انصرام درست کیا تھا، ہند کے شورش زدہ علاقوں میں امن قائم کیا تھا، اور اپنی تلوار اور تدبّر سے فتنہ انگیزوں اور شرارتوں کا خاتمہ کر کے خلقت کے لیے خدا کی زمین رہنے لائق بنا دی تھی۔

شکراللہ خاں گینڈا ایک بار یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار سلطانِ عادل شیرشاہ کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اللہ کا نام لیا، گھوڑے پر زین کسی، گاڑھے کی ایک چادر میں وہ کتابیں باندھیں جن سے زیادہ دن جدا نہیں رہا جا سکتا تھا، اور شیرشاہ سے ملنے چل پڑا۔

حافظ شکراللہ نے اپنے بڑوں سے سیکھا تھا اور سرکاروں درباروں سے ہو کر آنے والوں سے سن رکھا تھا کہ لوگ کسی تاج دار کی خدمت میں پیش ہوں تو انھیں نذر گزارنی ہوتی ہے، کوئی ایسا تحفہ دینا ہوتا ہے جو پیش کرنے والے اور قبول کرنے والے دونوں کے لیے قیمتی ہو۔ حافظ نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ حضرت والاجاہ، سلطانِ ہند کے لیے اسے کیا سوغات لے جانی چاہیے۔

شکراللہ خاں اپنے گاؤں کے اُس ٹیے پر گیا تھا جہاں بزرگ بتلاتے تھے کہ کبھی سُوریوں کا حجرہ اور باڑا تھا۔ اس نے تین مرتبہ کھونے بھر بھر کے اس ٹیے کی مٹی اٹھائی تھی اور زربفت کے ایک پارچے میں، جو اسے کسی لشکری نے جزدان بنانے کی غرض سے دیا تھا، یہ مٹی باندھ لی تھی۔

زربفت کے پارچے میں بندھی یہ مٹی اور اپنی پسندیدہ کتابیں اٹھائے حافظ شکراللہ خاں پہلے اپنی پھوپھی کے گھر حسن ابدال پہنچا۔ حسن ابدال میں سات روز ٹھہر کے بافندوں کی ایک جماعت کے ساتھ وہ لاہور آ گیا۔ لاہور خوش اوقات بےفکرے لوگوں کا شہر تھا اور شکراللہ کم آمیز، خاموش طبع آدمی۔ وہ پانچ روز بافندوں کے ڈیرے پر پڑا سفر کی تھکن دور کرتا رہا، شہر کی چمن بندی اور بھیڑبھڑکا دیکھنے بھی نہ نکلا۔ چھٹے روز رسد لے جانے والے بنجاروں کی بیل گاڑیوں کے ساتھ ہو لیا اور گھوڑے کو تھکائے بغیر دارالخلافے کی منزلیں سر کرنے لگا۔

حافظ شکراللہ خاں روہ ری سے کچھ رقم لے کر چلا تھا۔ حسن ابدال میں محبت کی ماری پھوپی نے مٹھی بھر چاندی کے سکّے حافظ کے کیسے میں ڈال دیے تھے۔ اور لاہور تک جن بافندوں کے ساتھ آیا تھا وہ بھلے لوگ تھے، حافظ کو راہ میں کچھ خرچ ہی نہ کرنے دیتے تھے؛ کہتے تھے ہمارے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ ایک عالم و فاضل ملّاں ہم سفر ہے۔ چنانچہ دارالخلافہ جاتے ہوئے شکراللہ خاں کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ راستے بھر بنجارے اس کوشش میں لگے رہے کہ اس رقم میں سے کچھ ہتھیا لیں مگر حافظ گینڈے نے موقع ہی نہ دیا۔

بنجارے اس کے علم و فضل سے تو کیا مرعوب ہوتے، گینڈے نے اپنے گٹھے ہوئے بدن اور اپنی تلوار سے انھیں قابو کیا اور بالآخر رسد کے اس قافلے سے بچھڑ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

لاہور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دارالخلافہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ سرکاری سرایوں میں بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ پیسے کی بچت بےشک تھی مگر حافظ ہجوم سے گھبراتا تھا۔ جیسے جیسے دارالخلافہ نزدیک آ رہا تھا سڑک کے آس پاس بستیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ ان بستیوں میں مساجد بھی تھیں اور نج کی سرائیں، مہماں خانے بھی۔ حافظ شکراللہ خاں نے سوچا مسجدوں کے منتظمین تو خوش ہو کر اسے ٹھہرا لیں گے۔ پھر خیال آیا کہ پیش اماموں، موذّنوں کی روٹی میں حصّہ بٹانے کی بجائے کیوں نہ رقم خرچ کر کے کسی نجی سرائے میں ٹھہر جاؤں۔ منزل دو منزل سر کر کے شہر پہنچ جاؤں گا۔ پھر ضرورت پڑی تو کوئی نوکری کر لوں گا۔ دارالخلافوں میں ہزار کام ہوتے ہیں۔ تو اس طرح نجی مہماں خانوں، سرایوں میں رکتا ٹھہرتا حافظ شکراللہ خاں دارالخلافہ پہنچ گیا۔

شہر کی وہ سرائے جہاں حافظ نے ٹھہرنے کا ارادہ کیا تھا کتب خانے کے نزدیک تھی۔ شکراللہ خاں نے سوچا: شہر گھومنے سے بھی کیا ملے گا؟ شہر سبھی ایک سے ہوتے ہیں۔ مجھے یہاں چند ہی روز تو رہنا ہے۔ یہ دن سرکاری کتب خانے میں لگا دوں گا۔ کتابیں دیکھنے، اپنے مطلب کی چیزیں نقل کرنے سے اچھی سیر اور کیا ہو گی! وہ سرائے کے منتظم سے ملا۔ سرائے میں ٹھہرنے کا کرایہ، کھانے پینے کا خرچ معلوم کیا۔ سہولتوں کے اعتبار سے کرایہ زیادہ نہ تھا۔ کھانے پینے پر بھی وہی خرچ آ رہا تھا جتنا بڑے شہروں میں اچھی سرایوں میں ہوتا ہے۔ بس ایک مشکل تھی: سرائے میں کوئی سموچا کوٹھری خالی نہ تھی۔ سرائے کے منتظم نے کہا: "چاہو تو چار بستروں والے کمرے میں ایک بستر آپ لے سکتے ہو۔"

حافظ بولا: "اے بھائی! جو ہجوم کے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو مفت کی سرکاری سرائیں کیا بری تھیں؟" سرائے کا منتظم کتابوں کا پشتارہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ رویبد ملّاں رات بھر چراغ جلا کر کتابیں پڑھے گا یا چلّہ کھینچے گا؛ یہاں اس کا گزارہ مشکل ہے۔ اس نے حافظ شکراللہ کو قریب کی ایک سرائے کا پتا بتلا دیا۔ کہنے لگا: "آپ فاضل عالم آدمی ہو وہاں کوٹھری خالی ملے گی، اور اپنے مطلب کے لوگ بھی مل جائیں گے۔"

"اپنے مطلب کے لوگ" منتظم نے مسکرا کر کہا تھا۔ اس وقت یہ بات حافظ گینڈے کی سمجھ میں نہ آ سکی؛ تاہم اس نے زیادہ غور نہ کیا۔ وہ راسیں تھامے گھوڑے کو چلاتا ہوا دوسری سرائے میں پہنچا تو خوش ہو گیا۔ یہاں ایک پورا کوٹھری خالی تھا؛ جگہ صاف ستھری اور کم خرچ تھی اور دوسری جگہوں کے مقابلے میں شورشرابا بھی بہت کم، سمجھو نہ ہونے کے برابر تھا۔

حافظ نے سرائے کے اصطبل میں اپنا گھوڑا باندھا۔ کمرے میں کتابوں کا بقچہ، زربفت کی پوٹلی، ہتھیار اور دوسرا سامان رکھا۔ کاغذ قلم دان سنبھالا۔ اور کتب خانے کی راہ لی۔ حافظ گینڈا سخت کوش پہاڑی آدمی، کھانے پینے میں شہریوں کی طرح تکلف کیا کرتا۔ کتب خانے میں دن گزارنا تھا، چار چھ مٹھی بھنے ہوئے چنے فرغل کی جیب میں ڈالے اور جم کے بیٹھ گیا۔ دوپہر

بعد حافظ شکراللہ ظہر کی نماز کے لیے اٹھا، کتب خانے کے چھوٹے باغیچے میں ترنج کے ایک بڑے بھرے پھل دار درخت کے سائے میں فرض پڑھے، مٹھی بھر چنے چبائے، پانی پیا۔ کتب خانے کی سیڑھیوں کے پاس دھوپ میں ایک پھیری والا آن بیٹھا۔ وہ کوئلے کی انگیٹھی سے برتی باندھے، بھنگی سی بنائے، راستوں، بازاروں میں عربی قہوہ بیچتا پھرا تھا۔ سکوں کی جگہ دیکھ کر اب جو سستانے بیٹھا تو شکراللہ خاں کو اس تھکے ماندے کی بیٹھک بھلی لگی۔ قہوے کی طلب نہ تھی مگر حافظ نے اس سے قہوہ خریدا اور پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پینے لگا۔ قہوہ اچھا تھا۔ حافظ شکراللہ خاں جیسے کھل اٹھا۔ دو تین فنجان قہوے کے اور خرید کیے۔ دام دے کر اٹھنے ہی کو تھا کہ کتب خانے کے دروازے سے ایک نوعمر آدمی برآمد ہوا۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ نو وارد نے حافظ کو کتابوں کے درمیان بیٹھے دیکھا ہو گا۔ سلام کر کے بولا: "فاضل! کچھ دیر بیٹھیے۔ ایک فنجان میری طرف سے بھی لیجیے۔"

نووارد نے اہلِ زبان کی رواں فارسی میں بات کی تھی۔ حافظ گینڈے نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔ "ٹھیک ہے ایک فنجان اور سہی!" اس نے قہوہ لیا۔ نووارد کو اپنا نام بتایا، اس کا نام پوچھا۔ آنے والا اصفہان سے آیا تھا۔ وہ اپنا نام فیروز بتاتا تھا۔ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ فیروز منطق اور تواریخ کی تعلیم لے رہا تھا اور شہر جون پور کے کسی فاضل کی شاگردی کی نیت سے گھر سے نکلا تھا۔

قہوہ ختم کر کے دونوں سیڑھیاں چڑھتے پھر کتب خانے میں جا بیٹھے۔

حافظ شکراللہ مغرب [illegible] تک کتب خانے کے فراخ دریچے سے لگا بیٹھا پڑھتا رہا۔ اذان سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھا اور کتب خانے سے نکل گیا۔ دور گوشے میں کتابوں کے چھوٹے سے انبار کے پاس فیروز اصفہانی کاغذ پھیلائے کچھ نقل کر رہا تھا۔

شکراللہ خاں کا یہ پہلا دن بھرپور گزرا تھا۔ عشا سے قبل سرائے میں کھانا کھا کے اس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ شہر کے مرکزی علاقے میں افغانوں کے نوتعمیر مدرسے سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد تھی۔ حافظ نے وہاں عشا کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ بھٹکتا، پوچھتاپاچھتا وہ اپنی سرائے میں لوٹ آیا۔ تھکاماندہ تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔

خدامعلوم حافظ گینڈے نے ایک پہر نیند لی ہو گی یا دو پہر، جو اسے آدھی جاگتے آدھی سوتے میں لگا کہ جیسے ایک آدم خور غولِ بیابانی چیختا بلبلاتا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگتا، جان بچانا چاہتا ہے مگر زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ وہ بدن کی پوری طاقت سے خود کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ پہلے پہل اسے کامیابی نہ ہوئی۔ غولِ بیابانی بپھرے ہوئے اونٹوں کے گلّے کی طرح بلبلاتا، تعزیر سہتے جان داروں کی طرح پکارتا، بین کرتا، اس کے بالکل پیچھے، سمجھو دو قدم کے فاصلے تک آ گیا۔ آدم خور اپنے پنجے بڑھا کر حافظ شکراللہ کو چھو سکتے تھے، اور کسی ایک نے تو اپنا نوکیلا پنجا بڑھا کر اس کی پشت پر خراشیں بھی ڈال دیں۔ تس پہ شکراللہ خاں گینڈے نے ایک دبی ہوئی چیخ ماری اور جاگ پڑا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

معاذاللہ! یہ کیسا خواب تھا، حافظ نے سوچا۔ مگر یہ سراسر خواب نہیں تھا؛ کچھ حقیقت

بھی تھی۔ کس لیے کہ چیخ پکار اور غیظ کی آوازیں کمرے میں بھری ہوئی تھیں۔ حافظ کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خدا پناہ میں رکھے! یہ کیسی آوازیں ہیں؟ یہاں، اس کمرے میں، یہ کیسی بلائیں آ گھسی ہیں؟ اس نے اٹھ کر چراغ کی لو بڑھائی۔ تکیے کے نیچے ہاتھ پہنچا کر اپنا پیش قبض نکالا، نیفے میں اڑس لیا۔ کمرے میں کوئی اور نہ تھا؛ بس یہ رونگٹے کھڑے کرنے والی آوازیں گردوپیش سے، اوپر سے، حد یہ کہ فرش تک سے چلی آ رہی تھیں۔

حافظ گینڈے نے بدن کو کس اچھی طرح لپیٹا، چراغ اٹھایا، اور نیام کی ہوئی تلوار لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں سرائے پر رہزنوں نے تو حملہ نہیں کر دیا۔ مگر یہ بھراپُرا شہر تھا، اور شہر بھی کون سا... دارالخلافہ۔ شیرشاہ کی عمل داری میں ڈاکوؤں لٹیروں کی یہ ہمت کہاں ہو سکتی تھی کہ بستیوں پر چڑھ دوڑیں۔ رہزنوں کی تو اس وقت بن آتی ہے جب حکم راں کم زور یا بددیانت ہوں۔ شیرشاہ نہ تو کم زور سلطان تھا نہ بددیانت حکم راں۔ حافظ شکراللہ خاں نے سوچا۔ شاید سرائے میں آگ لگی ہے اور لوگ جانیں بچا کر بھاگتے ہیں۔ مگر اس نے برآمدے میں نکل کر دیکھا؛ وہ صحن کی طرف بھی گیا، اسے کہیں سے جلنے کی بو نہ آئی۔ برآمدے میں اس نے دیکھا، ہر کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر مسافر، مکین کوئی نہ تھا۔ صحن میں الاؤ جلتا تھا پر الاؤ کے پاس بیٹھنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ سائیس، خادم، چوکیدار، حربے بردار؛ نہ کوئی مکین نہ مسافر۔ دور دور تک کسی کا پتا نہ تھا۔

پھر حافظ کو سرائے کی چھت پر مشعلوں کی روشنی نظر آئی۔ آوازیں چھت ہی سے اٹھ رہی تھیں۔ اس نے چھت پر جانے کا زینہ تلاش کیا اور چراغ اور تلوار اٹھائے دھڑدھڑاتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔

وہاں حافظ شکراللہ خاں گینڈے نے عجب منظر دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ سرائے کی چھت پر طرح طرح کے چراغوں، مشعلوں، دیوں، شمعوں، روشن ہانڈیوں سے جیسے رات میں بھی دن کا سماں ہے اور چالیس سے پچاس کی تعداد میں عورت مرد دائرہ بنائے بیٹھے ہیں اور حلق سے غیظ و غضب کی آوازیں نکالتے ہیں۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا جیسے اب اٹھیں گے اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے۔ مگر اس طیش، اتنے غضب کے باوجود کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں۔ دوسرے پر حملہ نہیں کرتا۔ بس اپنے سامنے بیٹھے مرد یا عورت کو غصے کی آوازیں کر کے آنکھیں نکال نکال کے دانت نکوستے ہوئے دہلائے جاتا ہے۔

حافظ گینڈے نے چراغ نیچے رکھ دیا۔ تلوار اپنے بدن کی اوٹ میں کر لی اور حیرت میں ڈوبا ان لوگوں کو چیخ پکار کرتے دیکھتا رہا۔

نے ان میں بہت سوں کو پہچانا۔ سرائے کا مالک جو دن میں اپنی پشت اور کہنیاں تکیوں سے ٹکائے بیٹھا ادھ کھلی آنکھوں سے مہمانوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا وہاں موجود تھا۔ منتظم جو ہر مہمان کو اپنا مالک بلکہ مرشد سمجھتا تھا اور ہر ایک کے آگے بچھا جاتا تھا اس وقت وہاں جما بیٹھا تھا۔ مطبخ کے ملازم جو سارا دن پکانے اور چکھنے میں گزار دیتے تھے اور کھاکھا کے وزنی ہو گئے تھے وہ سبھی بیٹھے تھے۔ کئی خدمت گار، اصطبل کے خادم اور

Scanned with CamScanner

سائیس، اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ کہ سرائے میں ٹھہرے ہوئے مسافر بھی جو اپنے لباس اور آسودہ حال طمانیت بھرے چہروں کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے تھے، اس حلقے میں موجود تھے۔ حیرت پہ حیرت یہ تھی کہ مہمان بھی سب کی طرح چہرے مسخ کیے، دانت نکالے، آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے والے کو دیکھتے ہوئے بلبلا رہے تھے۔

"یہ میں کن لوگوں میں آ گیا؟" شکراللہ خاں نے سوچا۔ "یا یہ بھی کوئی خواب ہے؟"

مگر یہ خواب نہیں تھا۔ وہ سبھی لوگ جنھیں حافظ شکراللہ نے دن کے وقت معقول طریق پر آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے دیکھا تھا، اس وقت نصف شب گزار کر وحشت زدہ ہو رہے تھے۔ "کیا یہ کسی قسم کے جنون میں مبتلا ہیں؟

"کیا یہ لوگ بیک وقت کسی دورے سے گزر رہے ہیں؟ کوئی خفیہ جماعت محفل کرتی ہے؟ یا کوئی شیطانی گروہ اپنی بھیانک رسمیں ادا کر رہا ہے؟"

ابھی حافظ گینڈا یہاں سے ہٹنے اور کمرے میں اپنے سامان کے پاس لوٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص حلقے سے اٹھا اور منھ پر اس طرح ہاتھ پھیرتا کہ جیسے نیند سے ابھی بیدار ہوا ہو حافظ کی طرف آیا۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ سائیس تھا جس کے سپرد اس نے اپنا گھوڑا کیا تھا۔ سائیس کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت، جو اپنے چہرے کے نقوش اور اپنی کھال کی رنگت سے کسی سرد ملک سے آئی لگتی تھی، حلقہ چھوڑ کر اٹھی اور چہرے پر ہاتھ پھیرتی حافظ کی طرف آئی۔ سائیس اور عورت نے نرمی سے حافظ کا ایک ایک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے حلقے کی طرف کھینچنا چاہا۔ عورت کی نظر حافظ کی تلوار پر پڑی تو اس نے چنچنی آواز میں کہا، "تورنا! تم ہتھیار کیوں لائے ہو؟ یہ حلقہ غیظ کا حلقہ ہے، تلوار کا یہاں کیا کام؟ اسے رکھ دو... ہمارے ساتھ آؤ۔"

شکراللہ خاں نے سختی کے ساتھ عورت کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لیا۔ سائیس نے اب تک نرمی سے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا؛ اب جو حافظ نے عورت کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا تو سائیس نے سختی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے حافظ کی کلائی پکڑ لی اور اسے حلقے کی طرف کھینچنے لگا۔ "آؤ! آؤ آغا... اور دیر نہ کرو۔ تمھیں تو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔"

"یہ میں کس وبال میں پھنس گیا ہوں؟" حافظ گینڈے نے غصے سے جھٹکا دے کر سائیس کی گرفت سے کلائی چھڑائی اور ہاتھ اٹھا کر دور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے چراغ اٹھایا اور تیز تیز قدم لیتا زینے کی طرف چلا۔

ہاتھ چھڑا کر جاتے ہوئے اسے سبھی نے دیکھا۔ اس لیے پورے حلقے نے بہت ہی غضب ناک آواز میں اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے شکراللہ خاں کو یوں لگا جیسے وہ تمام چالیس پچاس وحشی جھپٹتے ہوئے پیچھے آئیں گے اور اسے پھاڑ کھائیں گے۔ حافظ گینڈے نے اتنا بھیانک غصہ یا آوازوں سے غصے کا ایسا وحشی اظہار، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ انگڑائی لیتے، کسی بھی خوفناک واقعے کا سامنا کرنے کو تیار، ایک ایک قدم اترنے لگا۔ کیا خبر کب چراغ رکھ کر اسے تلوار کھینچ لینی پڑے۔ بالآخر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب وحشت زدہ سرائے والے اور مسافر چھت پر اپنے حلقے ہی میں بیٹھے غصے کے جھاگ اڑاتے اور بھیانک

آوازیں نکالتے رہے، سیڑھیاں اتر کر کوئی نہ آیا۔

صحن میں آ کر حافظ نے عافیت کا سانس لیا۔ وہ برآمدے میں پہنچا۔ اس نے سرائے کے منصرم کا حجرہ دیکھا؛ پھر قطار میں بنے مہمانوں کے کمرے دیکھے۔ سب دروازے کھلے تھے؛ سب کمرے خالی تھے۔ شکراللہ خاں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور چراغ گیر پر چراغ رکھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

تو یہ بات تھی جو پہلی سرائے کے منتظم نے کہنا چاہی تھی۔ کہتا تھا تمھارے اپنے مطلب کے لوگ ملیں گے۔ اس گیدی نے مجھے وحشت زدہ مجنوں سمجھ کر ادھر ہنکا دیا۔ شکراللہ خاں گینڈے کو اتنا غصہ آیا کہ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ فی الفور اس پہلی سرائے کے منصرم کو جا پکڑتا اور گھوڑے کے چابک سے اتنا ٹھکتا کہ گیدی کو تا عمر یاد رہتا۔ مگر حالات کا تقاضا یہ تھا کہ غصے پر فی الحال قابو پا لیا جائے؛ غور و فکر کیا جائے۔

"میں کسی بیاباں ویرانے میں نہیں، بستی میں ہوں۔ اور بستی بھی کیسی، ایک گنجائش سے زیادہ آباد شہر، جو شیرشاہی مملکت کے قلب میں واقع ہے؛ اس کا دارالخلافہ ہے۔ یہاں دیوانِ شُرطہ اور دیوانِ قانون موجود ہیں۔ سڑکوں پر سے طلایہ بھی گزرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں خود کوئی کارروائی کروں؟ میں تو ان مجنونوں کے خلاف، جو خلقت کی نیند میں خلل انداز ہو رہے ہیں، شکایت درج کراؤں گا اور ابھی اسی وقت درج کراؤں گا تاکہ میری نیند خراب ہوئی سو ہوئی، دوسرے بندگانِ خدا تو سکون سے اپنی نیند پوری کر لیں۔"

حافظ گینڈے نے باہر جانے کے ارادے سے کپڑے پہننا شروع کیے۔ ابھی وہ پوری طرح تیار بھی نہ ہوا تھا کہ چھت سے آتی غیظ و غضب کی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ حافظ نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ صحن میں روشنیاں اور سائے حرکت کر رہے تھے۔ پھر اکادکا مہمان برآمدے سے گزرنا شروع ہوئے۔

ایک خوب صورت بچہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامے گزر رہا تھا۔ حافظ متوجہ ہوا تو بچے نے مسکرا کر دیکھا۔ عورت نے بچے کو مسکراتے ہوئے پا کر حافظ شکراللہ خاں کی طرف نظر کی۔ پھر بچے کے تتبع میں وہ خود بھی مسکرانے لگی۔

چیزیں لحظہ لحظہ بدلنا شروع ہو گئی تھیں۔

پہلے بچہ مسکرایا تھا؛ پھر اس کی ماں مسکرائی تھی؛ پھر اس نے گاتی گنگناتی آواز میں حافظ گینڈے کو سلام کیا تھا: "سلام علیک فاضل! خیر باشد؟"

حافظ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مسکراتی ہوئی اس وجیہ و باوقار عورت سے کیا کہے۔ اس نے آہستہ سے کہا: "بحمداللہ... سب عافیت۔"

عورت بچے کا ہاتھ تھامے، اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور اپنی بڑی بڑی روشن آنکھیں جھپکاتی ہوئی گزر گئی۔ سرائے کا ایک خادم برتن اٹھائے حافظ کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اب وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے حافظ شکراللہ کو سلام کیا اور گزر گیا۔

خادم کے دفع ہوتے ہی دو مسکراتے ہوئے مسافروں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ادھیڑ

عصر کی وہی عورت برآمدے میں آئی جس نے چھت پر حافظ کو روکنا چاہا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے سے گزری تو بہت شفقت، بڑی اپنائیت سے صاحب سلامت کرتی، حافظ کو زیرلب دعا دیتی گزر گئی۔

"یاخدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سب لوگ جو اب میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے ہیں، مجھے سلام کرتے اور دعا دیتے ہیں، کچھ ہی دیر پہلے میرے لیے -- اور ایک دوسرے کے لیے بھی -- دشمنوں سے بدتر تھے۔ کینے اور کدورت اور حددرجہ طیش اور غضب ناکی سے دیکھتے تھے اور خوں‌خوار درندوں کی طرح دہاڑتے گرجتے تھے۔ اور اب دیکھو کیسی اپنائیت اور مہرومحبت سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی مہربانیاں اور صلہ رحمی کرتے اپنے اپنے کمروں کی طرف جا رہے ہیں۔"

مطبخ کا ایک فربہ اندام خادم برآمدے سے گزرتا ہوا ٹھٹکا، پھر ادب کے ساتھ حافظ شکراللہ کی طرف بڑھا اور بولا، "غلام نے تازہ یخنی تیار کی ہے۔ آغا! حکم ہو تو پیش کروں؟ انشاءاللہ پسند کیجیے گا۔"

حافظ گینڈے نے بےمہری سے اس مسخرے کی طرف دیکھا۔ "لو بھلا کدی یخنی کو پوچھتا ہے! آدھی رات کو بدنصیبوں نے سونے سے جگا دیا اور اب یہ شخص یخنی سے میری تواضع کرنا چاہتا ہے۔ دفعتاً" حافظ نے بستر سے اٹھ کر اس مسخرے فربہ اندام باورچی کے چوڑے چکلے چہرے پر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

مگر سرائے کے اس آخری اہلکار کا تپاک دیکھ کر حافظ شکراللہ خاں گینڈے کا غصّہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پھر کپڑے تبدیل کیے اور سونے کی کوشش کی، اور بوالعجبی! اسے نیند بھی آ گئی۔

صبح خادموں، منصرموں کا رویہ ایسا ہی پُرتپاک کاروباری سا تھا۔ دن نکلنے پر انھوں نے خبر دی تھی کہ گرم پانی رکھ دیا گیا ہے، آغا حمام کر لیں۔ پھر ناشتہ اور شربت اور غذائیں اور قہوہ جس تواضع اور کثرت سے پیش کیا گیا وہ بھی غیرمتوقع نہیں تھا۔ مسافروں، مہمانوں نے باہم وہی تپاک برقرار رکھا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آدھی رات کے وقت یہ سب لوگ آوازوں سے اور اپنی چلت پھرت اور دھمکیوں سے ایک دوسرے کی جان کے گاہک بنے ہوئے تھے۔

حافظ کو دیر ہو گئی تھی۔ آج بعدنمازعصر اسے مسندعالی برمازید کور کی روبکاری میں پیش ہو کر عرضی گزارنی تھی کہ وہ دربارعام میں سلطانِ ہند حضرت شیرشاہ سُوری کی کورنش سلامی کو حاضر ہونا چاہتا ہے، کیونکہ کہ وہ نہ صرف سلطان کی رعایا میں سے ہے بلکہ ان کے جدّی گاؤں روہ ری کا باشندہ بھی ہے۔

کتب خانے میں بیٹھنے کے لیے اس کے پاس دوپہر تک کا وقت پڑا تھا۔ حافظ شکراللہ خاں کاغذوں کا پلندا اور قلم دان بغل میں مار، کتب خانے روانہ ہوا۔

پچھلے دن کی طرح وہ اسی دریچے کے برابر جا بیٹھا۔ اس نے اپنے مطلب کی کتابیں نکلوا کر مطالعے میں گم ہونا چاہا، مگر آج کا دن پچھلے دن جیسا نہ تھا۔ رہ رہ کر شکراللہ کو رات کا شوروغل یاد آ رہا تھا۔ اسے وہ دہشت اور بےچینی یاد آئی جو چھت سے اترتے ہوئے اس نے

سا سیڑھیوں پر محسوس کی تھی۔

اپنا قلم دان اور کاغذ چھوڑ کر حافظ شکراللہ خاں باہر باغ میں جا کر ٹہلنے لگا۔ کھلی ہوا میں یکسوئی بحال ہوئی تو اندر جانے کا قصد کیا۔ دیکھا گزشتہ دن کا ملاقاتی فیرُوز کتب خانے کی طرف آ رہا ہے۔ شکراللہ خاں سلام کلام کے لیے ٹھہر گیا۔ فیروز اصفہانی پوچھنے لگا، "فاضل! آج غوروفکر میں ہو؟ کیا مطالعے کو طبیعت نہیں کرتی؟" حافظ نے ٹالنے کو کچھ کہہ دیا۔

فیروز بولا، "تھکے ہوئے ہو؟ کیا رات اچھی طرح نہ سو سکے؟"

حافظ گینڈے نے پھر ٹال دیا۔ لیکن فیروز کے استفسار پر رات والی پریشانی کی کیفیت اسے یاد آ گئی۔ حافظ نے سوچا چند روز اس شہر میں اور رہنا ہے، فیروز سے کسی معقول سرائے کا پتا پوچھ لیتا ہوں۔

پوچھنے پر اصفہانی نوجوان نے کئی سراؤں کے پتےنشان بتائے، ان کے کرائے اور سہولتوں کی تفصیل بیان کی۔ شکراللہ خاں کے لیے ان میں سے کوئی بھی مناسب نہ تھی، کسی کا کرایہ زیادہ تھا، کوئی سرائے کتب خانے سے دور تھی، اور بعضی پرشور منڈیوں بازاروں کے بیچوں‌بیچ تھیں۔ فیروز جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت جہاں حافظ ٹھہرا ہوا ہے وہاں کیا مشکل پیش آئی ہے جو وہ سرائے بدلنے کے درپے ہے۔ حافظ شکراللہ خاں کو مجبوراً ساری بات بتانی پڑی۔

فیروز اصفہانی پوری کہانی سن کر بجائے ہمدردی جتانے کے ہنس پڑا۔ حافظ گینڈے پر جو گزری تھی وہی شہر میں پہلے روز فیروز کو بھی پیش آئی تھی۔ کہنے لگا، "مگر فاضل! قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ مجھے سرشام ہی علم ہو گیا تھا کہ یہ مَردُوریوں کی سرائے ہے۔ میں تو اپنا سامان اٹھا کر رات سے پہلے ہی نکل آیا تھا۔"

حافظ شکراللہ خاں مردُوری نام کی کسی جماعت سے واقف نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ پوچھنے پر اصفہانی نے بتایا کہ صدیوں کی تعلیمات مدنیّت کا بگاڑ اس فرقۂ مردوریاں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کہنے لگا، "یہ تو نہیں معلوم کہ ان کا معلّم کون ہے اور مرکز کہاں ہے، بس اتنا جانتا ہوں کہ صاحبانِ شوکت اسے اپنے مقاصد کے حصول میں مفید اور فیض رساں پاتے ہیں، سو دارالخلافوں میں یہ مسلک خوب پھل پھول رہا ہے۔ صاحبانِ ثروت کی دیکھادیکھی کم حیثیت لوگ بلکہ اب تو شاگردپیشہ بھی اس جماعت میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔"

شکراللہ خاں گینڈا اس فرقے کی عمومی فکر سمجھنا چاہتا تھا، تو اصفہانی نے بیان کیا کہ مردوری اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آدمی کا مزاج محبت اور غصے، اور عقیدت اور نفرت سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ مگر اپنی تہذیب اور تعلیم اور تمدنی تقاضوں سے مجبور ہو کے انسان اپنا غصّہ اور اپنی نفرت ظاہر نہیں ہونے دیتا، جس سے فتور واقع ہوتا ہے اور نفرت مزاج کی سطح سے نیچے جا کر سڑنے لگتی ہے۔ پھر یہ آدمی کے اندر ہی پلتی بڑھتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غصّے سے پاک ہو چکا اور اس کے مزاج کی ساخت غصّے اور نفرت کے بغیر ممکن ہو گئی۔

مردوری کہتے ہیں ایسا نہیں ہوتا۔ غصّہ آدمی میں ساری زندگی موجود، مگر پوشیدہ رہتا

Scanned with CamScanner

بہا اگر دن کے خاتمے پر اسے ظاہر ہونے، یعنی خارج ہونے، کا موقع دیا جائے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ آدمی غصے اور نفرت سے پوری طرح خالی ہو جائے گا۔ مردوزی اس کیفیت کو تکمیل کا نام دیتے ہیں۔

"اس لیے" فیروز کہنے لگا، "اسی تکمیل کو پانے کے لیے مردوزی فرقے کا ہر فرد رات کو حلقے میں بیٹھتا ہے اور چیخ پکار کر کے اپنی دن بھر کی کمائی ہوئی نفرت اور دن بھر کا پالا ہوا غصہ خارج کر دیتا ہے، اور باقی رات اور اگلے تمام دن کے لیے ایک مہذب، مکمل، مہرومحبت سے بھرا ہوا انسان بن جاتا ہے۔"

فیروز اصفہانی نے ضمناً یہ بھی اطلاع دی کہ سلطان شیرشاہ کا وزیردربار، امیر برمازید کور مردوزی ہے۔

"اناللہ و انا الیہ راجعون۔" شکراللہ خاں نے جو تفاصیل سے بیزار ہو جایا کرتا تھا، فیروز کا طولانی بیان سن کر کہا، "اناللہ و انا الیہ راجعون! تو ان فرم سافوں نے غصے اور نفرت جیسے قیمتی انسانی جوہروں کو ضائع کرنے کی سبیل بھی آخر نکال ہی لی۔"

اور یہاں حافظ شکراللہ خاں گینڈے کے شغل کی روداد ختم ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ حافظ شکراللہ خاں گینڈا اپنی بات اجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔ وہ صاحب علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے تفاصیل سے حذر کرتا اور وقت ضائع سے الجھتا تھا۔

اس نے آدمی میں موجود غصے کے اس طرح بالالتزام ضائع کیے جانے پر کوئی توجہ نہیں لکھا، اگرچہ کاغذ کے ایک پورزے پر وزیردربار، مسند عالی، امیر برمازید کور کے چند سطور اس انداز کی لکھیں کہ انھیں یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا۔

کتب خانے کی سیڑھیوں پر حافظ شکراللہ خاں گینڈے نے زربفت کا وہ پارچہ فیروز اصفہانی کو تحفے میں پیش کر دیا جس پارچے میں روہ رک، کوہ سلیمانی سے مٹی باندھ کر لائی گئی تھی۔ سوریوں کے باڑے کی مٹی حافظ شکراللہ نے سفید گلابوں کے تختے میں جھاڑ دی جو سیڑھیوں سے شروع ہو کر کتب خانے کے احاطے کی دیوار تک پہاڑی چشمے کی طرح جھاگ اڑاتا چلا تھا۔

اگلی صبح جب فیروز اصفہانی کتب خانے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اچانک پھولوں کے تختے پر اس کی نظر پڑی۔ جیسے ایک جسمانی ضرب نے اسے کھڑے سے سیڑھیوں پر ہی بٹھا دیا۔

کل تک جس تختے میں برف کی طرح سفید پھول کھلے آج اس میں انگارہ سے لال گلاب دہک رہے تھے۔

بہ شکریہ "ادبیات" اسلام آباد

حسن منظر

بومیدین

"مونچھیں آدمی کا اپنا ذاتی معاملہ ہوتی ہیں — انتہائی ذاتی معاملہ۔" یہ تھے وہ الفاظ جو ان لوگوں کے دوست ڈاکٹر نے اس دن ان سے کہے تھے۔

لوگ ادھر ادھر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ برآمدے میں ایک طرف ایک بوڑھا ایک نو دس سال کے لڑکے سے شطرنج کھیل رہا تھا اور مستقل ہار رہا تھا۔ دوسری میزوں پر بیٹھے ہوؤں میں سے ایک وقفے وقفے سے اٹھ اٹھ کر اپنے ساتھیوں سے پوچھ لیتا تھا کہ کسے کیا لینا ہے یا ان لوگوں کی زبان میں کسی سے کہتا کہ وہ چائے کی پروا کرے گا یا کوفی کی یا کولڈ ڈرنک کی۔

باہر گیدز گیدزیوں کا سیاہ ہو رہا تھا۔ دھوپ کبھی نکل آتی تھی کبھی چھپ جاتی تھی، اور کبھی دھوپ اور مینھ ایک ساتھ پڑنے برسنے لگتے تھے۔

برآمدے کے دوسرے سرے پر بیٹھے ہوئے ساتھی دن بھر تاش کھیل کھیل کر اوب گئے تھے اور ان میں سے ایک بیٹھا ہوا انگلیاں چٹخا رہا تھا، دوسرے نے آرام کرسی پر سر پیچھے کو پھینک رکھا تھا اور لگتا تھا وہ چھت کی کڑیاں گن رہا ہے۔

ڈاکٹر بےدھیانی سے برج کھیل رہا تھا؛ اس کی توجہ نہ ڈمی پر تھی نہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتوں پر۔ جن میزوں پر کھیل ختم ہوتا جاتا تھا، وہاں سے اٹھ اٹھ کر لوگ اس کی میز کے اردگرد آ بیٹھتے تھے۔ کچھ اتنی آزادی بھی برتتے تھے کہ کھیلنے والے کے ہاتھ سے پتّا کھینچ کر خود ہی میز پر پھینک دیتے تھے۔ یوں کھیل میں پھر سے جان پڑ گئی تھی ورنہ اکیلے کھیل کھیل کر سب اکتا چکے تھے۔

جو ساتھی میزوں پر جا جا کر سب سے پوچھتا رہا تھا کس کو پینے کے لیے کیا چاہیے، آخری بار بوڑھے اور بچے والی میز پر گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے ٹھٹھک کر بساط کو دیکھا اور لڑکے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "You win!" اور بساط کو دوہرا کر دیا۔ بےکھچے مہرے چھن سے گر کر بساط کے بیچ میں آ گئے۔ پھر اس نے بوڑھے کو بازو سے اٹھاتے ہوئے کہا:

"ایک دن کے لیے اتنا کھیل کافی ہے۔ آئیے ڈاکٹر کی بات سنیں۔ کچھ مونچھوں کے بارے میں اظہارِخیال کر رہا ہے۔"

"وہ؟" بوڑھے نے کہا، "اس کی تو مونچھیں ہیں ہی نہیں۔"

"تب ہی تو کر رہا ہے۔"

"اُسے مونچھوں کے خلاف بولنے کا کیا حق ہے؟" بوڑھے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"خلاف نہیں، حق میں بول رہا ہے۔"

"اس کا بھی اسے کیا حق ہے؟" بوڑھے نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

پھر وہ بھی اُسی میز پر آ گیا جہاں ڈاکٹر بیٹھا تھا اور جہاں کھیل رُک چکا تھا۔ تاش کے پیکٹوں کی گڈیاں بنا کر رکھ دی گئی تھیں اور ایک ایش ٹرے کے مُنھامُنھ ماچس کی تیلیوں اور بُجھی ہوئی سگریٹوں سے بھر جانے پر دوسری بہت بڑی ایش ٹرے ابھی ابھی لا کر رکھی گئی تھی۔

اپنے ساتھی کے چھی جانے پر لڑکا کسی اور طرح خود کو مصروف نہیں رکھ پا رہا تھا اور جا کر بڑے آدمیوں کی باتیں سننے کو اس کا جی نہیں ہو رہا تھا .. یہ نہیں کہ اس کا باپ اسے بڑے لوگوں سے دور رہنے کا اشارہ کرتا ہو، بلکہ حقیقت یوں تھی کہ یہ لوگ ہمیشہ بےمقصد باتیں کیا کرتے تھے جن کا سرپیر نہیں ہوتا تھا۔ اور اگر کوئی دلچسپ بات ان کی گفتگو میں آ جاتی تھی تو اپنی آواز اتنی دھیمی کر دیتے تھے کہ صرف برابر میں بیٹھا ہوا آدمی ہی سن سکے۔ یا پھر ایسے موقعوں پر ان کے جملے ادھورے ہونے شروع ہو جاتے تھے اور اس حد تک مہمل کہ لڑکے کے لیے انھیں سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر نے نئی سگریٹ کو ہونٹوں میں ادھر اُدھر لڑھکاتے ہوئے کہا:

"اس حد تک ذاتی کہ کوئی شخص اپنی مونچھوں کے معاملے میں دوسرے کی رائے سننی تو کیا جاننی ہی نہیں چاہتا ہے۔"

"ہرگز نہیں؟" ایک ساتھی نے کہا۔ "مونچھیں بناتے ہوئے میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں، برابر تو ہیں نا؟"

"ہاں، لیکن اس میں یہ بات مضمر ہے کہ وہ اپنی مونچھوں کی مستقل شکل کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں، اس میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے ہیں۔"

"اور اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔" ایک اور ساتھی نے کہا، "کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے نظر آتے ہیں، فرنچ کٹ میرے چہرے پر اچھی لگے گی یا سرسید جیسی یا ٹیگور..."

"آ؟" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن ہم داڑھی کی بات کب کر رہے ہیں؟ بات تو مونچھوں کی ہو رہی ہے۔ داڑھی رواج اور مذہب اور عقیدت اور نجانے کیا کیا اپنے پیچھے چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ جیسے امریکا میں اکثرویشتر فرائڈین سائیکولوجسٹوں کی داڑھی..."

"ایک طرح سے داڑھی اجتماعی تحت الشعور کی غمازی کرتی ہے۔" ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔

ڈاکٹر نے کہنے والے کی طرف مسکرا کر دیکھا، کیونکہ اس بات کا تعلق اس کے اپنے شعبۂ فکر سے تھا اور کہنے والے نے اس کے پیشے میں داخل ہو کر ایک طرح سے چھیڑخانی کی تھی۔

پھر ڈاکٹر نے بھی اُسی لہجے میں کہا: "جی ہاں! اور مونچھیں انفرادی تحت الشعور کی۔

کسی کسی کی مونچھیں اس کی شخصیت میں سے کہاں سے نکل کر آتی ہیں یہ انھیں رکھنے والے کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا ہے۔"

پھر اس نے سب پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا: "کبھی کسی نے اپنے حجام سے مشورہ لیا ہے کہ اس پر کیسی مونچھیں سجیں گی؟ یہ سی ایک بار رکھ لینے کے بعد اسے یہ جاننے کی بےچینی رہتی ہے کہ وہ اس کے چہرے پر کیسی لگ رہی ہیں۔ وہ اس کی شخصیت میں سے اُبھر کر آتی ہیں اور اس کی شخصیت کو مکمل کر دیتی ہیں .. ایک طرح کا کومپینسٹری عمل۔ لوگ داڑھی کے وجود سے اکثر کھیلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن مونچھیں؟ ایک بار آ گئیں تو آ گئیں! کوئی انھیں چھنوانا کٹوانا نہیں چاہتا ہے..."

اس نے اپنی آواز کو بہت ہی مدھم کرتے ہوئے کہا: "اب خواہ وہ اتنی بڑی ہو جائیں کہ ان کے لگنے سے دوسرے کو چھینکیں آنے لگیں یا وہ مدمقابل کے نتھنوں میں سرسراہٹ پیدا کرنے لگیں..."

آواز دھیمی ہوتی گئی، اتنی دھیمی کہ لڑکے کو ان لوگوں کے پاس سے ہٹ ہی جانا پڑا۔ وہ باہر جا کر بوندیوں میں کھڑا ہو گیا اور اس گیت کو یاد کرنے لگا جو بچے ایسی ہی بارش کے لیے گایا کرتے ہیں جو دھوپ کے سنگ پڑ رہی ہو۔

لیکن اس کے ساتھی دور تھے۔ لیدے کے یہی مختلف عمروں کے آدمی اس کے دوست رہ گئے تھے جن میں سے اوّل تو کسی کو بچوں کے ساتھ بات چیت کرنا نہیں آتا تھا، یا آتا تھا تو اتنا کہ ان میں سے کبھی کبھی کوئی آ کر اس سے یہی پوچھ لیتا تھا:

"And what would the youngman like to have?"

اس پر اس کا باپ وہیں دور سے چلا کر کہتا تھا:

"Give him some ice-cream and he would be happy."

لڑکا خود کو آئس کریم اور بونٹو جیسی کی عمر سے بڑا سمجھتا تھا لیکن کوئی بھی اسے پسند نہیں تھی۔ ایک طرح سے وہ خود کو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح محسوس کرتا تھا۔ نہ وہ اپنی عمر کے ساتھیوں میں سے تھا جو شطرنج کے مہرے تک نہیں پہچانتے تھے چہ جائیکہ میخیل ٹال اور بوبی فشر کی بہترین گیمز انھیں یاد ہوتیں۔ نہ ہی وہ ان بڑی عمر کے لوگوں میں سے تھا کیونکہ تمام تر توجہ اور عزت دیے جانے کے باوجود وہ اس سے فرق نہیں تھے۔ جب بھی کوئی خاص بات آ جاتی تھی تو وہ اسے چھپائی جانے والی بات بنا دیتے تھے اور لڑکے کو اٹھ کر ادھر اُدھر ہو جانا پڑتا تھا۔ یہ سب کچھ اسی تواتر سے ہر جمعے کو کئی مہینوں سے ہو رہا تھا۔ اس کا باپ اسے کار میں بٹھا کر اس گھر میں لے آتا تھا جو ایک طرح سے ان لوگوں کا کلب تھا جسے کوئی گوون (Goan) فیملی چھپواں چوری چلا رہی تھی۔ نہ باہر کوئی بورڈ تھا، نہ ہر کسی کو اندر آنے کی اجازت تھی۔ صبح گیارہ بجے سے لوگ آنے شروع ہو جاتے تھے اور وہ ان سب کو پہچان گیا تھا .. کچھ تو وہی تھے جو اس کے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ کچھ نئے تھے جن سے اسی گھر میں واقفیت ہوئی تھی۔ کلب چلانے والے نے گھر کے سب سے بڑے کمرے اور اس کے آگے کے برامدے اور صحن کو کلب میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ ہر

چھٹی کے دن وہ ان تین حصوں کو کلب میں کنورٹ کر دیتے تھے۔ کیونکہ گھر کی تصویریں اسی طرح لگی رہتی تھیں۔ سجاوٹ کی چیزیں اپنی اپنی جگہ پر اور برآمدے کی ٹہنیوں سے لٹکے ہوئے نازک نازک گملے بھی اسی طرح لٹکے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ حتیٰ کہ بجریگر کا پنجرہ بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکایا جاتا تھا اور کوکاٹو اپنے پرچ (perch) پر بیٹھا دوسرے جانوروں اور لوگوں کو پکارتا رہتا تھا: اینٹونیو۔ گریگری۔ تھیلما (Thelma)۔ گریگری بلّے کا نام تھا جو دروازے کو دھکا دے کر اندر کے کمروں میں سے باہر آتا تھا اور کچھ دیر کوکاٹو کو دیکھ کر واپس اندر چلا جاتا تھا۔ جیسے اس کے سپرد بھی ایک کام ہو۔

اینٹونیو ایک بیس بائیس سال کے لڑکے کا نام تھا جو مسز فرنانڈیز کے ساتھ۔ اگر کبھی تاش کی وہ محفل اتوار کو بھی جمتی -- یعنی اگر وہ چھٹی کا دن ہوتا -- چرچ سے بارہ بجے کے قریب لوٹتا تھا۔ لیکن تھیلما کون تھی یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

مسٹر فرنانڈیز اینٹونیو کو بیٹا کہہ کر بات کرتے تھے لیکن وہ ان کا لڑکا تھا نہیں۔ غلط بھی تھا کہ اس کا کام مسز فرنانڈیز کو چرچ لانا لے جانا ہے کیونکہ وہ بہت وزنی تھیں اور ایک طرف سے فالج زدہ ہونے کے سبب ان کے بےسہارا چلنے میں یہی احتمال ہوتا کہ وہ لڑھک جائیں گی۔ مسٹر فرنانڈیز خود چرچ جانے کے قائل نہیں تھے۔ ان ساتھیوں میں سے وہ کس کے دوست تھے یہ تو دس سال کی عمر والے کو معلوم نہیں تھا۔ کسی نے کسی کے دو دوست ہوں گے نہیں ان لوگوں کو یہاں بیٹھنے کی جگہ انہوں نے دے رکھی تھی۔

کبھی کبھی جب لڑکے کو اٹھ کر اندر پیشاب کے لیے جانا پڑتا تھا تو وہ دیکھتا تھا وہ ایک صوفے میں دھنسے بیٹھے ہیں، برابر میں جھاگ سے بھری ہوئی بیئر کا گلاس رکھا ہے۔ ان پاس کوئی نہیں ہے۔ ان کی رانوں پر گرا ہوا ایک میگزین کھلا پڑا ہے۔ لیکن اس پر ان کی نگاہ نہیں ہوتی تھی۔

اس طرح کوئی اکیلے گھنٹوں کس طرح بیٹھ سکتا ہے؟ یہ بات لڑکے کو عجیب لگتا تھا۔

ایک آدھ مرتبہ یوں بھی ہوتا تھا کہ مسز فرنانڈیز اندر کے دروازے کو کھول کر اس کمرے کی دہلیز پر کھڑی ہو جاتی تھیں جہاں مسٹر فرنانڈیز تنہائی بیٹھے ہوتے تھے۔ لڑکا یہ تو توقع کرتا کہ وہ انہیں کھانے کے لیے کہہ کر اندر چلی جائیں یا بغیر کچھ کہے ہی غائب ہو جاتی تھیں۔ یہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ چل کر وہ بجریگر تک جاتیں۔ انہیں کبھی کبھی ڈانٹیں۔ چھوٹے کمروں میں بلی کو چیک کرتیں اور کوکاٹو کو بسکٹ دے کر اس کے سر کو تھپتھپاتی جاتیں۔

"ہاؤ آر یو؟"

"ہاؤ آر یو؟" سلیٹی رنگ کا توتا کہتا۔

"ہاؤ آر وی ٹوڈے؟" اس کے باپ کے ساتھیوں میں سے کوئی پتے پھینٹتے ہوئے کہتا۔ اس کے ساتھ ہی مسز فرنانڈیز کی [illegible] چرچ [illegible] ادھر اور دو ایک پیر ادھر چل کر ہوتے [illegible]

لڑکا اپنی میز پر سے دلچسپی بھری نظروں سے اس شش کو دیکھتا رہتا۔ ایسے معلوم ہوتا

تھا اتنی دیر میں اس کا ساتھی نئی چال نہیں چل پائے گا۔

بساط کے وسط پر جما جانے کی اہمیت کتنی ہے، اس سے وہ لوگ، سوائے اس کے باپ کے، سب ناواقف تھے۔ جن کو شطرنج آتی تھی وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کھیل کیا رہے ہیں؛ کنگز پان اوپننگ ہے یا کوئنز گمبیٹ ڈکلائنڈ؟ اگر دفاع ہے تو انڈین یا کاروکان۔ ان لوگوں کی شروع کی چالیں رٹی بندھی تھیں۔ سالہاسال سے وہ اسی طرح بغیر اختراع کے کھیلتے آئے تھے کہ مقابل کی نظر چوکے تو اس کا رُخ مار لو۔ اور جب وہ کھیلتے کھیلتے تھک جاتے تھے تو اٹھ کر کنٹریکٹ برج میں شریک ہو جاتے تھے جو ہر میز پر کھیلا جا رہا ہوتا تھا اور ہر میز پر اس کا اسکور لکھا جا رہا ہوتا تھا: نوبڈ اور پاس، اتنے ہارٹ اور اتنے اسپیڈ۔ بس یہ لوگ دن بھر یہی کرتے رہتے تھے، اور جب وہ تھک جاتے تھے تو ڈرنکس سرو کیے جاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہوتا تھا جس کے لیے نزدیک کے کیفیٹیریا کو رنگ کرنا پڑتا تھا، اور لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتے تھے۔

شام آ چلی تھی اور کلب سے چلنے کا وقت بھی نزدیک آ رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے مسٹر اور مسز فرنانڈیز دونوں ہی دیکھنے میں نہیں آ رہے تھے، ورنہ ایک ہاتھ مسٹر فرنانڈیز بھی کھیل لیا کرتے تھے۔

اچانک ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ کر کے بوندوں نے تیزی سے گرنا شروع کر دیا اور لڑکے کو اندر بھاگنا پڑا۔

اب سب یہاں گھر گئے تھے؛ کم سے کم وہ تو گھر ہی گئے تھے جن کے پاس کار نہیں تھی اور جنھیں جانا بھی دور تھا۔ کسی کی بس ساڑھے چھ بجے نکلتی تھی کسی کو لوکل ٹرین پونےسات پر ملتی۔

کسی نے ڈاکٹر سے کہا،

"Forget the moustache, tell us something new."

"یہ نیا نہیں تھا جو میں نے بتایا ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"تھا تو، لیکن مونچھوں کی دنیا اتنی محدود ہے کہ اس پر زیادہ دیر بات نہیں ہو سکتی ہے۔"

"Who says?" ڈاکٹر نے کہا، "مونچھوں پر تو آدمی گمال عبدالناصر اور فیدل کاسترو کی طرح اٹھائیس اٹھائیس گھنٹے بول سکتا ہے۔ مثلاً سلوں لنامنٹ پر بنے ہوئے آدمی کی مونچھیں جنھوں نے اس تیل کو نام کا شرف بخشا ہے؛ مونچھوں والا تیل۔ اور اگر کسی کی ویسی مونچھیں ہوں تو اسے تیل والی مونچھ کہیں گے۔ اس پر تو پورا مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔"

"آ گئے اپنے پروفیشن پر؟" کسی نے کہا۔

"نو، نو، سلوں لنامنٹ اشتہاری دوا ہے۔ میرے پروفیشن سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر کبھی کسی کے لیے ایسی دوائیں جیسے گھٹی، امرت دھارا یا وکس ویپورب نہیں لکھے گا۔ ایسی لیمپ کی دوائیں تو کوئی بھی کسی کو بتا سکتا ہے۔"

"گرائپ واٹر، essential oils؟"

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نے اثبات میں ان الفاظ کو دوہرایا۔

ساتھیوں میں سے ایک نے کہا، "زیادہ تر دوائیں آج کل اسی قسم کی ہیں، ہر ایک ہر ایک کو ٹرانکولائزرز، اینٹی بایوٹکس، پین کلرز اور اینٹی پائرٹکس بتا سکتا ہے، بلکہ بتاتا ہے۔ میں اپنی بیوی کی ہر چھوٹی چھوٹی بات کے لیے ڈاکٹر کے پاس دوڑا نہیں جاتا ہوں۔ ہم نے خود گھر میں چھوٹی موٹی ڈسپنسری رکھ رکھی ہے۔"

"اور اس میں سے یہ اور وہ گھر والوں ہی پر آزماتے رہتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"اور ڈاکٹر لوگ کیا کرتے ہیں؟ وہ بھی دوائیں آزماتے رہتے ہیں، اس اینٹی بایوٹک نے کام نہیں کیا تو دوسری سہی، دوسری نہیں تیسری۔"

اچانک گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے لڑکے نے کہا،

"First generation cephalosporines, second generation cephalosporines."

"Hey! You are already a doctor!" بوڑھے شطرنج کے کھلاڑی نے کہا۔

لڑکے کے باپ نے کہا، "ان کی ماں اکثر بیمار رہتی ہیں۔ یہ اسی کا طفیل ہے۔"

سب ہنس پڑے۔

ایک ساتھی نے آواز دھیمی کر کے ان صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جنھوں نے "ایک اینٹی بایوٹک نے کام نہیں کیا تو دوسری سہی" کہا تھا، "بس بات تب بگڑتی ہے جب درد کی چک پہچاننے میں غلطی ہو جائے، جب بھابی۔۔۔"

بات مُن مُن، مُن مُن میں کھو گئی۔

پھر ایک قہقہہ پڑا۔

کسی نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ بجلی کب کی جا چکی تھی اور اندر کے اندھیرے اور حبس سے تنگ آ کر مسٹر فرنانڈیز بھی ان لوگوں میں آ کھڑے ہوئے تھے۔

میز پر جھک کر انھوں نے سگار کی راکھ جھاڑی اور بغیر کسی کی طرف دیکھے کہا،

"آج ڈاکٹر سے اس کا کوئی کیس سنو۔ پیچش، بخار، سر کا درد، یہ تو ہر ڈاکٹر کے حصّے میں آتے ہیں، خون کی الٹی، ابورشن اور threatened ابورشن بھی۔ لیکن دوسرے کیس۔۔۔"

"کون سے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"جو تمھارے حصّے میں آتے ہیں میں! نیچو کے نہیں، ایدھر اوپر کے کیس،" مسٹر فرنانڈیز نے اپنی کنپٹی پر انگلی دھر کے کہا۔

اس پر کسی نے کہا، "اس معاملے میں یہ پورا بومیدین ہے۔ کبھی منھ سے نہیں پھوٹے گا۔ میں اسے بیس سال سے جانتا ہوں۔"

"بومیدین کیسا؟ وہ الجیریا والا؟" مسٹر فرنانڈیز نے کہا۔ انھوں نے یہ نام آج پہلی بار سنا تھا۔

"وہی۔ جیسا وہ گھنّا تھا، کبھی ٹیلی وژن تک پر نہیں آتا تھا، ویسا ہی یہ بھی گھنّا ہے۔"

سب ہنس پڑے۔ واقعی میں ڈاکٹر کا یہی نام تھا، کم از کم اس کلب کی حد تک۔ جب چھٹی کے دن اس کے آنے میں دیر ہو جاتی تھی یا جس دن وہ نہیں آتا تھا تو سب ایک دوسرے سے

۔۔۔ سے پوچھتے،

"آج سپرنٹنڈنٹ نہیں آیا؟"

"Where is Boumedine?"

اس کے منہ سے مریضوں کے بارے میں کسی نے کوئی بات کبھی نہیں سنی تھی، اور سب جانتے بھی وہ جسم کے کس حصّے کا ڈاکٹر ہے۔ بعض اسے شرنک (shrink) بھی کہتے تھے، اور بعض سرسکڑ (head-shrinker) بھی یعنی دماغ کو سکیڑ دینے والا۔ لیکن اپنا یہ نام سن کر وہ محض ہنس دینے پر اکتفا کرتا تھا۔

بومیدین ۔۔ سپرنٹنڈنٹ یا شرنک ۔۔ جو بھی اسے کہا جائے ۔۔ برج کا اچھا کھلاڑی تھا۔ وہ سگریٹ بھی پیتا تھا اور سگار بھی۔ کبھی کبھی جب اس کا کوئی ساتھی اٹھ کر باتھ روم چلا جاتا اور کھیل رک جاتا تو وہ اٹھ کر نو دس سال والے لڑکے کے پاس آ کھڑا ہوتا اور پوچھتا، "کون جیت رہا ہے؟"

یا پھر اس کے منہ سے نکلتا تھا، "You are at advantage! ایک پیدل ہی سہی، پھر بھی تو شیخ پر ہو۔"

شروع میں اس نے ایک آدھ مرتبہ لڑکے سے اس کے اصلی ساتھیوں کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ ان میں سے کس کس کو کس چیز کا شوق ہے، اور یہ سن کر کہ سب دن بھر وی سی آر سے چپکے رہتے تھے اور سنسنی اسنیکس کے شیدائی تھے، اس نے تاسف سے کہا تھا،

"What a pity! You should have been born elsewhere. This is no place for you."

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور کسی کو گھر جانے کی جلدی بھی نہیں تھی۔ مسٹر فرنانڈیز کے اصرار کے باوجود جانے پر بومیدین نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا،

"Let's talk about the human moustache again.

کیسی species specific چیز ہے! اتنی دودھ پلانے والی مخلوق دنیا میں ہے، سب کے ناخن اور بال ہوتے ہیں، لیکن مونچھ صرف انسان کے حصّے میں آئی ہے۔"

لوگ ہنس پڑے۔

بومیدین نے نو دس سال کے لڑکے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا،

"Youngman, what do you say?"

لڑکے نے جھینپتے ہوئے کہا، "سب ہی کے ہوتی ہے بلی کے، کتے کے، خرگوش کے، چوہے کے۔

They have whiskers, don't they?"

سب نے ستائش کی، ڈاکٹر نے بھی۔

"تو پھر بومیدین، اپنا کوئی کیس سناؤ،" مجمع میں سے کسی نے کہا۔

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا، "اصل میں مشکل یہ ہے لوگ سمجھتے ہیں جرم کے بارے میں سننے کے لیے سب سے اچھی کہانی پولیس انسپکٹر کے پاس ہوتی ہو گی کیونکہ اس کی زندگی ہی کریمنلز میں گزرتی ہے، اسی طرح فلمی دنیا سے متعلق ایکٹرز ڈائرکٹرز کے پاس، اور نفسیاتی بیماریوں سے متعلق سائکائٹرسٹ کے پاس، جو کہ بدقسمتی سے میں ہوں۔ لیکن میں

Scanned with CamScanner

جانتا ہوں نہ پولیس سراغ رساں کے پاس سنانے کے لیے کوئی کہانی ہوتی ہے نہ فلم بنانے والے کے پاس نہ نفسیاتی امراض کے معالج کے پاس۔ سب اندر سے اپنے اپنے پیشے سے بیزار ہوتے ہیں۔"

تھوڑے توقف سے اس نے کہا، "بلکہ دیکھا جائے تو نفسیاتی میڈیسن میں پیش آنے والے تمام واقعات، خواہ ان کا تعلق..." اس نے اس لفظ کو اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ بمشکل ہی اسے کوئی سن پایا ہو گا، "سیکس ہی کیوں نہ ہو، سائیکٹرسٹ کے لیے اس واقعے کو کہانی سے خالی کر دیتے ہیں۔ اب بھلا یہ بھی کوئی کہانی ہوئی کہ ایک لڑکی ہے جو اپنی سسرال نہیں جانا چاہتی ہے کیونکہ وہاں اس کا سسر..." آواز ایک بار پھر اتنی دھیمی ہو گئی کہ سب کو نو دس سال کی لڑکی کی طرف دیکھنا پڑا جیسے وہ اس کا ذمہ دار ہو، "... اور یہ سسرال والی بات بھی کتنے دن میں کھل کر سامنے آتی ہے۔ اور جب کھل کر سامنے آتی ہے تو اتنے ٹکھڑوں سے کہ اس میں سے سسپنس، اگر کبھی تھا بھی، تو غائب ہو چکا ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر اس سسپنس کے عنصر سے سائیکٹرسٹ پہلے ہی واقف ہوتا ہے۔ سسپنس اس کے نزدیک اگر ہوتا بھی ہے تو اس بات کا کہ دیکھیں کب وہ سبجیکٹ -- یعنی مریضہ یا مریض -- اس بات کو زبان پر لائے گا اور اپنی جسمانی علامتوں کا سمبندھ اس ہیجان پیدا کرنے والی صورتِ حال سے ڈھونڈ نکالے گا۔ پھر سارا کام ان جسمانی علامتوں کے ایک ایک کر کے سوئچ بند کرنے کا رہ جاتا ہے جو اصلی کام ہے -- پہاڑ پر چڑھائی۔ You see, there is no suspense in all this for the therapist."

اس کے بعد کی خاموشی کے طویل وقفے میں لوگ باہر پتوں سے ٹپکنے والی بوندوں کی آواز سن سکتے تھے۔

پھر کسی نے کہا، "خیر تھیراپسٹ کے لیے اس میں سسپنس ہو نہ ہو، ہمارے لیے تو ہے۔ اور اس پہاڑ پر چڑھائی والے اینٹی کلائمکس کو ہم پروفیشنل ذمہ داری سمجھ کر نظرانداز کر سکتے ہیں۔"

"کہانی اس کے بنا بھی چلے گی؟" مسٹر فرنانڈیز نے کہا۔

کئی ایک نے کہا، "جی ہاں، کوئی اپنا کیس سنائیے، جٹ پٹا سا۔"

"کہ؟" ڈاکٹر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"جو ہمارے لیے بالکل نیا ہو۔ یہ ایڈی پو (Oedipus) اور ہیلوسی نیشنز (hallucinations) وغیرہ کا چکر تو اکثر فلموں میں ہم بھی دیکھتے رہتے ہیں۔"

"اور دوہری شخصیت بھی..."

"اور تہری، چوہری..."

"یہاں تو ہر بدمعاش کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں -- ایک کو وہ مرڈر کرنے، رشوت لینے کے کام میں لاتا ہے، دوسری کو لے کر حج پر جاتا ہے۔"

مسٹر فرنانڈیز نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، "یہ ہمارے کو مروائیں گا مَین! حج پڑھنے کو ایسا آدمی جاتا، یہ بات ہم تمہارے منھ سے آج پہلی دفعہ سنا۔ کوئی باہر سن لیں گا تو کلب بند کرنا

پڑیں گا۔"

"آپ سب لوگ پڑھے لکھے لوگ ہیں، مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "سائیکٹری میں کوئی کیس ایسا نہیں ہوتا ہے جسے آپ بدلی ہوئی شکل میں کہیں اور پڑھ نہیں چکے ہیں، سن نہیں چکے ہیں، دیکھ نہیں چکے ہیں۔ حوّا کے تین چھوٹے تھے۔ ہابیل نے قابیل کو مارا تھا..."

"قابیل نے ہابیل کو مارا تھا۔ Man, Cain was the eldest son of Adam; he murdered his younger brother Abel." مسٹر فرنانڈیز نے درست کیا۔

"All right! قابیل نے ہابیل کو مارا ہو گا۔ لیکن میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہیروئن کے لیے کوئی نوجوان کس دھوکے سے بہن کے گلے سے اس کی منگنی کا ہار..."

کسی نے ٹوکا، "منگنی کی انگوٹھی۔"

ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "خیر جو کیس اس وقت میرے ذہن میں تھا اس میں ایک نوجوان نے اپنی بہن کے گلے سے بہانے سے اس کی منگنی کے جوڑے کے ساتھ آیا ہوا سونے کا ہار اتروا لیا تھا کہ تھوڑی دیر پہن کر دیکھوں گا -- آج کل نوجوانوں میں رواج ہے نا کسی چیز کے گلے میں ڈالنے کا، جینز کی طرح، یا جس طرح مسٹر فرنانڈیز کے گلے میں چین میں کراس پڑا ہے -- اور گھر والوں کی نظر چوکتے ہی جو وہ گھر سے غائب ہوا تو اس کے گھر والوں کو تیسرے دن پتا چلا کہ وہ ا... ٹرسٹ والوں کو کہاں پڑا ہوا ملا اور کس حالت میں تھا۔ اس سب میں سسپنس کہاں ہے؟ منشّیات کی دنیا، لاشعور اور تحت الشعور، cognition theory, Gestalt Psychology, Phenomenology، دوہری شخصیت، اسکٹزوفرینیا کے ہیلوسی نیشنز، پیرانویا اور حسد -- سب ادب اور ادب سے زیادہ صحافت کی ملکیت بن چکے ہیں۔ سائیکٹرسٹ کے لیے تو یہ اس کا بریڈ اینڈ بٹر ہیں۔ بےلطف باتیں، جن سے اخبار اور ادبی رسائل پڑھنے والے ہی لطف لے سکتے ہیں۔"

"ہم وہی اخبار اور ادبی رسائل پڑھنے والے ہیں۔"

"تو روک کون رہا ہے -- پڑھتے رہیے۔" ڈاکٹر نے کہا، "جب طبیعت بوجھل چیزیں پڑھنے پر آمادہ ہو تو گاندھی جی کی شروع کی زندگی میں aggression یعنی چھپی ہوئی جارحیت کو ڈھونڈیے، کارل جاسپرز کو پڑھیے، تصویروں میں چھپی ہوئی پُراسرار مسکراہٹ کے رموز کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اور جب کہانی پڑھنے پر مائل ہوں تو ایک جہاں ہے بیسویں صدی میں -- پڑھتے ہی رہیے۔"

"اصل میں جس چیز نے سائیکٹرک کیسز کو دلچسپ بنایا وہ تھا احساسِ جرم یا گناہ کا تصوّر، کہ ہر نفسیاتی مسئلے کے پیچھے ایک حقیقی یا فرضی گناہ چھپا ہوتا ہے..."

سب نے نو دس سال والی لڑکی کی طرف دیکھا جیسے وہاں اس کی موجودگی سے ناخوش ہوں۔

"اور وہ خود، یعنی سبجیکٹ، اپنے اندر چھپے ہوئے اس احساسِ جرم سے بےخبر رہتا ہے -- یہی ہوتا تھا نا پرانے لٹریچر میں؟" اس نے زیادہ بولنے والے ساتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے

دوسرے نے کہا، "نہیں۔ میرا خیال ہے بومیدیں نے آج اپنی خاموشی کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ سب یا تو مطلع ہے یا گریز۔"

"نہ مطلع ہے نہ گریز۔" بومیدیں نے کہا، "اور میں کیا اور میری خاموشی کیا! بومیدیں اگر خاموش رہتی تھی، تیلی وژن پر اپنی نمائش کرنے سے کتراتی تھی، اور سوزینشلی میں اگر پہلی خبر ان سے متعلق نہیں چھپی تھی، تو اس کی وجہ ان کا انکسار ہو گا، یا حسرت مزاج کے جھنیپو ہوں گی۔ میں کچھ یوں ہی نہیں جو مجھ میں انکسار ہو۔ انکسار کروں گا تو سرے سے غائب ہو جاؤں گا۔"

سب ہنس پڑے۔

ایک شخص نے جس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، چھیڑنے والے انداز سے کہا، "مثلاً جو صاحب ایک مشہور پیر صاحب کی زوجہ ہیں اور نشست ملک اپ کر کے اور اوپر سے مرقع ہوں کر آپ کے پاس آتی ہیں انہیں کیا پرابلم ہے؟" اس نے اپنے اردگرد والوں پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی، جیسے وہ اکیلا اس راز کو جانتا ہو۔

جن صاحب نے اپنی چھتری کھول لی تھی اسے دوبارہ بند کرنے لگے۔

بومیدیں جیسے کھویا ہوا سا تھا۔

"ہوں، کیا سوچ رہے ہیں؟ سنا ہے موصوفہ کا تعلق لاہور کی۔۔۔" (الفاظ زیرلب چلے گئے۔)

"سی سی، یا ان کی والدہ کا ہو گا۔ ہر طرف ان کی عزت ہے۔ جو پیر صاحب کے پیر چھوتے ہیں ان صاحبہ کے پیر دھو کر پیتی، اگر موقع مل جاتی۔ سچ بتائیے انہیں کیا تکلیف ہے؟"

"ہو سکتا ہے محض ملاقات کو آتی ہوں۔" کسی اور نے کہا۔

ڈاکٹر نے کھوئے کھوئے انداز سے کہنا شروع کیا، "پچھلے ہفتے، بلکہ پچھلے سے پچھلے، میرے پاس ایک بڑھیا لائی گئی تھی۔"

کسی کی آواز سنائی دی، "لاحول ولاقوہ۔"

"بیوہ۔ اس کا جوان بیٹا غائب ہو گیا تھا۔ گھر سے بجلی کا بل ادا کرنے نکلا تھا، پھر پتا نہیں کہاں گیا۔"

"کسی نے مار دیا ہو گا۔ یا کرفیو میں گھر سے نکلا ہو گا اور شوٹ اون سائیٹ کا آرڈر ہو گا۔"

"ممکن ہے۔" ڈاکٹر نے اسی کھوئے کھوئے لہجے میں کہا، "لیکن بڑھیا کے پاس کوئی دوسرا نہیں تھا جو اس کی ڈھارس بندھاتا، تھانا چوکی کرتا۔ دو دن وہ گھر میں اکیلی پڑی رہی کیونکہ باہر فوجی گاڑیاں گھوم رہی تھیں۔ بہرحال جب اسے میرے پاس لے کر آئے تو وہ بالکل بُت بن چکی تھی۔ نہ کھا رہی تھی نہ پی رہی تھی۔ اس کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی! اےجی مُنّے کے باپ کو بلاؤ۔ اس کے پڑوسیوں نے باربار کہا مُنّے کا باپ تو کب کا مر چکا ہے، جب ہندوستان پاکستان بنے تھے۔"

"اسے آپ کیا کہیں گے؟ ہسٹیریا؟" کسی نے کہا۔

ڈاکٹر نے سوال کرنے والے کے چہرے کو دیکھا اور سوال کو غیراہم سمجھتے ہوئے کہا، "کتنا

ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے ہوتا تھا؟" اس نے کہا، "ہم تو سمجھتے ہیں ہوتا ہے۔ ایک آدمی بچپن یا نوجوانی میں جرم کرتا ہے یا یہ کہ اس سے جرم سرزد ہو جاتا ہے۔۔۔"

ڈاکٹر نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا، "جی ہاں، جی ہاں۔ اور شعور اس تلخ حقیقت کو کھدیڑ کر لاشعور میں پھینک دیتا ہے۔ اس طرح سبجیکٹ نشوونما بھی پاتا رہتا ہے اور اس کی ذہنی زندگی کا ایک حصّہ ٹھٹھر کر بھی رہ جاتا ہے، جیسے ایک بڑے بڑے پھولوں والے پودے کی ایک شاخ کے پتّے اور پھول سدا بہت ہی چھوٹے ہوتے ہوں۔ سبجیکٹ جیتا تو ہے لیکن روحانی دوزخ میں کلبلاتا رہتا ہے یہاں تک کہ نفسیات کا ماہر اسے چمکار پھُسلا کے، یا جس طرح جانور کو ذبح کرنے کے لیے لے جایا جاتا ہے، اس کالی کوٹھریا سے باہر بلاتا ہے اور روشنی پڑنے پر ۔۔ یعنی اُن دنوں اس طرح سمجھا جاتا تھا ۔۔ سبجیکٹ کو پتا چلتا ہے کہ اس نے ناحق ایک عام سی بات کو اتنا بڑھاچڑھا کر اپنے اوپر مسلّط کر لیا تھا اور یہ کہ یوں تو سب کی زندگی میں ہوتا ہے، بلکہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ذہنی اور جذباتی سفر کی یہ سب یادگاریں ہوتی ہیں، باقیات الصّالحات۔ کسی پر اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں سے۔۔۔" (آواز دھیمی ہو گئی۔) "۔۔۔ عشق چپکا رہ جاتا ہے، کہیں ماں باپ کی موت کی دبی ہوئی خواہش ۔۔ نفسیات کے مطالعے کے یہ پوپولر اجزا ہیں، جس طرح سمندر کی سیر پر جانے والے سیپیاں اور رنگ برنگے پتھر بٹورتے چلتے ہیں۔۔۔"

"لیکن ان سے ڈرتے نہیں ہیں۔" کسی نے کہا۔

"جی ہاں، وہ ان سے ڈرنے لگیں تو کہانی بن جاتی ہے۔ فکشن اور اسکرین پلے میں ان کیس ہسٹریز کو لکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ۔۔ بلکہ رکھا جاتا ہے ۔۔ کہ وہ بچپن کا جرم یا گناہ کہانی کی ضرورت کے مطابق بالکل آخیر میں قاری یا دیکھنے والے پر کھُلے۔"

بارش تھمتی جا رہی تھی۔

لوگوں کی ٹانگوں نے وہ حرکت شروع کر دی تھی جو کسی طویل نشست سے اٹھنے کا ارادہ کرنے والوں کی ٹانگیں کرتی نظر آتی ہیں۔

"مگر آپ مریض کے تحت الشعور میں ان چھپے ہوئے احساسات کو ڈھونڈتے تو ہوں گے؟"

ڈاکٹر نے کھنکھارتے ہوئے کہا، "لاشعور میں۔" اس کے ماتھے پر عمودی جھرّیاں پڑ گئیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر اس نے کہا، "سارا معاملہ تفصیلات اور جزئیات کو جمع کرنے کا ہے کہ آپ کس زاویۂ فکر سے انہیں جمع کرتے ہیں۔ اس عمل کی علّتِ غائی کیا ہے۔ اگر یہ علّت تفریحِ طبع نہیں ہے تو لاشعور میں ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کب پیش آتی ہے ۔۔ مریض بھی اس سے آگاہ ہوتا ہے، معالج بھی۔ وہ جو راز ہے وہ ذہن کے محیط پر ہمیشہ موجود ہوتا ہے، تھوڑا سا فوکس سے باہر۔ صرف توجہ کو علامتوں کے مرکز سے اٹھا کر اس محیط تک لے جانا ہوتا ہے۔"

"تم نے دیکھا بومیدیں کس چابک دستی سے ہماری توجہ کیس ہسٹریز سے ہٹا کر توضیحات کی طرف لے جا رہا ہے۔" کسی نے کہا۔

Scanned with CamScanner

عام سا کیس ہے۔ اسی طرح ۱۹۴۷ کی بات ہے۔ میں لاہور ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑا غالباً وینڈر سے روٹیاں اور سالن لے رہا تھا کیوںکہ ہم اُن دنوں بےگھر تھے۔ میرے سامنے ایک ٹرین آ کر رکی اسی پلیٹ فارم پر۔ لوگ ڈبے ڈبے سے ادھر اُدھر سے آ کر اس میں بیٹھنے لگے۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ کون لوگ ہیں اور ٹرین کہاں جا رہی ہے۔ اسی وقت فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور میں نے سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی کو وہاں سے نکلتے دیکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا باپ تھا، ایک سکھ جس کے ہاتھ میں ریوالور یا پستول تھا جس کی نالی کو لڑکی اپنی پسلیوں میں پیچھے سے چبھتا ہوا محسوس کر رہی ہو گی۔ لیکن بجائے خوف زدہ ہونے کے مجھے ایسا لگا وہ اس ریوالور کے سائے میں خود کو محفوظ محسوس کر رہی ہے۔ اس کا باپ جو فوجی وردی پہنے ہوئے تھا، البتہ ذہنی کرب میں تھا اور ویسے ہی قدموں سے چل رہا تھا جیسے میں کرفیو کے اوقات میں فوجی افسروں کو ایک ہاتھ میں پستول تھامے ادھر اُدھر کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے گلیوں میں چلتے دیکھ چکا ہوں۔ ایسے میں قدم چھوٹے چھوٹے لیکن پُھرتیلے ہوتے ہیں۔

"بعد میں کسی نے کہا وہ اسپیشل ٹرین تھی اور وہ دونوں اس میں بیٹھنے جا رہے تھے۔ مجھے وہ دونوں اس وقت کسی دوسری ہی دنیا کے مخلوق لگے۔ انسان کی دنیا کے نہیں۔

"پھر میں نے چشمِ زدن میں اس سکھ فوجی افسر کو زمین پر گرتے دیکھا اور ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ خود زنانے ویٹنگ روم کی طرف بھاگتے ہوئے میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو گرتے ہوئے فوجی کے ہاتھ سے پستول چھین رہا تھا۔ لیکن اتنی دیر میں ایک فائر ہو چکا تھا۔ اور جب آدھے گھنٹے بعد میں پلیٹ فارم پر نکلا تو اسپیشل ٹرین جا چکی تھی۔ کتنے ہی دن میں سوچتا رہا وہ دونوں کہاں گئے، لڑکی اس ٹرین پر تھی یا نہیں۔"

مسخرے چہرے والے شخص نے کہا "یہی کچھ دوسری طرف بھی ہوا تھا۔"

ڈاکٹر نے کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی:

"پھر وہ عورت میرے ذہن میں اُبھرتی ہے۔ میری ایک بڑھاپے کو پہنچتی ہوئی مریضہ..."

حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا۔ کسی نے کہا "یہ ہوئی بات۔"

بومیدیں نے کہا "وہ عورت اپنی گود کے بچے کو سنبھالنے میں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اس کے رشتےدار اور پنڈ والے قافلے کے ساتھ آگے نکل گئے تھے۔ اُن لوگوں کو کہیں آس پاس نہ دیکھ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ شاید اسے امید ہو گی بہت جلد اس کے گھر والے اسے غائب پا کر اس کے لیے واپس آئیں گے۔ مہینوں قریبوں میں جاتے ہوئے ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا، اس لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور جب دروازے پر لوگوں نے کھٹکا کیا تو وہ جی آئی کہہ کر باہر نکلی۔ لوگوں نے اس کے ہاتھ سے بچے کو لے کر ہوا میں اُچھالا۔ اچھالنے والوں کے ہاتھ میں آپ کو معلوم ہی ہے کیا تھا ... انہوں نے ... اس عورت کی حالت جب بھی بگڑتی ہے ... اس واقعے کی وجہ سے نہیں، اپنی دماغی بیماری کی وجہ سے ... وہ پھر اسی دنیا میں پہنچ جاتی ہے اور ان گنت بار کہتی ہے: جی میں کہیں ان... جی میں کہیں ان... جی میں کہیں ان... ٹوبا میں ہی ٹوبا میں ہی، ٹوبا میں ہی... میری منو ہو میں...

"انھی دنوں جب میں نے سکھ فوجی کو زمین پر گرتے دیکھا تھا، ایک رات شور ہوا، پھر کسی کے چیخ مارنے کی آواز ہوا میں کھو گئی۔ اس چیخ سے میری آنکھ لمحےبھر کو کھلی اور میں پھر نیند میں ڈوب گیا۔

"اگلی صبح چھوٹی سی نہر کے کنارے لڑکے جمع تھے، جیسے ان کے ہاتھ ایک کھیل آ گیا ہو۔ میں نے دور سے اس منظر کو دیکھا۔ اس کے چھوٹی سی بکھری ہوئی داڑھی تھی۔ ممکن ہے بڑھا ہوا شیو ہو۔ اس کے پیروں میں نہ جوتے تھے نہ جسم کے نچلے حصے کا کپڑا۔ پتا نہیں وہ کیا تھا کون تھا۔ قمیص البتہ سینے سے چپک کر رہ گئی تھی اور جہاں جہاں خون میں ڈوبی تھی بالکل کھڑنک ہو چکی تھی۔ ہر آنے والا پوچھتا تھا: کون ہے؟ اور لڑکے جن کے ہاتھوں میں سنٹیاں تھیں ایک مذہبی رسم کی طرح اس کی قمیص کے دامن کو اوپر اٹھا دیتے تھے۔ اور جوں ہی کوئی عورت وہاں سے گزرتی تھی دامن کو دوبارہ نیچے کر دیتے تھے۔

"لوگوں نے کہا: رات کے چار بجے سپیشل ٹرین نے جانا تھا۔ یہ پتا نہیں اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔ بھاگ کر سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ ہمارے چوکیدار نے اسے للکارا۔ اور پھر اس نے اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے اسے گرا دیا۔ بس فر اودا گڈی چڑھنا رہ گیا!

"چوکیدار مجھے اس وقت کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کے بھی ایسی ہی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ آج بھی ان دونوں کی تصویریں میرے ذہن کی دیوار پر برابر برابر لگی ہوئی ہیں۔

"میں نے لوگوں کا قتلِ عام بھی دیکھا ہے۔ وہ جگہیں بھی دیکھی ہیں جہاں پندرہ منٹ کے اندر اندر موت کی نزدیکی سے بےخبر لوگوں کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں، جیسے ہرنوں کی ایک ڈار پانی پینے کو تال پر آئی ہو اور پاس ہی مچان پر چھپے ہوئے شکاریوں نے انھیں اس طرح گولیوں سے گھیر کر مارا ہو کہ ان کی لاشیں دائروں میں تال کے کنارے بکھری رہ گئی ہوں۔

"میں نے بوہری بازار کو دھماکوں کے بعد بھی دیکھا ہے جہاں عمارتوں کی دیواروں پر خون کے چھینٹے اڑ کر گئے تھے اور کہیں کہیں بوٹیاں بھی چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے وہ نوجوان بھی یاد آتے ہیں جو ایک جگہ رکے ہوئے یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ ان کے سامنے جو چیز ریلنگ سے چپکی ہوئی تھی گوشت کی بوٹی تھی یا کلیجی کا ٹکڑا۔

"پھر لڑکیاں ہیں جنھیں باربار..."

آواز مدھم ہوتی گئی اور کافی دیر تک نیچی رہی۔

نو دس سال کا لڑکا اکتا کر دوبارہ شطرنج کی میز پر جا بیٹھا تھا اور کسی کھیل کے آخری حصے کو دوبارہ اپنی یادداشت سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر کوئی اس کے پاس چپکے سے جا کر کھڑا ہو جاتا تو سنتا وہ کہہ رہا ہے:

"Now where was the pawn? At Queen's 6. And the Black Bishop? ..."

مسٹر فرنانڈیز نے اونچی آواز میں کہا "مَنی، تم نے تو کہانی سنانے کی جگہ سب کو ڈیپریس کر دیا۔ ایسے یہ کلب کیسے چلے گا؟"

ان کی بات کا ڈاکٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور اگر ہوا تو اتنا کہ اچانک اس کی آواز لوٹ

اٹی -- اتنی اونچی کہ لڑکا اپنے ہاتھ میں اٹھایا ہوا مُہرہ پکڑے کا پکڑا رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا: "تعجّب ہے اُن سب عورتوں، لڑکیوں، مرنے والوں کے باپ، بھائی، بیٹوں کو میں سالہاسال سے دیکھتا چلا آ رہا ہوں، لیکن نہ میں نے، نہ شاید میرے کسی ہم پیشہ نے، نہ ہی سرحدپار کے کسی ہم پیشہ نے، آج تک اُس فرد کو دیکھا ہے جو وحشت کے عالم میں خود سائیکیٹرسٹ کے پاس چل کر آئے اور کہے: میں نے ایک دودھ پیتے بچے کو اپنی بندوق کی سنگین پر لیا تھا۔ I was among those who opened fire on a group of unsuspecting human beings. میں نے ایک لڑکی کی..." (آواز مدھم ہو گئی۔) "...کے بعد چاقو سے اس کی..." (آواز دوبارہ مدھم ہوئی۔) "...کاٹی تھیں۔ میں نے اس فوجی پر پیچھے سے چھرا پھینک کر مارا تھا اور جب زمین پر گرتے ہوئے باپ نے خود بیٹی پر فائر کیا تھا تو مجھے افسوس ہوا تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی ضائع ہو گئی۔ Save me from my cruel conscience."

ایک دم برج پر بیٹھے ہوئے کوکانو نے کہا: "تیلما! تیلما!"

اس کی طرف پلٹتے ہوئے مسٹر فرنانڈیز نے کہا:

"Where is Thelma? You must be dreaming, old boy!"

حسن منظر

سوئی بھوک

امب (۱) کا لڑکا امیر بشک بہت دنوں سے روپوش تھا۔

کچھ کہتے تھے وہ جیل میں ہے -- اپنے خیالات کی وجہ سے۔ کچھ کا کہنا تھا باپ اور بڑے بھائی کے ٹوکنے کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

بھائی کہتا تھا: "پڑھ۔ کیوں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے؟"

باپ کہتا تھا: "نہیں پڑھتا تو نئی بارا کر۔ مال چرا۔ بیلوں بکریوں کو گھاٹ پلا کر۔ کنٹر کی مشین چلا۔ (۲) یہ کیا کہ جب دیکھو گھر سے غائب ہے؟"

ہم لوگ امیر بشک کی دل سے عزّت کرتے تھے۔ نہیں پڑھ رہا تھا تو کیا ہوا؟ ایسی پڑھائی کس کام کی جو یہ بھی نہ بتلا دے کہ دھان کو کتنے ماس میں ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ پوکھنا ہوتا ہے، یعنی کتنے ماہ اس کے روپنے کو لگتے ہیں اور کے ماہ فصل کے تیار ہونے میں۔

اور اگر پڑھ لکھ کے بھی آدمی محتاج رہے کہ عدالت میں اپنی پیروی تک نہ کر سکے تو پڑھنا خود جہالت کی بات ہے۔

امیر بشک کسی اچھے کام میں لگا تھا۔ کہاں؟ اس کی خبر ہم میں سے بس ان کو تھی جو اس کے ساتھ رہ چکے تھے، اس کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ ہم جیسوں کو نہیں، جنھوں نے اس کا بس نام ہی سنا تھا اور بن دیکھے اس کی پوجا کر رہے تھے۔

پھٹی (۳) چننے کا زمانہ تھا جب عورتیں اور لڑکیاں صبح صبح کھیتوں میں نکل جاتی ہیں اور دن بھر روئی چُنا کرتی ہیں۔ گاؤں کے گھٹے بھی ایسے دنوں میں قریب اور کھنڈرے نظر آنے لگتے ہیں۔ بیاج پر پیسا دینے والی عورتیں دبا کر سگریٹ پیتی ہیں اور ان کے مرد اُدھار کی شراب۔ دریا میں پانی آ چلا تھا اور گرد کا مطلق پتا نہ تھا۔

ہم اپنے پروفیسر دوست کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کا نوکر ہمارے لیے کھانا پکا رہا تھا، اور باورچی خانے سے اس کے گانے کی آواز آ رہی تھی، جیسے اس کی آنکھوں سے نہ پیاز چھیلنے سے پانی جا رہا ہو، نہ ہی وہ دھوئیں سے مچمچا رہی ہوں۔

ہم لوگ معاشرے کی بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ کیسے بنتے ہیں، کیسے بگڑتے ہیں، اور آج

Scanned with CamScanner

کل کیوں بگڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔ بننے کا عمل کب شروع ہو گا؟ کسی کو شروع ہوتا نظر بھی آ رہا ہے یا نہیں؟ یوں اپنی باتوں سے ہم نے ماحول پر سوگواری طاری کر لی تھی۔ یہ ایک طرح سے ہمارا ادب سیشن تھا؛ جہاں ملے، سائیں سلام کے بعد معاشرے کے دکھڑے لے کر بیٹھ گئے۔ ہرچند کسمساؤ، موضوع بدلنے کی کوشش کرو، دو منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوں گی اور پھر وہیں کے وہیں۔ جیسے پھسلن کی جگہ میں کوئی اٹھ اٹھ کر کھڑا ہو اور ہر بار کائی اسے واپس زمین پر گھسیٹ لے۔

لوگ فائن آرٹس، ادب، محبت، ایک دوسرے کی خدمت، جانوروں سے اُنسیت، کھیلوں میں دل چسپی، ہر چیز سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے اور اپنی اس لاتعلقی پر فخر کرتے تھے جو ان کے خیال میں غیردانشمند افراد پر انھیں فوقیت دیتی تھی۔ اگر عورتوں کا کوئی تذکرہ ممکن تھا تو وہ بھی کسان عورتوں یعنی ہاریانیوں کی محنت اور عصمت کے لوٹے جانے کے حوالے سے، جو اس وقت آس پاس پھیلے ہوئے کھیتوں میں روئی چُنتی نظر آ رہی تھیں۔ اور اگر عام مردوں کا ذکر ممکن تھا تو اُن جیسوں کا جنھیں ڈیوٹی پر چڑھنے کے لیے ٹائم کیپر سے اپنے کارڈ پر وقت کا ٹھپّا لگوانا پڑتا تھا، اُن کا نہیں جو اس زمرے میں نہیں آتے ہیں۔ جن مردوں کو موضوعِ گفتگو بنایا جا سکتا تھا، اُن جیسے اس وقت بھی اس بڑی سی ڈھلواں چھتوں والی بلڈنگ میں کہیں کام کر رہے تھے جو ببول کے درختوں کے پیچھے، میل سوا میل ہم سے پرے، آٹھ دس ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا: کیا یہ عورتیں جانتی ہیں کہ ہم یہاں پروفیسر کے کمرے میں بیٹھے ان کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں؟ اور سامنے اس دور کی بلڈنگ میں آٹھ گھنٹے کے لیے بند مزدوروں کو اس کی سنک ہے کہ ہم یہاں بیٹھے ان کے مسائل پر غور کر رہے ہیں؟

یہ بھی تو ممکن تھا وہ ہمیں ہی نہ جانتے ہوں کہ کون ہیں، کیوں ان کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں کیسے پتا چلا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، کیا چاہتی ہیں، کیسے زندہ ہیں، مرنے سے انھیں کون سی امید روک رہی ہے، اور امید ان کے پاس بچی بھی ہے یا نہیں؟ اس آخری چیز کی ہمیں بڑی فکر رہتی تھی کہ معاشرے نے جینے کی امّید تک ان سے چھین لی ہے۔

کھانے میں ابھی دیری تھی کہ باہر کے دروازے پر کھڑبڑ ہوئی۔ ہمارے پروفیسر دوست نے اُدھر ایسی نظروں سے دیکھا جیسے انھیں معلوم ہو وہاں کون ہو سکتا ہے، کون آیا ہو گا۔ بغیر معذرت کیے ہماری باتوں میں ان کی دل چسپی ختم ہو گئی، اور جس طرح کسی کے اچانک آ جانے پر ہوا کرتا ہے، بولنے والے کو خود ہی اکتا کر خاموش ہو جانا پڑا۔

باورچی خانے کے باہر دروازے پر نوکر کے بولنے کی آواز آئی۔ پھر وہ ایک ہاتھ میں پرنچی مرغی اور دوسرے میں بڑی سی چھری، جس کی نوک ہم دیکھ رہے تھے کب کی ٹوٹ چکی تھی، تھامے اس کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا جس میں ہم بیٹھے تھے۔ پہلے پروفیسر اور اس میں آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے ہم نے پروفیسر کو جاتے دیکھا۔

کمرے میں بےچین کرنے والی خاموشی چھا گئی اور سب اپنے اپنے ٹھالی کے کاموں میں لگ گئے۔ کسی نے سگریٹ سلگائی، کوئی ماچس کی ڈبیا سے کرسی کے ہتھے پر گت بجانے لگا، کوئی

اپنے جبڑے کو سونتنے لگا جو بول بول کر تھک گیا ہو گا، اور کسی نے جماہی لینے پر اکتفا کی۔ میں کتابوں والی کیبنٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا جس میں مجھے معلوم تھا میرے کام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ وقفہ کافی طویل تھا۔

اس کے بعد ہم نے پروفیسر کو امب کے بیٹے امیر بشک کے کندھے پر ہاتھ رکھے آتے دیکھا، جیسے دونوں میں باوجود عمر کے تفاوت کے بہت کچھ مشترک ہو۔

امیر بشک کو امیر بخش کہنے میں کوئی قباحت نہیں تھی، لیکن اس کا باپ تو پھر بھی ام کا ام ہی رہتا۔ اس لیے میں اسے امیر بشک ہی کہتا تھا، اور میری دیکھادیکھی چند اور ساتھی بھی۔ پروفیسر کو میرا اسے امیر بشک کہنا ناپسند تھا۔ ایک مرتبہ وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے تھے یہ نام مجھے کیسے پتا چلا، اور میرے بتانے پر ... کہ گوٹھ (۲) والے، چاہے وہ کسی گاؤں کے ہوں، اسے اسی نام سے پکارتے ہیں سو میرے اس نام کو لینے میں کیا حرج ہے؛ آخر کو وہ بھی کھیتوں کا بیٹا ہے، انھی دیہاتیوں میں سے ایک ... پروفیسر نے عارفانہ سرپرستی کے لہجے میں کہا:

"یہ بھی متوسط طبقے اور جاگیرداری سماج کا وہ وصف ہے کہ محنت کشوں کو بھاشما سمجھو اور ان کا نام بھی بگاڑ کر لو۔"

پھر خود کو سنبھالتے ہوئے انھوں نے کہا: "خیر، آپ پر یہ بات عائد نہیں ہوتی ہے۔"

مجھے لگا بات کو اتنے کھرے انداز میں کہہ دینے پر وہ خود ہی بوکھلا اٹھے ہیں، ورنہ میرے لیے یہ تخصیص برتنے کی کیا ضرورت تھی؟

کچھ دوستوں نے آگے بڑھ کر آنے والے سے ہاتھ ملائے، کچھ اس سے گلے ملے اور ان میں وہیں کھڑے کھڑے باتیں شروع ہو گئیں۔ پھر پروفیسر کو احساس ہوا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں، اور میری طرف بڑھتے ہوئے انھوں نے کہا: "انھیں جانتے ہو؟"

میں نے دونوں کو مطلش اور تعارف کو مختصر کرنے کے لیے کہا:

"مسٹر امیر بخش۔"

اس نے آگے بڑھ کر، بجائے ہاتھ سے ہاتھ ملانے کے، کراس کر کے دونوں ہاتھوں سے دونوں ہاتھ ملائے اور میرے ہاتھوں کو اتنی دیر تک زور زور سے ہلاتا رہا کہ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر میری ہاتھوں کی ہڈیوں میں درد ہونے لگا۔

وہ، باوجود ان لوگوں میں نیا نہ ہونے کے، مجھے کچھ کچھ بےجھک سا لگ رہا تھا۔ اس میں گرم جوشی نہیں تھی، جو اس وقت سوائے میرے ہم سب میں تھی۔ مجھ میں کچھ بھی نہیں تھا؛ سردمہری بھی نہیں۔ یہ لوگ اپنی باتوں میں لگ گئے جو کائی لگی ہوئی زمین پر ہو رہی تھیں؛ پھسل کر وہیں کی وہیں آ جاتی تھیں۔ دھوپ اچھی خاصی تھی۔ لوگ سمٹ کر اس کونے میں ہو گئے جدھر ٹھنڈا اندھیرا تھا۔ نسبتاً اندھیرا۔ میں نے بیٹ کی الماری سے ایک کتاب اٹھائی جس کا پُشت خوب صورت تھا، لیکن کتاب کا سرورق دیکھ کر اسے واپس رکھ دیا۔

سب دوست سگریٹ سے سگریٹ سلگا کر پی رہے تھے۔ امیر بشک صرف ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ نہیں تھا؛ نہ ہی بیڑی جس کا تذکرہ میں نے اکثر سنا تھا کہ

Scanned with CamScanner

گم شدگی کے ایّام میں وہ پینے لگا ہے۔ اس کے ہونٹوں میں وہ نیلی سیاہی بھی مجھے نظر نہیں آئی جو ہر وقت دھواں نگلتے رہنے والوں کے چہروں پہ کھیلنے لگتی ہے۔

ہمارے سامنے سے کچھ لڑکیاں گزریں۔ تھکی تھکی سی۔ ان کے کپڑے تیز رنگوں کے تھے پیلے، سرخ، ہرے۔ ان میں شیڈ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ کھیتوں سے اپنا کام پورا کر کے لوٹ رہی تھیں اور بچے بھی ان کے سنگ تھے۔ دھوپ ان کے لیے زیادہ ہو گئی تھی۔

ایک کتاب اٹھا کر میں اپنے دوستوں میں آن بیٹھا، حالاں‌کہ نہ میرا ارادہ کتاب پڑھنے کا تھا نہ ان کی باتیں سننے کا۔ میرے لیے تو سب کے سب کولھو کے بیل تھے اور کولھو کی اوکھلی میں بھی بجائے سرسوں اور تیل کے وہ اپنی ہی عقل کو جھونکے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے گھانی سے بھی انھیں سدا کی پرانی باتوں کی دھار بہہ کر آ رہی ہو گی۔

کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ باورچی خانے سے کھانا نکالے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پلیٹیں کھنک رہی تھیں۔ گلاس ٹرے میں لگائے جا رہے تھے اور ریفریجریٹر کھولا بند کیا جا رہا تھا۔ لیکن میرے لیے اگر کوئی سہانی آواز تھی تو چمچے کے پتیلوں کے کنارے پر جھاڑے جانے کی، اور اگر اس سے بھی زیادہ روح کو سہانے والی چیز تھی تو وہ تھی کھانے کی خوشبو جو ہوکر کے دروازہ کھولنے پر کمرے میں داخل ہوئی۔

"کھانا لگ گیا ہے صاحب۔" اس نے پروفیسر سے کہا۔

"اوہ۔" پروفیسر نے امبر بشک سے کہا۔

"میں گھر جاؤں گا۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"گھر تو جاؤ گے ہی۔" پروفیسر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کب تک بھاگے رہتے! مگر کھانا کھا کے جاؤ۔"

"گھر جا کے کھاؤں گا۔" امب کے بیٹے امبر بشک نے کہا۔

"گھر کا کھانا تو ابھی کچھ عرصے روز ہی کھاؤ گے ۔۔ اگلی گم شدگی تک۔ آج یہاں کا سہی۔" پروفیسر نے اسے کاندھا تھامے، ضد میں سوئے بچّے کی طرح کھانے کے کمرے کی طرف چلاتے ہوئے کہا۔

"تو سر؟" اس نے کہا۔

دوسرے ساتھی بھی اصرار کرنے لگے۔ انھی میں سے ایک ہونے کے لیے مجھے کہنا پڑا، "آئیے ساتھی۔"

اس نے ہمارے ساتھ مرے قدموں سے چلتے ہوئے کہا،

"اچھا، چلتا ہوں۔ لیکن کھانے کی شرط نہیں ہے۔"

"خیر، چلو تو۔" پروفیسر نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

میرے لیے وہ اس وقت دنیا کا اہم ترین آدمی تھا۔ لیکن میں ایسے نوجوانوں کو کبھی سمجھ نہیں پایا، وہ کیا چاہتے ہیں۔ کس کے لیے جان دینے کو تیار رہتے ہیں، کس وقت کیا ان کے دماغ میں ہوتا ہے، اور جو بات وہ کہتے ہیں وہ ان کی زبان سے انفرادی حیثیت میں ادا ہوتی ہے یا اس کے پیچھے کسی بڑے مفکّر کا دماغ بول رہا ہوتا ہے؟

بظاہر تو ایسے نوجوانوں سے کسی کو فیض نہیں پہنچ رہا ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کی ماں بیمار پڑی ہے اور گھر میں کوئی تیماردار نہیں! کسی کا باپ اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا مال (۵) کو گھاس چارا کرنے والا نہیں، نہ جنگل سے کاٹھی لانے والا، نہ پانی کی نالیوں کو ٹھیک کرنے والا۔

میں انھی سوچوں میں تھا کہ ہم جا کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔

امبر بشک کھویا کھویا سا تھا اور اس زومبی (zombie) کی طرح وہاں پہنچا تھا جسے مرنے کے بعد جادوٹونے سے جلا لیا گیا ہو۔

کھانا بس اتنا تھا کہ ہم سب کو جو پہلے سے وہاں موجود تھے، پورا پڑ جاتا۔ سب نے نئے مہمان سے شروع کرنے کے لیے کہا۔

پروفیسر سے اس کی طرف وہ سرونگ بول بڑھائی جس میں مرغی تھی۔

اس نے نہ میں سر ہلا دیا۔

سب نے کہا، "لو یار۔"

میں نے بھی کہا، "لیجیے۔"

وہ باوجود بھوکا دکھائی دینے کے، کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے جھجھک رہا تھا۔

اصرار کے بڑھ جانے پر اس نے کہا،

"لوں؟"

"ہاں ہاں، لو۔ بہت ہے۔" پروفیسر نے اس کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے کہا۔

اس نے چمچے کی طرف ہاتھ بڑھایا، پلیٹ ہاتھ میں لی، اور پھر دونوں کو واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا، "نہیں۔"

"کیوں؟"

"یوں ہی۔ آپ کھائیں۔"

"تم سب تو کھا ہی رہے ہیں۔ بھوکے نہیں رہ جائیں گے۔ تم لو تو سہی، کم نہیں پڑے گا۔" پروفیسر نے کہا۔

پھر انھوں نے جھوٹ سے کام لیتے ہوئے کہا، "تم سمجھ رہے ہو بن بلائے مہمان ہو۔ مگر مجھے پتا تھا تم آج آؤ گے۔"

"اچھا!" اس نے پتا نہیں کس لہجے میں کہا اور ہار مانتے ہوئے سرونگ بول سے آدھی مرغی اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لی۔

سب نے اس کی اس آزادی کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑی شائستگی سے تھوڑا مسالا اپنی پلیٹ میں نکالا اور روٹی کے چوتھائی ٹکڑے سے کھانے کی ابتدا کی۔

پروفیسر کی باتیں جاری تھیں۔ میری انگلیاں اور جبڑے چل تو رہے تھے لیکن مجھے لگ رہا تھا میرا منہ کھانے کا کھلا رہ گیا ہے۔

امب کا بیٹا امبر بشک دنیا سے بےپروا، روٹی کے بڑے بڑے نوالے اپنے منہ میں ٹھونسا رہا تھا۔ اس کی پلیٹ میں سے گوشت غائب ہو چکا تھا اور ہڈیوں کے وہ سرے بھی جنھیں چبایا جا

Scanned with CamScanner

سکتا تھا۔ اس نے اسی بےنیازی کے عالم میں بول سے باقی دو بڑے ٹکڑے اپنی پلیٹ میں رکھے اور روٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"بھوک کھل گئی ہے، روٹی کم پڑ جائے گی۔"

پروفیسر نے کہا: "نہیں نہیں، کم نہیں پڑے گی۔ تم کھاؤ۔" اور نوکر کو گرم روٹی لانے کے لیے آواز دی۔

ساتھیوں کے ہاتھ اور منھ سست پڑتے جا رہے تھے اور ان میں سے کچھ اب بغیر جھینپے اس کے منھ اور ہاتھوں کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان سے کوئی مختلف مخلوق ہو۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا اس کی علم کی پیاس کی بات کہتے ہوئے وہ ڈنڈی مار جاتے تھے؛ بھوک کا ذکر تو کبھی کیا ہی نہیں تھا۔

دوبارہ جب نوکر روٹی لیے ہوئے آیا تو پروفیسر کے جعنوی وِلد نے کہا: "ہم لوگ اسے ڈھکڑی یا پھلکا کہتے ہیں۔ آپ روٹی کہتے ہیں۔ خیر، کیا فرق پڑتا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے براہِ راست نوکر کی پلیٹ سے روٹی لے کر اس کے چار ٹکڑے کیے اور ایک کو شوربے کی سرونگ بول میں غوطہ دیتے ہوئے بولا:

"سائیں آپ نے کبھی ہمارا ڈھکڑ کھایا ہے؟ اس کی گرہ تہائی (٦) میں جو مزہ آتا ہے، وہ ان پھلکوں کے نوالے بنانے میں کہاں؟"

نوکر اپنی جگہ پر بت کی طرح کھڑا تھا اور اس کی نگاہ مہمان کے چہرے بلکہ منھ اور ہاتھوں پر لگتا تھا ساکت ہو گئی ہے۔

پروفیسر نے اسے بلاتے ہوئے کہا: "جاؤ، تم جا کر دیکھو، توے پر روٹی جل تو نہیں رہی ہے۔"

نوکر نے کھرکھری لی۔ پھر وہاں سے ٹلتے ہوئے اس نے کہا: "توا تو میں اتار کر آیا تھا۔ آٹا گوندھوں؟"

ایک ساتھی نے سگریٹ سلگائی اور پیکٹ کو پروفیسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "لو، تم بھی پیو۔"

پروفیسر نے، جو کچن کی طرف چل پڑے تھے، بےدھیانی سے کہا: "سلگاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

مجھے اس وقت وہ دو بوڑھے یاد آ رہے تھے جنھیں میں نے ایک ولیمے میں شرط باندھ کر کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور جن کی بات میں ہمیشہ دوسروں کو بتاتے ہوئے جھجکتا ہوں کیوں کہ سننے والے الٹا مجھی پر ہنسنے لگیں گے۔ یعنی تو دونوں بوڑھے عام براتیوں کے ساتھ تمیز سے بیٹھے کھاتے رہے تھے، پھر بغیر اعلان کے دونوں میں ٹھن گئی۔

قابوں پر قابیں آ رہی تھیں۔ مہمان اٹھے جا رہے تھے، اٹھتے جا رہے تھے۔ لیکن ان کے گلے وگے ہی میں نہیں آ رہے تھے۔ نہ کسی کی ڈکار سنائی دیتی تھی نہ کوئی دسترخوان سے انگلیاں پونچھنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا، جو شادیوں میں معمول ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ دونوں کے گلاس تک اسی طرح پانی سے بھرے صاف ستھرے رکھے تھے؛ نہ ان پر چکنائی سے

بھری ہوئی انگلیوں کے نشان تھے نہ ان کے پیندوں میں چاول تیرتے نظر آ رہے تھے۔

کھانا کھلانے والے پہلے تو کسی قدر بیزار ہوئے، پھر جیسے ان کی شرارت کی رگ پھڑک اٹھی اور انھوں نے نفاست اور سلیقے کو ایسے موقعے پر غیرضروری سمجھتے ہوئے اس پھرتی سے کھانا ان کے سامنے ڈھیر کرنا شروع کر دیا جیسے انجن میں کوئلہ جھونک رہے ہوں۔

تنور پر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے جن نانوں کو جلا ہوا سمجھ کر رد کر دیا ہو گا، وہ بھی تیزی سے لائی جانے لگیں اور دیگ کی تہ کے چاول اور کھرچن بھی۔ قورمے میں سے پہلے تو گوشت غائب ہوا، پھر اس میں دارچینی کے بڑے بڑے ٹکڑوں، ثابت تیزپات، لونگوں اور بڑی چھوٹی الائچیوں کی بھرمار ہو گئی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" پروفیسر نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے بغیر شرمائے جواب دیا: "ان بڈھوں کے بارے میں جن میں مقابلہ ہو گیا تھا دیکھیں کون زیادہ کھاتا ہے۔"

"پھر کون جیتا تھا؟" ایک ساتھی نے کہا۔

"آپ ان میں سے کسی کو جانتے ہیں؟" میں نے طنزیہ کہا۔

"نہیں۔"

"پھر اس سوال کا فائدہ؟"

سب ہنس پڑے۔

امب کے بیٹے امیر بشک نے راتنے کے ڈونگے کو چہرے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے بھرے ہوئے منھ سے کہا:

"میں جیتا تھا۔"

پھر اس نے گرج کر کہا:

"روٹی؟"

مجھے اس وقت وہاں اس کی جگہ وہ شیر نظر آیا جو سورج ڈوبنے سے پہلے اپنی کچھار کے باہر ٹہلنے لگتا تھا اور وقفے وقفے سے دہاڑتا تھا: "شکار! ... شکار!"

"یہ تھا تمھارا معاہدہ مجھ سے، کہ میں تو اپنے عہد پر قائم ہوں، تمھاری گھات میں گھر سے باہر قدم نہیں نکالا، بھوک سہہ رہا ہوں، اور تم میرے خالی پیٹ کو بھولے اپنے گھروں میں چین سے بیٹھے ہو؟"

میں نے اس کے دڑوک کے "روٹی؟" پکارنے کی آواز سے ڈر کر میز سے اپنی کرسی کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

"کیا یہ اب ہمیں کھائے گا؟"

پروفیسر نے اپنے بچےکھچے عالمانہ انداز میں کہا:

"آپ نے محنت کشوں کی بھوک دیکھی نہیں ہے۔ ہماری بھوک جھوٹی بھوک ہوتی ہے، پیٹ بھروں کی بھوک..."

"اور یہ ہے صدیوں پرانی بھوک۔" میں نے انھی کے لہجے میں کہا۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" پروفیسر نے کھانے کے کمرے سے کچن اور کچن سے کھانے کے

Scanned with CamScanner

کمرے میں باربار آتے جاتے نوکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

امیر بشک کی گھنٹےبھر پہلے کی سُستی دور ہو چکی تھی۔ اس نے پہلی بار انگلش میں نوکر سے کہا، "کم اون، رن؟" نوکر کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

پروفیسر نے بڑبڑا کر کہا، "اپنے کسی ساتھی کو ہاتھ بٹانے کے لیے بلا لو۔"

"ہاتھ بٹانے کے لیے نہیں۔ مانی بچانے (۷) کے لیے۔ رن، یو فول، رن؟"

نوکر واقعی میں اب بجائے چلنے کے دوڑنے لگا تھا۔ آہستہ روی اور تعجب تو اس کا ساتھ کب کا چھوڑ چکے تھے۔ وہ اس وقت اس بیل کی طرح لگ رہا تھا جسے باریو (۸) تقریباً کھیت میں ہل لیے لیے دوڑا رہا ہو۔ تھوڑی دیر میں بیلوں کی جوڑی بن گئی جو کبھی ایک ساتھ، کبھی علیحدہ علیحدہ دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ اور کبھی بھاگتے میں ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جاتے تھے۔

جب ان میں سے ایک نے چوکھٹ پر ٹھوکر کھائی اور روٹی کی تھالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور گری تو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے امیر بشک نے اسے قہربھری نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ روٹیوں پر سے مٹی جھاڑتا ہوا اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

پروفیسر نے ایک ساتھی کے کھلتے ہوئے منھ کو بند کرنے کے لیے کہا، "آج کے دن کھانا کھلانے کا ہمارا معاہدہ ہے۔"

میں نے کہا "یہ معاہدہ ہو چکا پورا؟ مجھے تو لگ رہا ہے آپ نے آج روزِ میثاق کو دعوت دے دی ہے۔"

اسی لمحے وہ تانتا جو کچن سے کھانے کے کمرے تک بندھا ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ مہمان غرّایا۔

پروفیسر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا، "میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

میز پر پڑے ہوئے روٹیوں کے بھورے، گرے ہوئے چاول، چبائی ہوئی ہڈیاں، مچھلی کے کانٹے آہستہ آہستہ کر کے خودبخود اُڑ کر اس کے منھ میں جانے لگے۔ ایسا لگتا تھا ہر لقمے پر اس کی بھوک کھلتی جا رہی ہے۔ پہلے اگر منھ کھلنے پر آمادہ ہی نہیں تھا، تو اب ایک بار چل پڑنے پر اس میں مومینٹم بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ایک ساتھی اس کے سامنے سے اٹھ کر کھلی ہوئی کھڑکی کے داسے پر جا بیٹھا۔ پھر باہر کود کر اس نے کھڑکی کے پٹ بند کر لیے اور شیشے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

جب ایک اور ساتھی نے سگریٹ نکالنے کے لیے پیکٹ کھولا تو ایک ایک کر کے سگریٹ اس میں سے اُڑ کر امیر بشک کے منھ میں چلے گئے، اور ان کے پیچھے پیچھے ان کا کرَش پروف پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا بھی۔ وہ ساتھی ہکلاتا ہوا بولا، "میں جا کر دیکھتا ہوں کھانے میں کیا دیر ہو رہی ہے۔"

"سال کا کون سا موسم ہے؟" مہمان نے میری طرف دیکھتے ہوئے بھاری آواز میں پوچھا۔

پروفیسر اپنی کرسی پر ڈھول کی طرح بیٹھ گئے اور بولے، "مجھے تمھارے سوال کا جواب معلوم ہے۔ ان سے کیا پوچھتے ہو۔ انھیں کیا پتا ہو گا؟"

میں نے آہستہ آہستہ سر کو پہلو سے پہلو تک ہلاتے ہوئے اپنی ناواقفیت کا اظہار امیر بشک سے کیا اور سرگوشی میں پروفیسر سے کہا، "جی ہاں آپ فرمائیے، میں کون سا کھیتوں کا

بیٹا ہوں۔"

پروفیسر نے میری آواز کو چھپا لینے کی کوشش میں امیر بشک سے کہا،

"ربیع کا۔ ہیں؟ یا خریف کا؟"

مہمان کے چہرے پر خفگی کے آثار آ چلے تھے، لیکن اسی لمحے کچن سے میز تک کا جو تانتا رک گیا تھا پھر سے چل پڑا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر پروفیسر سے کہا، "خیر ہو گئی۔ آئندہ ایسی دعوت مت کیجیے گا۔"

"نہیں،" پروفیسر نے خوف بھری سنجیدگی سے کہا۔

اب اس دوڑ میں اور بھی بہت سے شامل ہو گئے تھے۔ سندھی گلے اور بلوچی گریبان کی قمیصیں پہنی عورتیں، ایسی عورتیں جن کے ہاتھ کلائیوں سے لے کر بازوؤں تک سفید سینگ کے کڑوں میں بند تھے، اور مختصر سہی لیکن تیز رنگوں والی چولیاں اور اتنے ہی تیز رنگوں والے لہنگے پہنی سانولی کمزور عورتیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے کھڑکی کے باہر بیل گاڑیوں کو آ کر رکتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے اناج کی بوریاں اتاری جا رہی تھیں۔ کچھ لمبی تڑنگی سیاہ رنگ کی عورتیں، جن کی بانہوں پر دھات کے کڑے چڑھے ہوئے تھے اور چہروں پر گدنے سے گل کاری کی گئی تھی، وہیں بیل گاڑیوں کے پاس چکی، چھاج اور اوکھلیاں لے کر بیٹھ گئیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور موگری کے دھماکوں میں سے ایک ہی لوک گیت اٹھ رہا تھا،

"بھوک کھل گئی ہے، بھوک کھل گئی ہے، بھوک کھل گئی ہے…"

عورتیں اسی تال پر اپنے گیت گانے لگیں، اور کبھی کبھی ایک ہاتھ کو آزاد کر کے وہ اپنے کپڑے میں سے مرنڈے یا بھگڑے (۹) نکال کر ان کا ایک پھنکا بھی لگا لیتی تھیں۔

میں نے پروفیسر کے کان میں کہا، "اس بھوک کو سوتے ہی رہنے دیتے تو بہتر نہ ہوتا؟"

لیکن پروفیسر نے میرے کہے کو ان سنا کر دیا۔

امب کے بیٹے امیر بشک نے کھڑکی میں سے ان عورتوں کو اطمینان بھری نظروں سے دیکھا، اس کا منھ ابھی تک چل رہا تھا، اور دونوں ہاتھ بھی جن سے وہ آلکسی کے ساتھ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر رہا تھا اور انھیں اس طرح جماتا جا رہا تھا جیسے تلاویری کاغذ کو پرزے پرزے کر رہا ہو۔

مطبخ اب باہر لان میں لگ دیا گیا تھا اور نئی ایک عورتیں اور مرد وہاں کھڑے ہانڈیوں میں ڈوئیاں چلا رہے تھے اور کچھ زمین پر بیٹھ کر آگ پھونک رہے تھے جو جگہ جگہ جلا دی گئی تھی اور جب اس کا دھواں درختوں میں چھن کر اوپر اٹھنے لگا تو صاف آسمان میں وہ دودھ جیسے بادلوں کے بہتے ہوئے ستون مجھے بڑے بھلے لگے۔

میں اپنا خوف بھول گیا تھا اور مہمان کے چہرے کو بھی اب بغیر خود کو ٹینس (tense) کیے دیکھ سکتا تھا۔ یہی حال دوسرے ساتھیوں کا تھا۔

لیکن ایک بار جب ہم میں سے کسی نے دوبارہ کھسک کر میز کے نزدیک ہونا چاہا تو امب کا بیٹا امیر بشک غرّایا، جیسے وہ رول کو بدل دینا چاہتا ہو۔ پہلے اسے دوسروں کو کھاتے ہوئے

Scanned with CamScanner

دیکھنا پڑتا ہو گا۔ آج وہ چاہتا تھا دوسرے اسے کھاتے ہوئے دیکھیں۔

ہمارے ساتھی نے تیزی سے کرسی واپس کھسکائی اور پھر ادھر اُدھر دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے پروفیسر سے کہا: "آپ اپنی قسمت آزما دیکھیے۔ آپ تو میزبان ہیں۔"

پروفیسر نے کہا: "آپ بولے جائیے۔"

میں نے کہا: "کیا بولوں؟ مجھے تو لگتا ہے اپنے دل میں آپ کہہ رہے ہیں اس نے مجھے بھی نکال باہر کیا۔"

"ہنہ" کر کے پروفیسر نے منھ دوسری طرف پھیر لیا۔

شام ہونے لگی تھی۔ کمرے کے دروازے پر باری باری سے کچھ تماش بیں آئے: اسکولوں کے لڑکے لڑکیاں، باری ناری (۱۰)، مسافر، ایک لونالالا امام مسجد، جسے میں جانتا ہوں اتنا گیاگزرا ہے کہ اس کی مسجد میں جمعے کی نماز نہیں ہوتی اور خود اسے شاید دو کوس پَندھ پرے (۱۱) قصبے کی جامع مسجد جانا پڑتا ہے۔ خود ہی وہ اپنی مسجد کا جاروب کش ہے، خود ہی موذّن، خود ہی امام، اور کبھی کبھی خود ہی اپنا مقتدی ہو جاتا ہے۔ امبُ کے بیٹے امیر بشک نے اس کی طرف ترحّم سے دیکھا اور ان عورتوں کی طرف ہاتھ اٹھا دیا جو توے پر ڈھکڑ لگا رہی تھیں اور جن کی پیٹھوں پر کبھی کبھی کھیل میں لگے ہوئے بچے بھی سوار ہو جاتے تھے، جس طرح روٹی پکاتی ہوئی عورتوں کی پیٹھ پر سوار ہو کر بچے کہتے ہیں:

"اماں، موتے مانی ڈے۔" (۱۲)

چولھوں سے ہٹ کر ایک بوڑھا کھڑا کلّی کر رہا تھا۔ پھر وہ وہیں بیٹھ کر وضو بنانے لگا۔

جب لان میں سورج ڈوبنے کے فوراً بعد ایکاایکی خاموشی ہو گئی تھی، ایک کار آ کر پروفیسر کے بنگلے کے مین گیٹ پر رکی۔ اس وقت کمرے میں صرف ہم دو جنے رہ گئے تھے، پروفیسر اور میں۔ نہیں، تیسرا ہمارا مہمان۔ پروفیسر نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"یہ اس وقت کہاں؟"

"شاید تماشا دیکھنے آئے ہیں۔" میں نے سرگوشی میں کہا، "آپ نے آج سرکس جو لگا رکھا ہے۔ دیکھیے ابھی اور کون کون آتا ہے۔"

جو آدمی کار سے اترا اس کی آبنوسی داڑھی مونچھیں تھیں اور خود اس کا رنگ ہاتھی دانت جیسا تھا۔ وہ تحت پشت ہو کر چل رہا تھا اور لوگ قدم بوسی کو اس کی راہ میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے جاتے تھے۔ قریب آنے پر مجھے اندازہ ہوا وہ اتنا کم عمر نہیں تھا جتنا دور سے نظر آیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی چال اور بالوں سے میں دھوکا کھا گیا تھا۔

کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر سرمہ لگی ہوئی آنکھوں سے پہلے اس نے وہاں بکھری ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا اور پھر تُرشی سے بولا:

"کدھر گیا اس کا باپ؟"

اس کی طویل دامن والی قمیص اور ان گنت چُنٹوں والی شلوار کے نیچے سے آواز آئی:

"جی، مہنجا سائیں۔" (۱۳)

اس نے نیچے دیکھنا چاہا، لیکن امبُ اس کے بڑے پیٹ، قمیص کے دامن اور شلوار کے گھیر کے نیچے کہیں چھپا ہوا اس کے پیر کو چوم رہا تھا۔

آنے والے نے جھٹکا دے کر اپنے پیروں کو ان ہاتھوں سے چھڑایا جو ان سے لپٹے ہوئے تھے، اور امیر بشک کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"کب آیا تو؟"

امیر بشک نے میز پر نظر ڈالی جہاں رسد کچھ دیر سے رکی ہوئی تھی، اور غرّا کر وہی چار لفظ ہوا میں کہے جو دوپہر سے ہم اس کے منھ سے سن رہے تھے۔

اوکھلی میں موگریاں انھی چار لفظوں کی تھاپ پر پھر سے چلنے لگیں، اور چکّیوں کی پتھر سے پتھر کے رگڑ کھانے کی کھس کھُوں، کھس کھُوں۔ کھس کھُوں اور عورتوں کے پیڑے بڑھانے اور روٹیاں تھاپنے کی آوازوں نے بھی اس دُھن کو اٹھا لیا...

"بھوک - کھل - کٹی - ہے، بھوک - کھل - کٹی - ہے، بھوک - کھل - کٹی - ہے..."

چیزیں اِدھر اُدھر سے اڑ اڑ کر دوبارہ امیر بشک کے منھ میں جانے لگیں: پروفیسر کی ایش ٹرے، گلدان میں سے پھول، گلدان، موسیقی کے کیسٹ، ۳۵ ملی میٹر کیمرا، قلم، قلمدان، کاغذ... اور کتابیں۔ اس آخری چیز کے جانے پر پروفیسر نے چلّا کر کہا:

"ارے مار ڈالا؟"

پھر بڑے پیٹ والا آدمی اس کی طرف اپنی مرضی کے خلاف کھسکنے لگا۔ اس کی داڑھی، سر کے بال، قمیص کا لمبا دامن اور شلوار کا بےاندازہ گھوم امیر بشک کے منھ کی طرف اس طرح اڑ رہے تھے جیسے ایک بہت بڑا ویکیوم کلینر وہاں چھپا انھیں کھینچ رہا ہو۔ امبُ اور امبُ جیسے کئی اور لنُوس بوڑھے اگر اس کی ٹانگوں سے چپٹے ہوئے نہ ہوتے تو کب کے اس منھ میں غائب ہو چکے ہوتے۔

آبنوسی داڑھی مونچھوں اور ہاتھی دانت کی سی رنگت والے نے پروفیسر سے گھبراہٹ کے عالم میں، مگر پھر بھی تحکّمانہ انداز سے کہا:

"روکو اسے۔"

امیر بشک نے میز کو ڈھکڑوں کی لیے مٹھیوں سے پیٹنا شروع کر دیا اور بولا:

"کیوں روکو؟ پروفیسر تمھارا مرید ہے، ہاری ہے یا رعیت، جو تمھارا حکم مانے؟ یہ اس کا گھر ہے اور میں اس کا مہمان۔"

پھر اس نے پروفیسر کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا:

"سائیں، خود آپ نے یہ سرکس شروع کیا تھا۔ میں اس سرکس کا ہاتھی ہوں، شیر ہوں، سفید گھوڑا ہوں۔ میں ہی اس کی ٹریپیز (trapeze) ہوں اور اس ٹریپیز پر چڑھ کر خود ہی ہوا میں غوطہ مارتا ہوں۔ اور میں ہی یہاں کا مسخرہ ہوں۔ ابھی میں آپ سب کو تلواریں، کلھاڑیاں اور رائفلیں نکل کر دکھاتا ہوں۔"

ادھیڑ عمر والے، ٹھوس بنے ہوئے آدمی نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا:

"بند کرو اسے۔"

Scanned with CamScanner

"ابھی نہیں۔ وہ آخری کرتب ہے، اور اس سے پہلے مجھے تمھیں نکلنا ہے۔" امیر بشک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

پھر وہ گرج کر پکارا، "روٹی؟"

اس کے ساتھ ہی ایسے مجسّمے کی طرح جسے کمند ڈال کر گھسیٹا جا رہا ہو، آبنوسی داڑھی مونچھوں اور ہاتھی دانت کا آدمی اس کی طرف سرکنے لگا۔ مجسّمے کے پیروں میں بندھے ہوئے بوڑھے اور عورتیں بھی اُدھر ہی کو کھنچ رہے تھے۔

مجسّمے کو جو سلک کی قمیص پہنائی گئی تھی اس کی بغلیں بھی پسینے میں ڈوبنے لگیں جسے اس نے چھو کر تعجّب سے اپنی انگلیوں کو دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی ملائم سویڈ کی واسکٹ کو پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے سے رنگین قیمتی ٹوپی کو۔

پروفیسر کی بھی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ انھوں نے چیخ کر کہا، "اسٹاپ اِٹ امیر بخش؟"

لیکن مجھے لگ رہا تھا وہ خود اب امیر بشک کے منھ کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اسی عالمِ برزخ میں انھوں نے مجھ سے کہا،

"اس کا صحیح نام واقعی میں امیر بشک ہے، امیر بخش نہیں۔"

یہ کہہ دینے پر ان کے چہرے کا تشنّج مٹ گیا۔

پھر دیوار پر خوب صورتی کے لیے ٹانگی ہوئی سندھی کلھاڑی کو انھوں نے لپک کر کسی طور اپنے قابو میں کیا، اور بجائے خود کو کھنچے جانے سے روکنے کے، روٹی کا انتظار کرنے والے پر جھپٹے۔

اگلے لمحے میں نے دیکھا وہ کلھاڑی کے پھل کو جھٹکا دے کر امب کے بیٹے امیر بشک کے گوشت میں سے کھینچ رہے ہیں۔ لیکن لوہا شاید ہڈی تک اتر گیا تھا اور اپنے کُشتے کو چھوڑنے کے لیے تیّار نہیں تھا۔

میں نے سارا سین غسل خانے میں سے چھپے چھپے دیکھا۔

امیر بشک زمین پر پڑا ہنس رہا تھا اور ایسا کرتے میں دم بھی توڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا جسم جو دھوپ میں پڑی ہوئی جانور کی لاش کی طرح پُھولا ہوا تھا، اب پچک پچکا کر کوّوں، گِدھوں اور کتّوں سے نُچا ہوا ڈھانچا رہ گیا تھا۔

پروفیسر ہاتھی دانت کی سی رنگت والے کو چھوڑنے کار تک گئے اور شاید اس سے معذرت چاہ رہے تھے۔

باہر بیل گاڑیوں پر چکّی، اوکھلیاں، مُوسل، چھاج اور توے لادے جا چکے تھے اور کسانوں نے اپنی چلمیں ان کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے سلگا لی تھیں۔

مجھے نہیں معلوم اس کے بعد کیا ہوا۔ نہ یہ خبر کہیں چھپی، نہ اُس دن سے پروفیسر اور ان کے ساتھی مجھے کہیں نظر آئے ہیں۔

---

(۱) امب بمعنی آم۔

(۲) "کھیتی باڑی کر، ڈھور چرا، بیلوں بکریوں کی گھاس سانی کر، چارا کاٹنے کی مشین چلا۔"
(۳) پھٹی : کپاس
(۴) گوٹھ : گاؤں
(۵) مال : مویشی
(۶) گرہ ٹھائی : تولاد بنانا
(۷) مانی پچانا : روٹی پکانا
(۸) ہاریو : کسان
(۹) ٹھکڑے : پھاڑ کی ٹھنی چنی
(۱۰) ہاری ناری : کسان
(۱۱) پندھ پرے : پیدل کا فاصلہ
(۱۲) "اماں مجھے روٹی دو۔"
(۱۳) "جی میرے مالک؟"

بہ شکریہ "شعروحکمت" حیدرآباد دکن

Scanned with CamScanner

مسعود اشعر

نامحرم

۱

دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک اس وقت ہوئی جب وہ اپنے فلیٹ ہی میں تھا۔ وہ اپنے فلیٹ میں اس وقت ہوتا جب بہت مجبوری ہوتی، جب اسے کہیں جانا نہ ہوتا۔ وہ صبح دفتر میں اور شام ہوٹل میں گزارتا، کہ تمام دوست احباب ہوٹل میں ہی آجاتے تھے۔ اسے دوسرے ایسے شوق نہیں تھے کہ ان کے لیے اسے اپنے کمرے میں رہنا پڑتا۔ اس کی وجہ وہ اپنےآپ کو یہ بتایا کرتا تھا کہ اپنے محلّے میں انسان کو شریف بن کر رہنا چاہیے، کہ سانپ ہر جگہ لہرا لہرا کر چلتا ہے لیکن اپنے بل میں ہمیشہ سیدھا گھُستا ہے۔ البتہ اس کے دوست اسے کوئی اور ہی معنی پہناتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ شوق پالنے کے لیے ہمت اور حوصلہ چاہیے جو بازار میں نہیں ملتا۔

"دراصل یہ عصمت ہی بی از بےچارگی والی بات ہے۔" ایک منہ پھٹ نے ایک دن کہہ بھی دیا تھا۔

"تو گویا یہ میر صاحب ہیں؟" ایک اور نے اپنا علم بگھارا تھا۔

"میر صاحب؟" کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

"ہاں میر صاحب۔" اس شخص نے وضاحت کی تھی۔ "ہمارے گھر ایک صاحب کام کرتے تھے۔ ہم انھیں میر صاحب کہتے تھے۔ اچھی خاصی عمر کے آدمی تھے، لمبے چوڑے، پٹّے کٹّے۔ لیکن چہرے پر داڑھی مونچھ نہیں تھی۔ ہم انھیں چھیڑتے تو نہیں تھے لیکن ہماری باتوں سے انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمیں ان کی مردانگی پر شبہ ہے، اور ہو سکتا ہے کہ باہر گلی محلے کے بچے انھیں چھیڑتے بھی ہوں۔ شاید اسی لیے ایک دن بڑی رازداری کے ساتھ کہنے لگے، خاں صاحب، بس میری داڑھی مونچھ نہیں ہے، ویسے اللہ کا فضل ہے۔ اس کے بعد ہمارا شبہ اور بڑھ گیا تھا۔"

اس پر سب نے قہقہہ لگایا تھا اور اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ کسی اور کی طرف سے کوئی فقرہ آتا، اس نے خود ہی کہہ دیا تھا "ہاں، یہاں بھی اللہ کا فضل ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ کون ہو سکتا ہے؟ وہ جھنجھلا گیا۔ وہ ہوٹل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے بیزاری کے ساتھ دروازہ کھولا۔ وہ کھڑی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ یہ یہاں کیسے آ گئی؟ یہ اور اس کے دروازے پر؟

"آئیے آئیے... آپ نے تو حیران کر دیا..." وہ اور کیا کہتا؟ وہ پیچھے ہٹا، اسے اندر آنے کا راستا دیا۔ وہ اندر آئی۔ نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ وہ اور بھی گھبرا گیا۔ پتا نہیں کیا فقرہ چست کر دے۔ فلیٹ کا یہ کمرہ جو لونگ روم یا ڈرائنگ روم تھا اس کی اپنی طرح بےترتیب اور اُلٹ پلٹ تھا۔

وہ رکی اور ایک صوفے کی طرف بڑھی۔ شاید بیٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس صوفے پر کتابیں اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔

"سدا تھا بیچلرز کا کمرہ بہت صاف ستھرا ہوتا ہے۔" وہ اپنے لیے جگہ بنانے لگی، لیکن اس نے خود ہی آگے بڑھ کر وہ سب کچھ وہاں سے ہٹا دیا۔ وہ بیٹھ گئی اور رسالے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ بھی ایک کرسی پر ٹک گیا تھا اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی خاموشی سے اسے اکسا رہا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ کچھ بتائے کہ وہ کیوں آئی ہے۔ اسے کیا کام ہے اس سے؟ کسی وجہ کے بغیر تو وہ آ نہیں سکتی۔ لیکن اسے کیا کام ہو سکتا ہے اس سے؟

وہ خاموشی سے رسالے اور کتابیں کھنگال رہی تھی، جیسے اسی کام سے وہاں آئی ہو۔

"دراصل وہ لڑکا جو یہاں کام کرتا ہے، اس وقت چلا جاتا ہے۔" اس نے محض کچھ کہنے کے لیے کہا۔ آخر کسی کو تو کچھ بولنا چاہیے۔ اس طرح خاموش رہنا تو نہایت بدتمیزی ہے۔ اور اس کا گھر تھا، اس کا فرض تھا کہ وہ بات کرے۔

"تو پھر چائے نہیں مل سکتی؟" اس لمحے وہ بھی چائے کا پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ پہل کر گئی۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں مل سکتی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باورچی خانے میں گھس گیا۔

"آپ کو تو چائے بنانا بھی نہیں آتی ہو گی۔ لائیے میں بنائے دیتی ہوں۔" وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گئی تھی اور اس کے ہاتھ سے سارا سامان لے لیا تھا۔

وہ اسی اشتہاری ادارے میں کام کرتی تھی جہاں وہ ملازم تھا۔ اس لڑکی نے، یا اس خاتون نے -- اب یہ بھی بڑا مسئلہ ہے کہ اس قسم کی عورتوں کو کیا کہا جائے۔ چونکہ شادی نہیں ہوئی اس لیے لڑکی ہے، لیکن عمر تیس کے قریب ہے اس لیے خاتون ہے۔ ہم اپنا دل خوش کرنے کے لیے اسے لڑکی کہہ دیتے تھے -- اس لڑکی نے اپنے کھلے ڈلے پن، اپنے بےدھڑک انداز اور مردوں سے زیادہ بےتکلف زبان کی وجہ سے ہر شخص کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ لوگوں کی یہ گرویدگی بھی عجب تھی۔ ہر شخص اس کی طرف کھنچتا بھی تھا اور اسے مرابھلا بھی کہتا تھا۔ اس کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ذرا سی بھی بےتکلفی کر لے یا اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دے۔ لیکن اس کے پیچھے سب اسے خدا جانے کن کن ناموں سے پکارتے تھے۔ وہ بھی اس کی بےباکی سے ڈرتا تھا، لیکن اس کے قریب جانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ البتہ

Scanned with CamScanner

ایک بات اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس کے بہت ہی پیارے دوست کی بہت ہی گہری دوست ہے۔ وہ دونوں فلم میکنگ سیکشن میں تھے اور ایک ہی کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔ لوگ ان دونوں کے بارے میں بہت سی باتیں بنایا کرتے تھے جو شاید سچ بھی تھیں۔

ایک بار اس کی ساتھ اس کی لڑائی بھی ہو چکی تھی۔ لیکن یہ شروع کی بات ہے جب وہ نیا نیا اس دفتر میں آیا تھا۔ خداجانے کیا بات ہو رہی تھی کہ اس لڑکی کی بےدھڑک حرکتوں کا ذکر آ گیا، جیسا کہ اکثر آ جایا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے نکل گیا، "عورتوں میں مردانہ پن اور مردوں میں زنانہ پن اچھا لگتا ہے مگر تھوڑا تھوڑا۔"

اسے علم نہیں تھا کہ وہ بھی کمرے میں آ چکی ہے اور اس کے پیچھے کھڑی ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ "اچھا!" کہہ کر اس کے سامنے آ گئی۔ "ذرا آپ کی شکل تو دیکھوں۔" یہ کہہ کر وہ اس کے اوپر جھکی تھی اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لا کر ناک سے سُوں سُوں کیا تھا۔ "اماں سے کہنا منہ دُھلا دیں۔ ابھی تک دودھ کی بساند آ رہی ہے۔" پھر وہ سیدھی کھڑی ہوئی تھی اور دوسروں کو مخاطب کر کے کہا تھا، "ان سے کہو اپنی عمر سے بڑی باتیں نہ کیا کریں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی تھی اور وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔

"یار، عورت ہے، اس سے کیا لڑنا؟" اس نے شرمندگی مٹانے کے لیے کہا تھا، اور سب ہنس پڑے تھے۔

اس نے چائے بنا لی تھی اور وہ دونوں اپنے اپنے کپ اٹھا کر لے آئے تھے۔

وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی اور اس کے دل میں بول اٹھ رہا تھا۔ یہ بولتی کیوں نہیں؟ کیوں آئی ہے میرے پاس؟ کیا میں اس سے پوچھ لوں؟ مگر کیسے پوچھوں؟

یک لخت اس کے چہرے سے ظاہر ہوا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہے، جیسے وہ بات کرنا چاہتی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ بات کس طرح شروع کرے۔ تو کیا وہ اس کی مدد کرے؟ لیکن کیسے؟

"آپ کے دوست نے بہت تنگ کیا ہے؟" آخر وہ بولی۔ اب وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"میرے دوست نے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ آپ کا دوست نہیں ہے؟" اس نے دوست کا نام لیا۔

"ہاں ہاں، وہ میرا دوست ہے۔ لیکن آپ کو اس نے کیسے تنگ کیا؟ ... آپ دونوں کی تو..."

"ہاں، ہم دونوں کی بہت دوستی ہے، اور ہم شادی بھی کرنا چاہتے ہیں..."

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" اس نے بات کاٹی۔

"خوشی کی بات تو ہے، مگر وہ گڑبڑ کر رہا ہے۔" اس لڑکی نے جلدی سے کہا کہ کہیں وہ پھر بات نہ کاٹ دے۔ "وہ کہتا ہے ابھی وہ شادی نہیں کرے گا۔"

"تو پھر؟" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"میرے ماں باپ کینیڈا جا رہے ہیں، وہاں سیٹل ہونے۔ اگلے مہینے وہ چلے جائیں گے۔ سارے کاغذات مکمل ہو چکے ہیں۔ میرے بھائی نے انہیں اسپانسر کیا ہے۔" وہ خاموش ہو گئی، اور اس کی سمجھ میں اب بھی نہیں آیا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔

"آپ ان کے ساتھ نہیں جا رہی ہیں؟" سوال کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ بےتکا سوال ہو گیا ہے۔

"کیا بات کر رہے ہیں آپ؟ میں شادی کی بات کر رہی ہوں اور آپ کینیڈا جانے کی کہہ رہے ہیں۔" وہ غصّے میں بولی۔ "اس سے کہہ رہی ہوں کہ اسی مہینے شادی کر لے۔ میرے ابو بھی یہی چاہتے ہیں۔"

"مگر وہ تو جرمنی جا رہا ہے۔" اس نے اس لڑکی کو یاد دلایا۔

"یہی تو میں آپ سے کہنے آئی ہوں کہ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ جرمنی جانے سے پہلے شادی کر لے۔"

"وہ چھ مہینے کے لیے جا رہا ہے۔" یہ بات اس نے جیسے اپنے آپ سے کہی تھی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" اس نے غصے میں کہا۔ "لیکن زیادہ دیر بھی لگ سکتے ہیں۔"

"جی، زیادہ دیر بھی لگ سکتے ہیں۔ اس کا کچھ اور کرنے کا ارادہ بھی ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ شادی کے بعد چلا جائے، ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ میرے ماں باپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ میرا ویزا بھی ہو چکا ہے۔"

"اچھا؟ تو آپ اتنی سیریس ہیں اس کے لیے؟" یہ بات شاید اس نے اپنی طرف سے مذاق میں کی تھی، لیکن وہ سچ مچ بُرا مان گئی تھی۔

"ہاں میں اتنی ہی سیریس ہوں، سمجھے آپ؟"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ ڈر گیا تھا۔ "وہ بھلا میری بات کیوں مانے گا؟"

"وہ صرف آپ کی ہی بات مانے گا۔ آپ اسے سمجھائیے، شادی کے بعد آرام سے وہ چلا جائے۔ میرے ماں باپ کی خوشی بھی ہو جائے گی اور میں بھی یہاں رہ جاؤں گی۔"

"اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔" اس نے بےیقینی کے ساتھ کہا۔ لیکن اس لڑکی کو یقین آ گیا، اور اس نے سوچا کہ اس عمر اور اس زمانے میں بھی لوگ اتنے سیریس ہو سکتے ہیں کسی کے لیے؟ اور پھر یہ لڑکی؟

اس شام وہ ہوٹل نہیں گیا۔ اپنے دوست کے گھر گیا۔ اسے سمجھانے کہ اتنی اچھی لڑکی کیوں چھوڑتا ہے۔

اس کے دوست نے اس کی بات نہیں مانی، لیکن بڑے زوروشور سے اعلان کیا کہ شادی کرے گا تو اسی کے ساتھ، ورنہ شادی ہی نہیں کرے گا۔

"تو پھر کر لو شادی۔"

"یار، یہ بھی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہے؟ میں اپنے جانے کی تیاری میں لگا ہوں، اور پھر میری بہن انگلینڈ میں ہیں۔ وہ بھی اتنی جلدی نہیں آ سکتیں۔ وہ تو تماشا سمجھتی ہے شادی کو۔"

Scanned with CamScanner

"لیکن اس کے ماں باپ کینیڈا جا رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ میں نے سوچ رکھا ہے کہ جرمنی سے واپس آ کر شادی کریں گے۔ پھر کینیڈا بھی ہو آئیں گے۔"

"یعنی تمہاری بہن کا تو شادی میں شرکت کرنا ضروری ہے اور اس کے ماں باپ کی شرکت ضروری نہیں ہے؟" اسے غصّہ آ گیا۔ "کیا بک رہے ہو۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ سب کچھ جلدی میں ہو رہا ہے۔ میرا جرمنی جانا بھی اچانک ہو گیا اور اس کے گھر والے بھی اچانک جا رہے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے میں کیا کروں۔ میرے ماں باپ اتنی جلدی تیار نہیں ہیں۔"

"تو پھر وہ کینیڈا چلی جائے گی۔"

"نہیں، اسے کینیڈا نہیں جانا چاہیے۔ تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے کہ اسے روک لو؟ میں وعدہ کرتا ہوں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اسے کینیڈا نہیں جانا چاہیے۔ میرے پیارے بھائی، تم اسے روک سکتے ہو نا؟ میرے ماں باپ بہت ہی پرانے خیال کے ہیں۔ انہیں منانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑے گی۔"

"تو اصل قصّہ یہ ہے؟" اس نے محسوس کیا جیسے اس کے اپنے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ "تو پھر اسے دھوکا کیوں دے رہے ہو؟"

"تمہاری قسم، میں دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ میں اسے جی جان سے چاہتا ہوں۔ میں اس کے بغیر اپنا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن میری سمجھ میں بھی نہیں آتا میں کیا کروں۔ اسے بھی سچی بات نہیں بتا سکتا۔ میں شادی کروں گا تو اسی سے۔"

"تو کیسے کرو گے؟"

"تم میری مدد کرو، میرے پیارے بھائی۔ اس کے ماں باپ بہت روشن خیال ہیں۔ ان کی بیٹی اگر یہاں رہ جائے اور اپنی مرضی سے شادی کر لے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"لیکن وہ تو آج بھی شادی پر تیار ہیں۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔ میں ان سے ملتا رہتا ہوں۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔"

"تم نے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم اکیلے نہیں، ہم دونوں مل کر کوشش کریں گے۔"

پھر دونوں نے مل کر کوشش کی اور وہ لڑکی اور اس کے والدین اس پر رضامند ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ وہ لڑکی چھ مہینے اپنے ایک رشتے کے ماموں کے پاس رہے گی۔ اس کے دوست کی واپسی پر شادی ہو جائے گی، اور پھر وہ دونوں بھی کینیڈا چلے جائیں گے۔

"میرے پیارے پیارے بھائی،" اس دوست نے چلتے وقت ایرپورٹ پر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "اب تم اس کا خیال رکھو گے میری طرف سے۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔"

"وہ کسی کے خیال رکھنے کی محتاج ہے؟ وہ تو دوسروں کا خیال رکھ سکتی ہے۔" اس نے

اپنے دوست کو خوش رکھنے کے لیے کہا۔

"ارے تم اسے نہیں جانتے۔ اس کی ساری مردانگی اوپر اوپر ہی ہے۔ اندر سے وہ عورت ہی ہے۔ بڑی کمزور عورت۔ ذرا سی بات پر رونا شروع کرتی ہے تو لگتا ہے جیسے ابھی ساری کی ساری پگھل جائے گی۔"

"یہ تمہارے اندر کا مرد بول رہا ہے۔" اس نے اپنی روشن خیالی کا اعلان کیا۔

"بس، تم اس کا خیال رکھنا۔" اور وہ چلا گیا۔

اس لڑکی کے ماں باپ بھی کینیڈا چلے گئے، اور وہ اپنے ماموں کے ہاں رہنے لگی۔

اب وہ اس کا اس طرح خیال رکھتا کہ کسی نہ کسی بہانے اس کے کمرے میں چلا جاتا، اس کے ماں باپ اور اس دوست کی باتیں کرتا رہتا، اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کسی قسم کی کمی محسوس نہ کرے۔ اسی لیے اس نے اسے اپنے ساتھ تقریبوں میں بھی لے جانا شروع کر دیا۔ پہلے بھی وہ تقریبوں میں جانے کی بہت شوقین تھی۔ لیکن اب وہ یہ اہتمام کرتا کہ وہ اس کے ساتھ ہی جائے۔

اس کے دوست کے خط بھی آتے تھے۔ اس کے پاس بھی اور اس لڑکی کے پاس بھی۔ کبھی کبھی وہ فون بھی کرتا تھا، لیکن یہ فون اس لڑکی کے لیے ہوتے تھے، اس کے لیے نہیں۔ اس کے پاس جو خط آتے اس میں بھی اس لڑکی ہی کا زیادہ ذکر ہوتا تھا کہ "اس کا تم خیال رکھتے ہو یا نہیں؟ اگر اسے ذرا سی بھی تکلیف ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وغیرہ وغیرہ۔ وہ لڑکی تو اپنے خط اسے نہیں دکھاتی تھی، لیکن وہ اپنے خط اس لڑکی کو ضرور دکھا دیتا تھا کہ اسے اطمینان رہے۔

پھر ملک کے اندر بھاری بوٹوں کی دھمک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ڈیڑھ دو سال سے لوگ جن مکروہ شکل بوٹوں کو ایک عارضی عذاب سمجھ کر برداشت کر رہے تھے، ان بوٹوں نے قد نکالنا شروع کر دیے۔ ساری دنیا اتھل پتھل ہو گئی۔ نوٹے دن نوٹے برسوں میں بدلنے لگے۔ بڑی بڑی سیسہ پلائی دیواریں گرنے لگیں۔ اب جس شخص کا قد ان بوٹوں سے ذرا سا بھی نکلتا نظر آتا ان کے سر قلم کیے جانے لگے۔ آنکھوں کانوں پر قفل لگنے لگے اور دماغوں پر شکنجہ سخت کیا جانے لگا۔

اب ہر شخص ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتا، کچھ بولنا چاہتا، لیکن دوسرے شخص کی کٹی زبان دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔

نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا فلیٹ اچانک ان سرپھروں کی پناہ گاہ بن گیا جن کے ہاتھ پاؤں، ناک کان اور زبان سلامت رہ گئی تھی اور جو انہیں سلامت رکھنا چاہتے تھے، جو تازہ ہوا میں سانس لینے کو بےچین تھے، جو اپنی زبانوں پر پیوند نہیں لگنے دینا چاہتے تھے، جو اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ابھی وہ زندہ ہیں اور زندہ انسانوں کی طرح اس دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔

وہ سب دن بھر اپنا منہ، اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند رکھتے، اور شام پڑتے ہی اس کے

فلیٹ کی طرف دوڑتے۔ ان سب کے اپنے خیالات تھے، اپنے نظریات تھے، اپنے فلسفے تھے، لیکن وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اگر بولیں گے نہیں تو گھٹ کر مر جائیں گے، اور وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔

خوب باتیں ہوتیں، خوب بحثیں ہوتیں، خوب شور مچایا جاتا۔ ایک دوسرے کو لپٹ لپٹ کر پیار کیے جاتے۔ پھر ایک دوسرے کے سر پر ایش ٹرے توڑنے کی کوشش کی جاتی، ایک دوسرے کے منھ نوچے جاتے۔ جب سب لوگ بول بول کر اور چیخ چیخ کر تھک جاتے تو بولنے کا کام روشن آرا بیگم، امانت علی خاں، نزاکت سلامت، بھیم سین جوشی یا جوی بائیز اور کلف رچرڈز کے سپرد کر دیا جاتا۔ اب یہ فلیٹ اس کا نہیں تھا، سب کا تھا؛ ہر اس شخص کا تھا جو بولنا چاہتا تھا، جو کچھ کرنا چاہتا تھا۔ صرف بول کر، صرف چیخ کر، اور گلا پھاڑ کر۔

وہ بھی اس فلیٹ میں آنے لگی تھی۔ آتی تو وہ پہلے بھی تھی، لیکن اب وہ شام کے ہنگاموں میں بھی شریک ہوتی۔ پہلی بار وہ آئی تو اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں میں وہ بیٹھے اور ان کی واہی تباہی سنے۔ کئی دن وہ پریشان رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی پریشانی کا اظہار اس کے سامنے بھی کر دے، لیکن اس سے ڈرتا تھا۔ کیسے کہے اس سے؟ کیا کہے؟

تیسرے دن پتا نہیں کس رو میں اس کے منھ سے وہ بات نکل گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ بھڑک اٹھی۔ "آخر مرد ہو نا! وہی بدبودار اور گھناونے مرد جو عورت کو کمزور سمجھتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ عورت خراب ہو جائے گی۔ مرد کی حفاظت کے بغیر عورت اپنےآپ کو نہیں بچا سکتی..."

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا..." اس نے کہنے کی کوشش کی، مگر اس نے ایک نہیں سنی، بولے گئی۔

"ننھے میاں! میں اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔ تھینک یو ویری مچ فار یور کنسرن..."

وہ شرم کے مارے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ وہ تو صرف اس کے ناراض ہونے سے ڈرتا تھا۔

وہ ناراض تو ہوئی، لیکن اس نے غصے میں اور بھی شام کو آنا شروع کر دیا، اور اب وہ اور بھی زیادہ دیر تک بیٹھتی تھی۔ اتنی دیر تک کہ رات کو اسے ہی اس کے گھر چھوڑ کر آنا پڑتا۔

دراصل ابھی تک وہ اسے سمجھ نہیں پایا تھا۔ یعنی اسے اس کے مزاج کا پتا نہیں چلتا تھا۔ کبھی تو بڑی سے بڑی تکلیف پر بھی خوش ہوتی تھی، اور کبھی ذرا سی بات پر تی فی ہو جاتی تھی۔

ایک شام ٹیلی وژن پر مہدی حسن کوئی غزل گا رہا تھا جس کا قافیہ تھا تنہائی، ہرجائی وغیرہ۔ اسے شرارت سوجھی۔ غزل ختم ہوئی تو اس نے خاص طور پر اس لڑکی کو مخاطب کر کے کہا: "ایک شعر ہو گیا ہے۔"

اس نے تو کوئی جواب نہیں دیا، دوسروں کی طرف سے آواز آئی: "ارشاد!"

اس نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی شوق سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
اس نے شعر پڑھا:

جب بھی شوہر سے وہ روٹھی تو مرے پاس آئی
بس یہی بات ہے اچھی مری ہمسائی کی

اس کا خیال تھا کہ اس کا قہقہہ بلند ہو گا اور سب کے قہقہوں کو پی جائے گا اور وہ اس کی تعریف کرے گی۔ لیکن وہ ناراض ہو گئی تھی۔ "واہ واہ!" اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ "بہت اچھے لگتے ہیں آپ ایسی باتیں کرتے! آپ کی مردانگی اسی میں ہے کہ اس طرح کی گندگی اچھالتے رہیں۔ آپ لوگ بس اسی سہارے جیتے ہیں کہ کوئی کسی سے ناراض ہو کر آئے اور آپ کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگے ... شرم کرو، اتنی اچھی غزل خراب کر دی۔ افسوس۔"

"اوہو، یہ تو مذاق کی بات تھی۔ آپ تو سچ مچ ناراض ہو گئیں۔" کسی نے کہا۔

"میں بھی مذاق کی بات کر رہی ہوں۔ آپ لوگوں کے مذاق کی اور آپ لوگوں کی ذہنیت کی۔"

اور پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس نے بہت روکنے کی کوشش کی، مگر وہ نہ مانی۔ اس دن وہ اس کے ساتھ بھی نہیں گئی۔

"عجیب عورت ہے۔ اپنے منھ میں جو آتا ہے بکے جاتی ہے۔ دوسرا ایسی بات کہہ دے تو ناراض ہو جاتی ہے۔" کسی نے کہا۔

"بنتی بہت ہے سالی۔" کسی اور نے کہا، اور اسے غصہ آ گیا۔

"بکواس نہ کرو۔ اس کے سامنے بات کرتے جان نکلتی ہے۔ اب بک بک کر رہے ہو۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"ایسے عورت ہونے کا فائدہ اٹھاتی ہے سالی۔ یہ عورتیں بھی بس..." پہلا شخص اور کچھ بولنے لگا تھا کہ اس نے اسے جھڑک دیا۔

"منھ سنبھال کر بات کرو۔ تمھیں بھی کوئی گالی دے سکتا ہے۔ بک بک کیے چلے جا رہے ہو۔"

"اچھا؟ تو یہ بات ہے؟ معاملہ اب یہاں تک پہنچ گیا ہے؟" ان سب نے معنی خیز انداز میں قہقہہ لگایا۔

"کیا بک رہے ہو؟ کیا مطلب ہے تمھارا؟" اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کے قہقہے بھی بڑھ رہے تھے۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ اس شخص کی طرف بڑھ رہا تھا جو سب سے زیادہ بول رہا تھا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ ہم تو کچھ نہیں کہہ رہے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ تمھارے دوست کی دوست ہے۔ اور دوست کے دوست دوست ہی ہوتے ہیں۔ تمھارا حق ہے۔ تم

Scanned with CamScanner

تھا، سیاسی اور تاریخی تجزیے کے نام پر اپنی خواہشات بیان کر رہا تھا۔ "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" -- "ایسا ہی ہو گا۔" -- "کوئی انسان اتنا کمینہ نہیں ہو سکتا۔" -- "انسان اتنا ہی کمینہ اور اتنا ہی خبیث ہوتا ہے۔"

اب وہ اٹھی۔ کتاب ایک طرف رکھی، اور دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ وہ بھی کسی بہانے اٹھا اور اس کمرے میں گیا۔ سوچا معلوم کرے طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں اور کروٹ لے لیٹی تھی، جیسے وہ نہیں چاہتی کہ اس سے کوئی بات کرے۔ وہ خاموشی سے واپس آ گیا۔

ابھی وہ واپس آیا ہی تھا کہ پیچھے پیچھے وہ بھی ٹہری کے ساتھ آئی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی، "دیوانِ حافظ ہے تمہارے پاس؟"

"دیوانِ حافظ؟" وہ حیران ہوا۔ "دیوانِ حافظ کا کیا کرو گی؟"

"فال نکالیں گے۔" وہ گھبرا گھبرا کر بول رہی تھی جیسے بہت جلدی میں ہو۔

"کیا؟" سب جیسے اس کی عقل پر شبہ کرنے لگے تھے۔ "ہم فال نکالیں گے؟"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" اس نے تعجب سے اس کا منہ دیکھا۔

"کیوں؟ میں نہیں کہہ سکتی؟ میں اس سوسائٹی میں نہیں رہتی؟" اس نے پھر اس کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلایا۔ "بتاؤ، دیوانِ حافظ کہاں ہے؟"

"یہ ہماری مایوسی اور بےبسی کی انتہا ہے۔" ایک صاحب نے نہایت افسردہ آواز بنا کر کہا۔

"آپ خاموش رہیے۔" اس لڑکی نے ڈانٹ دیا۔

پھر وہ خود ہی دوسرے کمرے میں گئی اور دیوانِ حافظ اٹھا لائی۔ پھر نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اب سب کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا۔ پھر یکدم آنکھیں کھول کر دیوان کو بیچ میں سے کھول دیا۔ ایک شعر پر انگلی رکھی اور اس کی طرف دیوان بڑھایا۔ "پڑھو کیا شعر ہے۔"

اب سب سنجیدہ تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ذرا سی بھی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لائے۔ شاید سب اپنے دل میں لسان الغیب کی غیب دانی کے قائل تھے۔ سبھی مانتے تھے کہ لسان الغیب جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اب سب انتظار میں تھے کہ انہیں شعر سنایا جائے، شعر کا مطلب بیان کیا جائے۔

اس نے پہلے ہونٹوں میں وہ شعر پڑھا۔ پھر بےساختہ نعرہ لگایا، "لو، کام آسان ہو گیا۔"

"کیا شعر ہے؟" سب نے بیک آواز کہا۔

"مطلب بتاؤ۔" اس لڑکی نے ان کے ساتھ ہی کہا۔

اس نے شعر پڑھا،

رسید مژدہ کہ ایّامِ غم نخواہد ماند
چنیں نہ ماند و چناں نیز ہم نخواہد ماند

جو چاہے کرو۔۔۔"

"اگر تم نے بکواس بند نہ کی تو میں تم سب کو کمرے سے باہر نکال دوں گا۔ بکواس کیے چلے جا رہے ہو۔ شرم نہیں آتی؟" لیکی اب اسے اپنے غصے پر حیرت ہونے لگی تھی۔ وہ اتنا ناراض کیوں ہو رہا ہے؟ آخر وہ آپے سے باہر کیوں ہوا جا رہا ہے؟ عام حالات میں تو ایسی باتوں پر خود بھی قہقہہ لگا دیتا تھا، ہنسنے والوں کے ساتھ خود بھی ہنس دیتا تھا۔ آج اسے کیا ہوا ہے؟ لیکن یہ لوگ بھی تو زیادتی کر رہے ہیں۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے ایسی باتیں کرنے کا؟

دوسرے دن صبح ہی صبح اس کے گھر گیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ "کسی کام سے ادھر آیا تھا، سوچا تمہیں بھی ساتھ ہی دفتر لیتا چلوں۔" وہ رات کی بات شاید بھول چکی تھی۔

پھر وہ قیامت کی رات آ گئی جس کی آخری ساعتوں میں پوری تاریخ سُولی پر چڑھ گئی۔ جس کی آخری گھڑیوں میں تاریخ کا چلتا دھارا واپس مڑ گیا۔ وہ رات جس کے بعد یوم نشور تھا۔ ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا یوم نشور۔

دو دن پہلے سے عجیب سی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ کوئی کہتا پھانسی ہو گی، کوئی کہتا نہیں ہو گی۔ جو کہتے پھانسی ہو گی، ان کے پاس کافی وزنی دلائل تھے۔ جو کہتے پھانسی نہیں ہو گی، ان کے سامنے بھی چند معقول شواہد تھے۔ یہ دو تین راتیں اس فلیٹ میں لڑائی جھگڑے کی راتیں تھیں، ایک دوسرے سے گلے ملنے، ایک دوسرے کا منہ نوچنے کی راتیں۔

اور اس رات اس کا فلیٹ ایک مہیب سناٹے کی زد میں تھا۔ سب لوگ شام ہی سے آ گئے تھے لیکن خاموش تھے۔ جیسے سب کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ کسی بولنے والے کا انتظار۔ ایسا بولنے والا جو ان کے دل کی بات کہہ دے، جو ان کی خواہش کے مطابق بات کرے۔

وہ بھی سب سے پرے وہاں تھی اور ایک کونے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سب سے الگ تھلگ۔ اپنے آپ میں گم۔ پچھلے چند دنوں سے وہ سب سے زیادہ پریشان تھی۔ ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی، کیا ہو گا؟ اور ان کا جواب سننے کے بعد ان سے لڑ پڑتی تھی۔ سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی اس نے کسی سیاست داں کے بارے میں کلمۂ خیر نہیں کہا تھا۔ لیکی پھانسی کی خبروں کے بعد اچانک اسے سیاست سے دلچسپی ہو گئی تھی اور وہ ہر وقت سیاست ہی کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے ان سب کو منہ بھر بھر کے گالیاں دیتی جو اس ڈرامے میں شریک تھے، جنھوں نے یہ ساری بساط بچھائی تھی۔ اور جو اس خونی بساط کے بےجان مہرے تھے۔

"آج کی رات خیریت سے گزر گئی تو پھر کچھ نہیں ہو گا۔" کسی نے ہمت کر کے خاموشی کی موٹی دیوار توڑی۔ کہنےوالا خاصا معتبر آدمی تھا۔

"وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔" اتنے میں ایک اور معتبر شخص نے اپنی رائے دی۔ "وہ ان کی موت ہے۔"

اس لڑکی نے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔ بولنے والوں کو ایک ایک کر کے دیکھا، اور پھر کتاب پر نظریں جھکا لیں۔ اب سب کی زبانیں کھل گئی تھیں۔ ہر شخص قیاس آرائیاں کر رہا

Scanned with CamScanner

اس نے اس شعر کا مطلب بیان کیا تو سب کے منہ سے ایک ہی آواز نکلی، "واہ!" اور سب کے چہرے کھل اٹھے۔ یوں لگا جیسے سب کو عمرقید سے رہائی مل گئی ہو، جیسے سب پھانسی کے تختے سے زندہ سلامت اتار لیے گئے ہوں۔ پھر سب بولنے لگے۔

"ہاں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اتنا آسان نہیں ہے ایسا کرنا۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ ان لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن اتنا مانوس بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی آتا تھا اور وہ بھی ایسی خبریں سنانے جن کے بارے میں وہ یہ تاثر دیتا تھا کہ وہ اندر کی خبریں ہیں۔ وہ کسی سفارتی دفتر میں کام کرتا تھا۔

"واہ، کیا موقعے پر آئے ہو!" کسی نے پورے فلیٹ کی ترجمانی کی۔ "کیا خبرلائے ہو؟ جلدی بتاؤ!"

وہ پہلے مسکرایا، پھر ایک خالی جگہ دیکھ کر بیٹھنے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچا اور دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ہی لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"بولو بھئی، بولتے کیوں نہیں؟"

"خوش خبری لایا ہوں۔" اس نے اپنا لہجہ پُراسرار بناتے ہوئے کہا اور پھر مسکرایا۔

"خوش خبری؟" وہ لڑکی جو ابھی تک دیوان حافظ میں گم تھی، اچانک اچھلی اور اس شخص کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔ "کیا خوش خبری ہے؟ بتاؤ نا! بتاتے کیوں نہیں؟"

"پھانسی نہیں ہو رہی ہے۔" اس نے اپنا لہجہ اور بھی پُراسرار کر لیا، آواز اتنی دھیمی کر لی جیسے سرگوشی کر رہا ہو۔

"کہاں سے ملی یہ خبر؟" اب اس لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا بازو بھینچ لیا تھا۔

"ظاہر ہے، اس کے سفارت خانے سے ملی ہو گی، اور کہاں سے ملی ہو گی۔" ایک شخص نے جو اپنےآپ کو بہت ہی بقراط سمجھتا تھا، طنز کے ساتھ کہا۔

"چپ رہو۔ بات کرنے دو۔" اس نے ان صاحب کی بزرگی کا بھی خیال نہیں کیا۔

"نہیں، میرے سفارت خانے سے نہیں ملی ہے۔۔۔"

"تو پھر کہاں سے ملی ہے؟" وہ لڑکی چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اس کی تسلّی ہو جائے، اسے اطمینان ہو جائے کہ لسان الغیب نے سچ ہی کہا ہے۔ مگر وہ شخص اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"ابھی فرنچ سفارت خانے کا آنریری کونسل آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا۔۔۔"

"کیا بتا رہا تھا؟" اس لڑکی کی بےچینی دور نہیں ہوئی تھی۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے سفارت خانے کو یقین دلایا گیا ہے کہ پھانسی نہیں ہو گی۔"

"کس نے یقین دلایا ہے؟" اس لڑکی کے خیال میں بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" وہ بقراط پھر بولا۔ "کون یقین دلا سکتا ہے!"

"میں آپ سے بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں ان سے پوچھ رہی ہوں۔" اس نے خبر لانے والے شخص کا بازو چھوڑ دیا اور ان صاحب کی طرف بڑھی۔ وہ صاحب جھینپ کر پیچھے ہٹ گئے۔

"جی؟ آپ بتا رہے تھے۔۔۔" وہ خبر لانے والے شخص کی طرف مڑی، لیکن وہ جا چکا تھا۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے چلا گیا تھا۔ شاید اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔

ویسے اب کسی کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ انہیں وہ خبر مل چکی تھی جو وہ چاہتے تھے، جس کی وہ آرزو کر رہے تھے۔ اب سب خوشیاں منا رہے تھے، خوب ہنگامہ کر رہے تھے۔ اور جب خوب دُھت ہو گئے تو گانے گنگنانے اٹھے اور باہر نکل گئے۔

"چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" اس نے اس لڑکی سے اسی طرح کہا جیسے روز کہتا تھا۔ لیکن وہ اسی طرح بیٹھی اسے گھورتی رہی۔ پھر انگڑائی لے کر فرش پر پاؤں پھیلائے اور دیوار سے پیٹھ لگا کر پسر گئی۔ "بہت تھک گئی ہوں۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اچھا چلو، مذاق نہیں کرتے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

"میں یہیں فالسی پر سو جاؤں گی۔ تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ سچ کہہ رہی ہوں، میرا اٹھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے۔" وہ اور بھی نیچے کو کھسک گئی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوا ہے؟ چلو اٹھو۔۔۔" اس نے اس کا ہاتھ اور زور سے کھینچا۔

"اُوہ، تم تو میرا ہاتھ ہی توڑ ڈالو گے۔" اس نے اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں، مگر دیوار سے لگی بیٹھی رہی۔ "کیا عورتوں اور مردوں کے درمیان وہ دوستی نہیں ہو سکتی جو مردوں اور مردوں کے درمیان ہوتی ہے؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" اس نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بلکہ عورت اور مرد کی دوستی -- یعنی جسے دوستی کہتے ہیں، اور کچھ نہیں کہتے -- ہوتی ہی اس وقت ہے جب ان کے درمیان کسی دوسری خواہش کا پردہ حائل نہ ہو۔"

"یہ مانتے ہو نا؟" وہ تھوڑی سی سیدھی ہو گئی۔

"ہاں ہاں، مانتا ہوں۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ آخر بندہ بشر ہے، نیت میں فتور آ سکتا ہے۔" یہ بات اس نے اس لڑکی کو ڈرانے کے لیے کہی جو خواہ مخواہ اسے مصیبت میں ڈال رہی تھی۔ اگر اس شخص کو پتا چل گیا جو جرمی میں بیٹھا ہے تو قیامت آ جائے گی۔

"یہ نیت میں فتور کیا ہوتا ہے؟" وہ ماننے والی نہیں تھی۔

"نیت میں فتور؟" اس نے کچھ سوچا۔

"ہوں؟"

"لوگ اچھی چیزوں کو بُرا نام دے دیتے ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟" وہ اسے اچھی طرح ڈرانا چاہتا تھا کہ کسی طرح تو جائے۔

Scanned with CamScanner

"میں تمہیں اچھی طرح جان گئی ہوں۔ تم صرف لوگوں سے ڈرتے ہو۔ چڑیا کا سا دل ہے تمہارا!"

"ہاں، دراصل میں شمانت ہمسایہ سے ڈرتا ہوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"ہمسائے کی اماں..." اس نے کہا اور اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔

"تمہیں اپنے ہمسایوں کا بہت خیال رہتا ہے۔ کبھی ان کی بیویوں کا ذکر کرتے ہو اور کبھی ان کی اماں کا..." وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔ "چلو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔ چلے جاتے ہیں یہاں سے، ورنہ ڈر کے مارے تمہیں رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ صبح کو اکڑے پڑے ہو گے بستر پر۔ فائربریگیڈ منگانا پڑے گا بستر سے نیچے اتارنے کے لیے۔"

راستے بھر دونوں خاموش رہے تھے۔ وہ کیا سوچ رہی تھی، اسے نہیں معلوم۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا، ہماری اخلاقیات بھی کتنی منافقانہ ہیں۔

اور جب اس نے اس کے دروازے پر اسے اتارا تو اس لڑکی نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا: "زیادہ نہ سوچا کرو!" اور اس نے اس کے سر پر ہلکا سا چپت لگا دیا تھا۔

دوسرے دن کا سورج مغرب سے طلوع ہوا تھا۔ انہونی ہو چکی تھی۔ سب دھوکا کھا چکے تھے۔ سب دھوکا دے چکے تھے۔ لسان الغیب، فرانسیسی سفارت خانہ، سارے فلسفے، ساری منطق اور ساری سیاسی اخلاقیات، سب کے سر نیچے ہو گئے تھے۔ منافقت، ریاکاری، فریب اور جھوٹ سربلند ہو گئے تھے اور شیطانی قہقہے لگا رہے تھے۔

اسے صبح ہی خبر مل گئی تھی۔ اور وہ سیدھا اس کے گھر کی طرف دوڑا تھا۔ اسے سب سے پہلے اس کا خیال آیا تھا۔ اس نے کس دل سے یہ خبر سنی ہو گی؟ اس وقت اس کے پاس کسی کو ہونا چاہیے تھا۔

لیکن وہ گھر پر نہیں تھی۔ کہاں گئی؟ کچھ پتا نہیں! کس کے ساتھ گئی ہے؟ نہیں، اکیلی ہی گئی ہے۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا، کچھ کہے بغیر ہی چلی گئی۔ کہاں جا سکتی ہے اتنی صبح ہی صبح؟ وہ کسی کو بتا کر تھوڑا ہی جاتی ہے۔ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ جب چاہتی ہے آتی ہے، جب چاہتی ہے چلی جاتی ہے۔ اس نے تو ہوٹل سمجھ رکھا ہے اس گھر کو۔

اس وقت وہ رشتےداروں کی شکایت سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے تو فکر یہ تھی کہ اس وقت وہ کہاں گئی ہو گی۔ اس پر کیا بیت رہی ہو گی۔ وہ اس کی دو تین سہیلیوں کا گھر جانتا تھا۔ وہاں گیا، مگر وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

وہ اِدھر اُدھر چکر لگاتا دفتر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ دفتر تو ضرور ہی آئے گی۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ لوگ آنے لگے۔ ہر ایک اپنی اپنی بات کر رہا تھا، اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ ہر ایک اپنی خواہش کے مطابق اس واقعے کا تجزیہ کر رہا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس پر خوش تھے اور اپنی خوشی کی وجہ بیان کر رہے تھے۔ اور کچھ لوگ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں چپ لگ گئی تھی! وہ خاموشی سے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ بھی انہیں میں شامل تھا۔ لیکن اس کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ وہ دوپہر تک دفتر نہیں آئی تھی۔ اس

کا کوئی فون بھی نہیں آیا تھا۔

وہ سردرد کا بہانہ کر کے دفتر سے جلد اٹھ آیا۔ اس کے گھر کا ایک چکر اور لگایا۔ وہ نہیں تھی۔ اس کا کوئی پتا بھی نہیں تھا۔ اب کیا کرے؟ اس نے سوچا، اور اپنے فلیٹ لوٹ آیا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی بستر پر گر گیا۔ لڑکے نے کھانے کو پوچھا تو اسے بھی ڈانٹ دیا۔ پھر لڑکے نے بتایا کہ وہ آئی تھی تو بےساختہ اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ "تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"جی ابھی تو آپ آئے ہیں۔ وہ تو دو مرتبہ آئی تھیں..."

"کیا کہہ گئی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں کہا۔ دونوں مرتبہ آپ کا پوچھ کر چلی گئیں۔" وہ لڑکا اپنا گال سہلاتا چلا گیا۔

اس نے لڑکے کو کیوں مارا؟ اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیسی حرکتیں کر رہا ہے؟ اس نے لڑکے کو بلایا، اسے پیسے دیے۔ "جا، فلم دیکھ آ۔"

پھر وہ بستر پر گر گیا۔ اسے نہ جانے کیسے نیند آ گئی۔ اتنی گہری نیند کہ دروازے پر ہونے والی کھٹ کھٹ سے بھی آنکھ نہیں کھلی۔ جب مکّوں اور گھونسوں سے دروازہ توڑنے کی آواز آئی تو وہ گھبرا کر اٹھا۔ وہ کھڑی تھی۔

"کہاں تھیں تم؟"

"کہاں تھے تم؟" دونوں نے بیک وقت کہا

"میں کہاں کہاں تمہیں دیکھتا پھرا..."

"تم فلیٹ میں کیوں نہیں تھے؟ میں نے کتنے چکر لگائے یہاں..."

"تم دفتر کیوں نہیں آئیں؟"

"آج دفتر جانے کا دن تھا؟"

"میں تمہیں دیکھنے گیا تھا۔"

"میں شہر میں گھوم گھوم کر تھک گئی۔ میں سارے شہر میں گھومتی پھری۔ ایک ایک چیز کو دیکھتی رہی۔ ایک ایک شخص کا چہرہ ٹٹولتی، ایک ایک کی آنکھوں میں جھانکتی۔ وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی..." وہ خاموش ہوئی اور بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں، اس کے چہرے اور کپڑوں سے لگتا تھا کہ وہ دھولوں اور مٹّوں میں بھاگتی پھری ہے۔ اس کے ہونٹ بتا رہے تھے کہ اس نے صبح سے پانی بھی نہیں پیا ہے۔

وہ جلدی سے اس کے لیے پانی لایا۔ وہ پوری بوتل پی گئی۔ پھر کھڑی ہوئی اور اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھتی رہی۔ پھر اس کی طرف پلٹی۔ "دیکھو ذرا اپنی طرف دیکھو۔ مجھے دیکھو۔ ہم بھی نہیں بدلے۔ ہم سب ویسے کے ویسے ہی ہیں... ویسے کے ویسے ہی..."

یہ کہہ کر وہ اس سے لپٹ گئی۔ اب وہ بھی رو رہا تھا۔ وہ شخص جو بڑے سے بڑے حادثے

Scanned with CamScanner

پر بھی نہیں رویا تھا، آج رو رہا تھا۔ وہ دونوں رو رہے تھے۔

اور اس رات وہ اس کے فلیٹ ہی میں رہی۔ اس رات اس کے فلیٹ میں اور کوئی نہیں آیا۔ اور اس کے بعد وہ اس فلیٹ میں ہی آ گئی۔ "ایسی تیسی ان حرام زادوں اور کتّوں کی... کمینے... خبیث... بدمعاش... بےغیرت..."

دوسرے دن اس نے پہلا کام یہ کیا کہ کسی دوسرے علاقے میں مکان تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ایسے علاقے میں جہاں لوگ اسے نہ جانتے ہوں۔ اور ایک ہفتے کے اندر اس نے مکان تلاش بھی کر لیا اور وہاں چلا بھی گیا۔

یہ سب اتنی جلدی میں ہو گیا تھا کہ اسے سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اس کے لیے تو ماضی حال اور مستقبل سارے زمانے گڈمڈ ہو گئے تھے اور وہ ان میں الجھا اپنے پاؤں ٹکانے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ یہ کیا ہو گیا؟ یہ کیسے ہو گیا؟ اب آگے کیا ہو گا؟ ایک شخص جرمنی میں بیٹھا ہے جو واپس بھی آئے گا!

"یہ سب ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔" وہ اسے تسلی دیتی ہے۔ "کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔"

"مگر..."

"مگر وگر کچھ نہیں۔ کوئی کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ شاید وہ جو تھا وہ دھوکا تھا۔ الیوژن..."

"لیکن اگر یہ دھوکا ہوا؟ فریب نظر؟" یہ بات وہ اپنےآپ سے کہتا ہے۔ اس سے نہیں کہتا کہ اب بھی اس سے ڈرتا ہے۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں شادی کر لینا چاہیے۔" ایک رات اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیوں؟" اس نے روکھا سا منہ بنا کر سوال کر دیا۔

"بس..." اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا وجہ بیان کرے۔

"ہماری شادی تو ہو چکی ہے۔ شادی کیا ہوتی ہے؟ سب کے سامنے اعلان کرنا اور بتانا کہ ہم نے میاں بیوی ہی کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور یہ ہم سب کو بتا چکے ہیں۔"

"کہاں بتایا ہے ہم نے؟"

"ہم ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ سب دوستوں کو معلوم ہے۔ یہ بتانا نہیں تو اور کیا ہے؟"

تھوڑی دیر وہ دونوں خاموش رہے۔ پھر وہ بولی، "میں جانتی ہوں تم لوگوں سے ڈرتے ہو۔"

"لوگوں سے بھی، اور اس شخص سے بھی جو جرمنی میں بیٹھا ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا، کہ کہیں اس کی یہ بزدلی پھر اس کے مذاق کا ہدف نہ بن جائے۔

"اس سے تو مجھے ڈرنا چاہیے۔" اس عورت نے جو اب اس کے ساتھ رہ رہی تھی، جواب دیا۔ "تم کیوں ڈرتے ہو؟ اور میں نے اسے لکھ دیا ہے۔"

"تم نے اسے لکھ دیا ہے؟ کیا لکھا ہے؟" وہ گھبرا گیا۔

"وہی لکھا ہے جو لکھنا چاہیے تھا۔"

"کیا لکھنا چاہیے تھا؟" اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ اگر کبھی اس نے اس دوست کو خط لکھا تو وہ کیا لکھے گا۔

"یہی کہ ہم شادی کر رہے ہیں۔" اس لڑکی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ہمیں شادی کر لینا چاہیے۔"

کچھ دن بعد وہ راضی ہو گئی اور باقاعدہ نکاح ہو گیا۔

"اب تو تمہارا خوف دور ہو گیا؟" اس رات اس لڑکی نے جو اب اس کی منکوحہ تھی، اسے گھیر لیا۔

"کیسا خوف؟" وہ ڈر گیا کہ خدا جانے وہ اور کون سا حملہ کرنا چاہتی ہے۔

"یہ خوف کہ کہیں وہ جرمنی سے واپس آئے اور میں اس کے ساتھ چلی جاؤں۔"

"نہیں، مجھے تمہاری طرف سے کوئی ڈر نہیں ہے۔" اس نے بہادر بننے کی کوشش کی۔

"جھوٹ مت بولو۔ میں جانتی ہوں تمہیں ہر وقت یہی خوف کھائے جاتا ہے۔"

"تو تم... مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو نہیں؟" نہ جانے وہ بچہ کیوں بن گیا تھا۔ اس نے اپنا یہ روپ پہلی بار دیکھا۔ اتنا کمزور، اتنا بزدل۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ ایسا کیوں ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟

اس لڑکی نے شاید اس کی دل کی بات جان لی تھی۔ وہ شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اتنی دیر تک وہ اسی طرح دیکھتی رہی کہ وہ جھینپ گیا۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟"

"نہ جانے کیوں، تم سامنے آتے ہو تو میرے اندر کی ماں جاگ اٹھتی ہے..."

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ اور بھی جھینپ گیا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہیں دیکھ کر دودھ اترنے لگتا ہے؟"

"اب بند کرتی ہو اپنی بک بک یا ماروں تمہیں؟" اس نے اس کا کان پکڑ لیا۔

"ارے، کیا کرتے ہو؟ چھوڑو میرا کان۔ تکلیف ہو رہی ہے۔ میں تو محاورہ بول رہی ہوں۔ ہماری امّی یہی کہتی ہیں۔ تم تو صحیح زبان بھی نہیں جانتے۔"

وہ واقعی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ ابھی تک اس کی زبان نہیں سمجھ پایا تھا۔ لیکن کیا وہ اپنےآپ کو بھی سمجھ سکا تھا؟

وہ پھر اس شخص کو بھول گیا تھا جو جرمنی میں تھا، جو اس کا بہت گہرا دوست تھا، اور جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو آج اس کی بیوی تھی۔ مگر کیا واقعی اسے بھول گیا تھا؟

۲

وہ دو تین ہفتے بعد واپس آ رہا تھا۔ یہ اطلاع اسے دفتر میں ملی، اور اس وقت ملی جب وہ لڑکی، جو اب اس کی بیوی تھی، پہلے ہی دفتر سے جا چکی تھی۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ وہ اکیلا ہی گھر پہنچا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ وہ اس کا سامنا کیسے کرے گا؟ وہ

Scanned with CamScanner

کیا کہے گا اس سے؟

وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر لان میں ٹہلتا رہا۔

"صاحب جی؟"

اس نے مڑ کر دیکھا تو نوکر کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"جی، گاؤں جانا ہے۔"

"ابھی تو گئے تھے۔"

"جی، وہ میرے بھائی نے اپنی بیوی اور ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔"

"تمھارے بھائی نے مار ڈالا ہے۔ کیوں؟"

"جی--- وہ--- اس کی بیوی کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس نے دونوں کو مار دیا۔"

"کیا؟" اس نے اس زور سے کہا کہ اسے خود اپنے اوپر حیرت ہوئی۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے، جاؤ، جاؤ۔۔۔"

پھر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ آئینے پر نظر پڑی تو ڈر گیا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ بالکل سفید۔ جیسے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ پھر اس کے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا اور وہ باہر آ گیا۔ اب وہ اپنے ایک دوست کو اسلام آباد فون کر رہا تھا۔ "کینیڈا کے دو ویزوں کا بندوبست کر دو۔ میں اسلام آباد آ رہا ہوں پاسپورٹ لے کر۔"

وہ واپس آئی تو اس نے نہیں بتایا کہ لڑکا گاؤں کیوں گیا ہے۔ پھر سوچتا رہا کہ کینیڈا جانے کی بات کیسے کرے۔ سوچتا رہا۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"چلو کینیڈا چلتے ہیں سیر کرنے۔ نہیں، ہنی مون منانے۔" اس نے حوصلہ کر کے کہہ ڈالا۔

وہ کلوزٹ میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ "کینیڈا؟" وہ ہنسی۔ "اچھے وقت ہنی مون منانے کی سوجھی ہے؟"

وہ ڈر گیا۔ کہیں اسے اس دوست کے واپس آنے کا علم تو نہیں ہو گیا؟ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ دوسرے دن اسے بتائے کہ دوست کی واپسی کی اطلاع سے پہلے ہی اس نے پروگرام بنایا تھا۔

"اچھے وقت سے کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اچانک یہ پروگرام کیسے بن گیا؟" وہ اس کی طرف پیٹھ پھیرے کپڑے رکھتی رہی۔

"پروگرام تو پہلے سے بنایا ہوا تھا۔ بس پوری تیاری کے بعد تمھیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

"اچھا؟ سرپرائز؟" وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"میں کل اسلام آباد جا رہا ہوں ویزے لینے۔"

"ہمیں کینیڈا تو اطلاع کرنا چاہیے تھی۔"

"ویزے ملتے ہی انھیں بھی اطلاع کر دیں گے۔ انھیں بھی سرپرائز دیں گے نا۔" اس نے تو اپنی طرف سے پورے یقین کے ساتھ کہا، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اس خاتون کو یقین نہیں دلا پا رہا ہے۔ لیکن وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

"ہوں۔ واٹ اے سرپرائز!" وہ پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

کراچی سے روانگی تک وہ پریشان رہا کہ اس عورت نے اب تک اس شخص کا ذکر کیوں نہیں کیا جو بہت جلد ہی واپس آ رہا ہے۔ ظاہر ہے اسے اطلاع مل گئی ہو گی، لیکن اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ جانتی ہے۔ وہ اس کی خاموشی سے ڈر رہا تھا۔ وہ خاموش کیوں ہے؟ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی، اس دوست کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔

آخر فرینکفرٹ سے جہاز روانہ ہوا تو وہ بولی، "اب تو خوش ہو؟"

"کس بات سے؟" وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے، مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اب تو ہم پاکستان سے دور نکل آئے ہیں اور کافی عرصے کے لیے دور نکل آئے ہیں۔۔۔"

وہ خاموش رہا۔ کچھ نہیں بولا۔ اسے کہنے دیا۔

"تم بہت بھولے ہو، بہت ہی معصوم۔ بالکل ننھے بچے۔ میں تو اسی دن سمجھ گئی تھی، چلو کینیڈا چلتے ہیں ہنی مون منانے۔۔۔" اس نے اس کی نقل اتاری۔

"تو--- تم نے اس وقت کیوں نہیں بتایا تھا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میں خواہ مخواہ خون خشک کرتا رہا اپنا۔" وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"یہی تو تمھارا بھولپن ہے، منّے میاں۔ اور یہی ادا تو ہمیں پسند ہے تمھاری۔" یہ کہہ کر وہ اس کی طرف اس طرح بڑھی جیسے ابھی اسے پیار کر لے گی۔ شکر ہے وہ دونوں کھڑکی کے ساتھ والی اس قطار میں بیٹھے تھے جس میں صرف دو نشستیں ہوتی ہیں۔ اگر وہاں تیسری نشست بھی ہوتی تو تیسرے آدمی کو مفت میں مزہ آ جاتا۔

"چلو بھول جاؤ، کچھ نہیں ہوا۔" اس عورت نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ٹیوبارک سے جہاز بدل کر وہ ٹورانٹو روانہ ہوئے۔ ایک رات جس ہینڈ فنج میں اپنے ایک دوست کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرے، دوسری صبح وینکوور روانہ ہو گئے کہ اس کے ماں باپ وینکوور کے نواح میں ایک سرسبز و شاداب علاقے سری میں رہتے تھے۔

انھوں نے دس بارہ گھنٹے کا سفر کیا کہ وینکوور اور ٹورانٹو کے درمیان کئی ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ جی چاہتا تھا فوراً بستر پر گر جائے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اُسے کچھ نہیں ہوا تھا۔

اس کے ماں باپ اس کے ساتھ بہت محبت سے ملے۔ غالباً انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کی بیٹی نے کس سے شادی کی ہے، اور جس نوجوان کو پہلے اس نے ملایا تھا اس کی جگہ یہ دوسرا شخص کیوں نظر آ رہا ہے۔ وہ خط میں انھیں بتا بھی چکی تھی۔

"یہ میرے اتنے پیارے پیارے ماں باپ کہ انھیں پا کر میں سب کچھ بھول گئی ہوں۔۔۔" وہ اس کا تعارف کرا رہی تھی، اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ آخر وہ بہانہ بنا کر اٹھا اور سامنے جو بھی کمرہ نظر آیا اس میں جا کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

"تم تو خوب سوئے۔" اس کی آنکھ کھلی تو ابھی رات تھی اور وہ اس کے قریب بیٹھی ہوئی

تھی۔

"تم نہیں سوئیں؟"

"میں تو امی ابّو سے باتیں کرتی رہی۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو۔ ابھی تو آدھی رات ہوئی ہے۔ تم دوپہر سے سو رہے تھے۔ ہم صبح کو ٹورانٹو سے چل کر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنے کے باوجود دن ہی دن میں یہاں پہنچ گئے تھے۔"

"ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے ان دونوں علاقوں میں وقت کا کتنا فرق ہے۔"

"امی ابّو تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔" اس نے اپنی آواز میں منوں پیار بھر کر کہا اور اس سے لپٹ گئی۔ صبح کو اس نے ناشتہ کیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا، کیونکہ امی ابّو کے ساتھ اس لڑکی کی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اور پھر ایڈمنٹن سے اس کے بھائی اور ان کے بچے بھی آنے والے تھے۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ خود ہی گھر سے نکل پڑے۔ راستے میں اسے جو بھی بس نظر آئی اس میں بیٹھ گیا۔ اتفاق سے وہ بس اس پارک کی طرف جاتی تھی جہاں ریڈ انڈینز کی نمائش لگائی گئی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا تماشا بنایا گیا ہے۔ ان کی جھونپڑیاں، ان کی سواریاں، ان کے لباس، ان کے ہتھیار، سب اس طرح سجائے گئے ہیں جیسے سچ مچ وہ وہاں رہتے ہوں اور زمانہ بھی ایک دن آگے نہ بڑھا ہو؛ ابھی پچھلی صدی ہی وہاں جمی کھڑی ہو۔ یہ لوگ بھی کاروبار کرنا خوب جانتے ہیں؛ پہلے ایک قوم، ایک تہذیب کو مٹاتے ہیں، پھر اس کی نمائش لگا کر پیسے کماتے ہیں۔ وہ سوچتا رہا۔

پھر وہ نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا شام کے قریب گھر پہنچا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟ بھائی جان اور بھابھی سب تمہیں پوچھ رہے تھے۔" اس نے اسے پکڑ کر اپنے بھائی جان کے سامنے پیش کیا۔ "یہ ہیں میرے میاں۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

بھائی جان اور ان کی بیگم جلد ہی اس کے ساتھ بےتکلف ہو گئے۔ اور پھر وہ دنیاجہان کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اس نے ان سے وہ بات پوچھی جس کے لیے وہ بہت بےچین تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ کینیڈا ہی میں آ جائے؟

"کیوں نہیں ہو سکتا! بہت سے طریقے ہیں یہاں آنے کے۔ آپ لوگ تیار ہو جائیں، ہم کوئی انتظام کر لیں گے۔" اس کے بھائی نے اسے یقین دلایا۔

لیکن وہ ناراض ہو گئی۔ "کیا بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ابھی ہم پاکستان ہی واپس جائیں گے۔ پھر کبھی یہاں آنے کی سوچ سکتے ہیں۔" اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟

دو دن رہنے کے بعد اس کے بھائی واپس چلے گئے۔ اور انہوں نے وینکوور کے اس پاس گھومنا شروع کیا۔ پہلے وہ وکٹوریہ گئے، جہاں پھولوں اور خوشبوؤں نے ان کا استقبال کیا۔ پھر وہ دو تین سو میل دور ریڈ انڈینز کے ایک ریزرو علاقے میں گئے، جہاں ٹوٹے شیشے والے مکانوں اور شراب کے نشے میں دُھت بوڑھے ریڈ انڈینز نے انہیں خوش آمدید کہا۔ یہ ریڈ انڈینز مفت کا

وظیفہ پاتے ہیں کہ ان علاقوں سے باہر نہ نکلیں، اور ان کی لڑکیاں حرام کے بچے پیدا کرتی ہیں، کہ ہی باپ کے بچوں کو وظیفہ زیادہ ملتا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگے۔

وہاں سے لوٹے تو ایک دن کے لیے امریکا شہر سیاٹل بھی ہو آئے کہ وہ سرحد کے ساتھ ہی ہے۔ پھر وہ واپس ٹورانٹو آ گئے۔ اور اوٹوا، مونٹریال اور تھاؤزنڈ آئی لینڈ تک دیکھ آئے۔ آخری رات نیاگرا فال کے ساتھ ایک ہوٹل میں گزاری۔

"ایک مہینے کی آور چھٹی لے کر امریکا بھی نہ دیکھ لیں؟" اس نے ہوٹل کی بند کھڑکیوں سے آتی نیاگرا فال کی ہلکی ہلکی موسیقی میں اس عورت کو سوتے سے جگایا جو اس کی بیوی تھی، اور جو اس سے پہلے اس کے دوست کی بیوی بننے والی تھی۔

"چپ ہو کر سو جاؤ۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کروٹ لی اور سو گئی۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔ اس کی نیند کہیں پاکستان میں کھو چکی تھی۔

اور پھر وہ واپس پاکستان آ گئے۔

وہ دوست بھی واپس آ چکا تھا، بلکہ بہت پہلے آ چکا تھا، اور دفتر آ رہا تھا۔ دفتر میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ گئے تھے۔

"ہم صبح ساتھ ساتھ دفتر جائیں گے۔" اس عورت نے کہا۔ اور اس نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اچھا؟ تو یہ بھی ڈرتی ہے؟

"ہم ساتھ ساتھ ہی تو جاتے ہیں۔" اس نے کہا، حالانکہ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اس دن وہ اکیلا ہی چلا جائے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے وہ تنہائی میں ہو جائے۔ اس لڑکی کو پتا نہ چلے۔ لیکن اب وہ پھنس چکا تھا۔

"نہیں، ایسے نہیں۔ ہم ساتھ ساتھ جائیں گے اور سیدھے اس کے کمرے میں پہنچیں گے۔ دھڑاک سے دروازہ کھولیں گے اور اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ لو، ہمیں مبارکباد دو ہم نے شادی کر لی ہے۔"

وہ خاموش رہا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی کوئی بات کرے۔ کوئی سوال کرے۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ اس عورت نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس طرح اس پر اچانک حملہ کر کے ہم اسے نہتا کر دیں گے۔"

"نہتا کر دیں گے؟ تم بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئے نئے لفظ نکالتی ہو۔"

"کیوں؟ یہ انگریزی کا صحیح ٹرانسلیشن نہیں ہے؟"

"اور اگر اس نے ہمیں نہتا کر دیا؟"

"تو ہو جائیں گے نہتے۔ یعنی بےشرم ہو جائیں گے اور جیسے کو تیسا کر دیں گے۔ آخر ہم کسی سے کیوں ڈریں؟"

"وہ کسی سے نہیں ہے، ہمارا دوست ہے۔"

"ہاں... دوست تو ہے وہ..." اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ اور وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

دوسری صبح وہ دیر سے دفتر گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایسے وقت پہنچیں جب وہ دوست

Scanned with CamScanner

اپنے کمرے میں پہلے سے موجود ہو۔ ٹھیک ہے، جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے۔ اسے جتنی گالیاں دینا ہیں آج ہی دے لے۔ اپنے دل کا سارا غبار وہ آج ہی نکال لے۔ اگر وہ ہمیں کمرے سے باہر بھی نکال دے تو ہم منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالیں گے۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے یہ احساس کی کہ اس عورت کو اگے کر دیا جو پہلے اس دوست کی سب سے عزیز دوست تھی اور آج اس کی اپنی سوت تھی۔

"ہیلو!" وہ دوست انہیں دیکھ کر ایسے اچھلا جیسے انہیں کا انتظار کر رہا تھا۔ "کب آئے؟ مبارک ہو... دولہا میاں، تم کیوں پیچھے کھڑے ہو؟ آگے آؤ بھئی۔ مبارکباد تو وصول کرو۔" یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ چمٹ گیا۔ پھر اس عورت کی طرف پلٹا۔ "تمہاری تو میں اچھی طرح خبر لیتا، مگر خیر، اب تم میری بھابھی ہو۔ آؤ، مبارک باد تو لے لو۔" یہ کہہ کر اس نے اسے بھی اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "اجازت ہے؟" یہ بات اس نے اس عورت کے کندھے پر سے جھانکتے ہوئے کہی۔ وہ عورت بھی شرمندہ شرمندہ سی اپنی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ اس کے لیے چائے منگا رہا تھا، بسکٹ اور مٹھائی منگا رہا تھا۔ اور وہ ششدر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ کیا ہوا؟ اس نے ایسا تو نہیں سوچا تھا! ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا! اب وہ کیا کرے گا؟

وہ دوست بول رہا تھا اور خداجانے کیا کیا سوال کر رہا تھا جن کے جواب وہ عورت دے رہی تھی، اور اس کے جسم کا سارا خون اس کے دماغ میں بھر گیا تھا۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔

قبل اس کے اس کا دماغ ریزہ ریزہ ہو جاتا، وہ اٹھا اور گھر بھاگ آیا۔ اکیلا۔ تنہا۔ کہ وہ ابھی دفتر میں ہی تھی۔ اس دوست کے کمرے میں، جو اس کا کمرہ بھی تھا۔

انور خاں

پھول کی پتّی سے

اس نے ہاتھ جوڑ کر ہم دونوں کو پرنام کیا اور بڑے ادب سے ایک سرخ گلاب میرے دوست ریاض کو پیش کیا۔

"آئیے مصراجی، بیٹھیے۔" ریاض نے ان کے پرنام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"دھنّیواد۔" مصراجی کھڑے رہے۔ "میں تو صرف پھول پیش کرنے حاضر ہوا تھا۔"

مصراجی نے سر کے ہلکے سے خم کے ساتھ رخصت چاہی اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

ریاض نے پھول کو سونگھا، انگلیوں کی پوروں سے پتّیوں کو چھوا، الٹ پلٹ کر دیکھا اور دوبارہ سونگھ کر قلم دان میں سجا دیا۔ گل دان تو کمرے میں تھا نہیں۔

مصراجی کمرے میں بمشکل آدھ منٹ رہے ہوں گے لیکن ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کی فضا بدل گئی ہے۔ کچھ اپنائیت سی محسوس ہونے لگی۔

"یار یہ بھی عجیب آدمی ہے۔" ریاض نے کہا۔ "روز ایک پھول دے جاتا ہے۔"

"صرف تمہیں یا کسی اور کو بھی؟"

"ایک بار بتا رہا تھا پورے دو درجن پھول تقسیم کرتا ہے۔ کچھ یہاں سینئر افسران کو، باقی پاس کی سیکریٹریٹ بلڈنگ ہے نا، اپنا منترالے، وہاں بانٹتا ہے۔ کچھ سیکرٹریوں کو، چند اہم ورزرا کو۔"

"بڑا نیک کام کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سچّا انقلابی انسان ہے۔ ریڈیو اسٹیشن تو خیر ٹھیک ہے، لیکن منترالے جیسی بےحس جگہ پر جا کر روزانہ یاددہانی کروانا کہ دنیا بڑی خوبصورت ہے، معمولی کام نہیں۔ میں سال بھر سے ایک چھوٹے سے کام کے لیے منترالے کے چکر کاٹ رہا ہوں۔ دفتر میں داخل ہونے سے پہلے پیر من من بھر کے ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص ایسی بےتعلقی اور حقارت سے دیکھتا ہے کہ یہ فضول سا آدمی کہاں چلا آیا۔"

"وہاں تمہارا کیا کام ہے؟" ریاض نے پوچھا۔

"یار، والد صاحب کو سرکار کی طرف سے ایک کمرہ ملا ہوا ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد اب اس کوشش میں ہوں کہ کمرہ میرے نام ہو جائے۔"

ریاض ریڈیو پر اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ اسکول اور کالج کی تعلیم ہم نے ایک ساتھ حاصل

Scanned with CamScanner

کی۔ اس کے بعد وہ ریڈیو پر ملازم ہو گئے۔ کئی سال بعد بمبئی میں پوسٹنگ ہوئی تو مجھے فون کیا۔ اب دس پندرہ دن میں ایک بار ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی میں ان سے ملنے چلا آیا تھا۔

مصراجی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ویسے تو ان میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ کھدر کا کرتا اور جینز پہنے ہوئے، پیروں میں کولھاپوری چپّل، مسدس نما چہرہ، چھدرے چھدرے بال، تالو گنجا ہو چکا تھا۔

چند روز بعد ان سے پھر ملاقات ہوئی۔ ریڈیو اسٹیشن کے نزدیک ہوٹل سمرات میں مَیں اور ریاض چائے پی کر گپ لگا رہے تھے۔ پروگرام اگزیکٹو مہذّب بھی ساتھ تھے۔ مصراجی پھولوں سے لدے کئی لوگوں کے ساتھ داخل ہوئے۔

ہمیں دیکھتے ہی لپک کر آئے۔ بہت خوش تھے۔ دبے دبے جوشیلے لہجے میں بتایا کہ آج ان کی سالگرہ ہے۔ منترالے والوں نے ہار پہنائے ہیں۔ ہم نے انھیں مبارک باد دی اور ساتھ میں چائے پینے کی دعوت بھی۔ مصراجی نے معذرت چاہی کہ ان کے ساتھ اور کئی لوگ ہیں۔

"کمال ہے، منترالے میں یہ سب بھی ہوتا ہے؟" مہذّب نے حیرت سے کہا۔

یوں ہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ریاض نے اچانک باتوں کا سرا بدلا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "یار تم ریڈیو کے لیے کیوں نہیں لکھتے؟"

"مَیں؟" میں ششدر رہ گیا۔ "میں کیا لکھ سکتا ہوں؟"

"تمھاری اردو تو مجھ سے بھی اچھی تھی۔" ریاض نے کہا۔ "مہذّب، اسکول اور کالج میں ہمارے تمام ساتھیوں میں اس کے نمبر سب سے زیادہ آتے تھے۔ اسی کے نوٹ پڑھ پڑھ کر تو ہم نے ہر امتحان پاس کیا۔"

"ریڈیو کے لیے لکھنا کوئی مشکل نہیں۔" مہذّب نے مجھ سے کہا۔ "آپ کوشش تو کیجیے۔"

ریاض کا کہنا مہذّب کے لیے کسی فرمان سے کم نہ تھا۔ اگلی بار میں ریڈیو اسٹیشن پہنچا تو اس نے مجھے پانچ منٹ کی تقریر دی اور کہا: "سب سے آسان کام نصیحت کرنا ہے۔ آپ کوئی اخلاقی موضوع لیجیے، جیسے اچھی سیرت، خوش اخلاقی یا عمل کی ضرورت، اور پانچ منٹ کی تقریر لکھ لائیے۔ بس دو صفحے لکھنے ہیں۔ چند اقوالِ زرّیں ہوں اور چند اشعار۔ آپ کی اردو تو اچھی ہے ہی، اور طالب علمی کے زمانے میں آپ نے ایسے مضامین تو لکھے ہی ہوں گے۔"

واقعی یہ کام بہت آسان نکلا۔ میں نے دوچار کتابیں، اقوالِ زریں اور اخلاقی حکایات کی سستی کتابیں خریدیں۔ چونکہ میں بہت دن بعد لکھنے بیٹھا تھا اس لیے کچھ دشواری تو پیش آئی لیکن ایک مختصر مضمون لکھ لیا۔

مضمون دیکھ کر ریاض بہت خوش ہوئے۔ مہذب سے کہنے لگے: "دیکھا، میں کہتا تھا نا، ظفر بہت اچھا لکھ سکتے ہیں۔"

مہذب کو بھی مضمون پسند آیا۔ اس کے بعد میں نے کئی مضامین لکھے۔ ایک بزرگ شاعر کا انتقال ہوا تو میں نے بڑی محنت سے ان کی شاعری پر ایک مضمون لکھا۔ دفتر کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں ریڈیو کے لیے لکھ رہا ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ افسران بھی عزت سے دیکھنے

لگے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ ریڈیو اسٹیشن جانا ہوتا تو دفتر سے اجازت لینے میں ہچکچاہٹ نہ ہوتی۔ اسی بہانے منترالے کی بھی درشن ہو جاتی۔

منترالے جب جاتا کرسیاں خالی نظر آتیں۔ جس کلرک کے پاس ہماری فائل تھی وہ اکثر نہ ملتا۔ پوچھنے پر پتا چلتا کہ کسی ذاتی کام سے باہر گیا ہے۔ ورنہ کسی اور سیکشن میں دوستوں کے ساتھ غپ شپ میں پایا جاتا۔ بہرحال جب ملاقات ہوتی مجھے اطمینان دلاتا کہ بہت آسان سا کام ہے! آپ نے درخواست دی ہے تو کمرہ یقیناً آپ کے نام ہو جائے گا۔ سیکریٹری صاحب کے دستخط کرنے کی دیر ہے۔ بس۔ میں ریاض کے پاس چلا آتا۔ راہ میں اکثر مصراجی ایم ایل اے ہوسٹل کے پاس یا کسی درخت کے نیچے بڑے انہماک سے کسی جماؤ میں گفتگو کرتے دکھائی دیتے۔ نظریں چار ہوتیں تو ہاتھ ہلا کر شناسائی کا اظہار کرتے۔ میں بھی جواباً ہاتھ ہلا دیتا۔ دو ایک بار سوچا مصراجی سے اپنے کام کے سلسلے میں بات کروں۔ پھر یہ سوچ کر کہ آج نہیں تو کل ہو ہی جائے گا، چپ رہا۔

ایک روز مہذّب سے بات ہو رہی تھی۔ کئی نئے ادیب موجود تھے۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا: "آپ نئے شاعروں پر کیوں نہیں لکھتے؟"

میں حیران ہوا۔ میر اور غالب، اقبال اور فیض پر لکھنا تو آسان تھا کہ ان پر بہت سی کتابیں تھیں، مضامین تھے۔ نئے شاعروں پر کیا لکھتا؟ بہتوں کو تو میں نے پڑھا بھی نہ تھا۔

مہذّب نے کہا: "آپ لکھیے تو۔ کلام ہم مہیا کر دیں گے۔ نئے لوگوں پر کوئی نہیں لکھتا؛ آپ لکھیں گے تو ہم ریڈیو والوں کو کریڈٹ ملے گی کہ نئے ادیبوں پر تقریریں نشر کروا رہے ہیں۔"

کچھ دیر بعد ریاض آئے۔ انھیں بھی یہ خیال پسند آیا۔ ناچار میں نے ہامی بھر لی۔

ہامی تو میں نے بھر لی، لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے بہت سے شاعروں کا ذکر کیسے کروں۔ صرف شہر میں چالیس پچاس نئے شاعر تھے، جن میں دس بارہ تو ضرور ایسے تھے جن کا ذکر کیا جا سکتا تھا۔ پھر ملک بھر میں کم از کم بیس پچیس اچھے شاعر تھے۔ دس منٹ کی تقریر میں ان سب کا ذکر کیسے آ سکتا تھا؟

ریاض نے مشورہ دیا کہ ان کے ریڈیو اسٹیشن کا رینج پچھتر کلومیٹر ہے۔ "اس رینج میں جتنے شاعر آتے ہیں ان میں جو نمایاں ہیں ان کا ذکر تفصیل سے کر دو؛ باقی کے نام گنوا دینا کافی ہو گا۔ چار پانچ نئے شاعر باہر کے جو بہت مشہور ہیں ان کے ذکر اور اس معذرت کے ساتھ کہ اس مختصر وقت میں تفصیلی گفتگو ممکن نہیں، مضمون ختم کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ مضمون سب کو پسند آیا۔ کچھ عرصے بعد اردو اکادمی کے ایک سیمینار میں اس مضمون کو خاصے اضافوں کے ساتھ دوبارہ پڑھوایا گیا۔ ایک مقامی روزنامے نے سیمینار کے چند روز بعد تعریفی نوٹ اور تصویر کے ساتھ اپنے اتواری ایڈیشن میں چھاپا۔ ان سب باتوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پورے اعتماد کے ساتھ شہر کے ان چائے خانوں میں بیٹھنے لگے جو ادیبوں کے ٹھکانے تھے۔

بڑے خوش گوار دن گزر رہے تھے کہ منترالے کے ایک نوٹس نے پیروں تلے سے سچ مچ ہی زمین سرکا دی۔ مختصر سا دوسطری خط تھا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ آپ کے پتاجی سورگباش ہو

Scanned with CamScanner

چکے ہیں! قانون فلاں دفعہ فلاں کے تحت کمرہ ایک ماہ کے اندر خالی کر دیں۔

اگلے دن دفتر سے چھٹی لے کر میں سیدھا منترالے پہنچا۔ حسب معمول کلرک محترم اپنی کرسی پر نہ تھے۔ انہیں تلاش کرتے ہوئے میں کنٹین پہنچا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور فوراً چائے منگوائی۔

جب تک چائے آئے، میں نے خط لفافے سمیت ان کے حوالے کیا کہ یہ آپ کے دفتر سے موصول ہوا ہے۔ شدید غصّے اور رنج کے باعث میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔

"میں نے؟" انہوں نے تعجب سے کہا۔ "میں نے کوئی خط نہیں بھیجا۔"

اس نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر خط نکالا۔ خط پر لکھے نمبر اور دستخط دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ چہرے پر ابھرے تشویش کے آثار معدوم ہوئے۔ خط مجھے واپس کرتے ہوئے کہا! "یہ خط ہمارے سیکشن کا نہیں۔"

"پھر؟" میں اور فکرمند ہو گیا۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے بےفکری سے کہا۔ "یہ ضابطے کی کارروائی ہے جو اس سیکشن کو کرنی پڑتی ہے۔ یہ کارروائی انہیں دو سال پہلے کرنی چاہیے تھی جو اب کر رہے ہیں۔"

"اب کیا کریں؟"

"چائے پیو یار!" اس نے کہا۔ "آؤ چل کر سیکرٹری صاحب سے ملتے ہیں۔"

سیکرٹری صاحب سے ملے۔ انہوں نے بھی وہی بات کہی کہ "یہ ضابطے کی کارروائی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا کام جلد ہو جائے گا۔"

بمبئی میں بےگھری کا تصور ہی نیندیں اڑانے کے لیے کافی ہے۔ ان کی تسلی سے مجھے اطمینان کیسے ہوتا؟

منترالے سے باہر آیا تو مصراجی درخت کے نیچے کھڑے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ میرے قدم خودبخود ان کی طرف بڑھ گئے۔

"کیا بات ہے، ظفر بھائی؟" مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آئے۔ مڑ کر اپنے ساتھیوں کو رخصتی اشارہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے!

"آئیے چائے پیتے ہیں۔"

ہم دونوں نے سمراٹ ہوٹل کا ایک گوشہ سنبھالا۔ میں نے تمام تفصیلات گوش گزار کیں۔ حددرجہ آزادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے!

"ظفر بھائی، آپ نے کبھی بتایا تکم نہیں۔ ارے اتنے پھول ہم کس دن کے لیے بانٹتے ہیں؟ اسی لیے نا کہ آپ جیسے سجنوں کی کچھ سیوا کر سکیں۔"

چائے ختم کر کے انہوں نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ دو انگلیوں میں سگریٹ دبا کر مسکرائے۔

"آپ چنتا نہ کریں۔ کسی طرح کی چنتا نہ کریں۔"

"آپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ یہ بیماری سمستیا ہے۔ ہم پر چھوڑ دیجیے۔"

مصراجی سے دو روز بعد ملاقات طے ہوئی۔ یہ دو دن میں نے بڑی تشویش میں گزارے۔ منترالے کا نوٹس یاد آتا تو دل کو پنکھے لگ جاتے۔

خدا خدا کر کے دو روز گزرے اور میں مصراجی سے ملا۔ مصراجی سیدھے مجھے ڈپٹی سیکرٹری کے پاس لے گئے۔ وہ اپنے کمرے میں نہ تھے۔ ہم باہر راہداری میں کھڑے ان کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ مصراجی نے انہیں راہ ہی میں لپک لیا۔

"مصراجی، اس وقت میں بہت بزی ہوں۔" ڈپٹی سیکرٹری نے اپنی کوفت کو لہجے کی شیرینی میں چھپانے کی کوشش کی۔

"میں تو رُماجی کے لیے آیا تھا۔" مصراجی نے ایسی اپنائیت سے کہا گویا وہ ڈپٹی سیکرٹری کے رشتےدار ہوں۔

"رُما؟" وہ بڑبڑائے۔ رُما ان کی لڑکی کا نام تھا۔ "ٹھیک ہے، آئیے۔ لیکن میں دو منٹ سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔"

کچھ لوگ بڑی دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ دس بارہ آدمیوں کا ایک وفد تھا جو پہلے سے وقت لے کر کسی خاص مسئلے پر گفتگو کا خواہش مند تھا۔ ہم سیکرٹری کے پی اے کی شعلہ بار نگاہوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"فرمائیے۔" انہوں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ ظفر صاحب ہیں۔" مصراجی شروع ہوئے۔ "اردو کے مہان لیکھک ہیں۔ میں نے ان سے رُماجی کی کویتاؤں کی چرچا کی تو بہت خوش ہوئے۔"

"آپ انہیں گھر لے آئے۔" سیکرٹری صاحب کچھ جھنجھلا گئے۔

"ظفر صاحب چاہتے ہیں کہ رُماجی ریڈیو پر اپنی کویتائیں سنائیں۔" مصراجی نے اسی شیریں لہجے میں کہا۔

"اوہ آئی سی۔" ڈپٹی سیکرٹری نرم پڑ گئے۔

"آپ ریڈیو پر افسر ہیں؟" مسکرا کر مجھ سے پوچھا اور جیب سے سگریٹ نکال کر مجھے پیش کیا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"جی نہیں۔" مصراجی بول اٹھے۔ "ریڈیو کے بڑے بڑے افسر ان کے دوست ہیں۔ ان کے لیے تو یہ بس..." باقی بات انہوں نے چٹکی بجا کر پوری کی۔

مجھے بےحد غصّہ آیا۔ ایک چٹکی میں وہ مجھے اپنے برابر لے آئے تھے۔ سیکرٹری بھی سوچ رہا ہو گا کہ آخر منترالے میں اس کا کون سا کام پھنسا ہوا ہے جو رُما کے لیے ریڈیو پروگرام دینے کے لیے بیتاب ہے۔

"بہتر ہوتا آپ رما کو فون کرتے۔" ڈپٹی سیکرٹری نے بےنیازی سے کہا۔ لیکن ان سے صبر نہ ہو سکا۔ بار بار انہوں نے اپنی بےصبری کو چھپانے کے لیے انگلیوں کو مروڑا، مٹھی بند کی۔ اضطراراً گھنٹی بجا کر پی اے کو بلایا اور چائے کے لیے کہا۔ آخر ان کا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف

Scanned with CamScanner

بڑھا اور انھوں نے نمبر ملا کر اپنی بیٹی رُما سے بات کی۔

مصراجی بڑی بےنیازی سے ان کی تمام حرکتیں دیکھتے رہے۔

"بیٹی رما، یہاں مصراجی آئے ہوئے ہیں--- ہاں وہ جو پھول بانٹتے ہیں نا وہ۔ وہ تمھاری کویتائیں ریڈیو سے سنوانا چاہتے ہیں--- ہاں ریڈیو سے۔ ٹھیک ہے، تم خود ہی ان سے بات کر لو۔"

میں نے دیکھا ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا ہے۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ بھول گئے کہ وہ منترالے میں ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ ایک باپ کی مسرّت چھپائے نہ چھپتی تھی۔ دل ہی دل میں مَیں مصراجی کو ماں گیا۔ واقعی باکمال آدمی ہیں۔ لیکن میں رباض سے کیسے کہوں گا؟ بہتر ہو کہ مصراجی پر ہی چھوڑ دوں۔

رباض سے ملاقات ہوئی تو انھیں تمام بات بتانی ہی پڑی۔ وہ ہنس پڑے۔ "بہت کاٹیاں ہے؟" انھوں نے کہا۔ "آخر ہمیں بھی پھانس ہی لیا۔"

مہذّب نے ٹیلی فون کر کے رُما کو بلوایا۔ مصراجی نے مجھے بتایا کہ ڈپٹی سیکرٹری کو اپنی بیٹی پر ناز ہے کہ وہ بہت ذہین ہے، خوبصورت ہے۔ سائنس کی طالبہ ہے لیکن فنون لطیفہ سے شوق ہے اور شاعری کرتی ہے۔ ریڈیو پر بلایا جانا گویا ان خوبیوں کی تصدیق کے مترادف تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مہذّب، رباض اور میں نے بھی اس سے مل کر یہی محسوس کیا۔ رما اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی نظموں میں کچّاپن تو تھا لیکن اظہار کی تازگی اور قوّت بھی تھی جو جذبے کی صداقت سے پیدا ہوتی ہے۔

رباض چاہتے تھے کہ اسی وقت ریکارڈنگ ہو جاتی، لیکن مصراجی بضد ہوئے کہ ریکارڈنگ دو چار دن بعد اطمینان سے ہو، تاکہ رما کویتائیں منتخب کر لے اور پڑھنے سے پہلے ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ یہ بات رما کی ماں کو بھی مناسب معلوم ہوئی۔

رباض نے کہا "آپ جیسے مناسب سمجھیں۔"

رباض نے ان کی خاصی خاطر کی؛ چائے بسکٹ وغیرہ منگوائے۔

ریکارڈنگ کے دن میں نے چھٹّی کی۔ وہاں پہنچا تو ایک صحافی اور کیمرہ میں مہذّب کے کمرے میں نظر آئے۔ ڈائرکٹر صاحب کو پتا چلا کہ ڈپٹی سیکرٹری کی لڑکی اپنی نظمیں ریکارڈ کروا رہی ہے تو خود ریکارڈنگ پر آئے۔ لڑکی کو شاباشی دی۔ رباض سے وہ خاصے خوش نظر آئے۔ کیمرہ مین کو انھوں نے بخوشی تصویریں کھینچنے کی اجازت دی۔

اگلے روز ہم نے دیکھا کہ ایک مشہور اخبار کے ارٹ کے صفحے پر رما کی ریکارڈنگ کی تفصیلی رپورٹ چارکالمی تصویر کے ساتھ چھپی ہوئی ہے۔ دو تصویروں کو ملا کر ایک تصویر بنائی گئی تھی؛ ایک طرف رما مائیکروفون کے سامنے اپنی نظمیں پڑھ رہی تھی، دوسری طرف مہذّب اسے ہاتھ سے کچھ اشارہ کر رہے تھے۔ اناؤنسر مشین پر جھکا ہوا تھا۔

اتنے میں رباض کا فون آیا۔

"آج کا اخبار دیکھا؟"

"ہاں، رما کی تصویر کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ یہ کوئی اور ہی چکر چل رہا ہے۔" رباض نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے چھوٹے سے کام کے لیے تو اتنا بڑا چکر چلنے سے رہا۔"

"وہ سالے مصرا ہے ہم دونوں کو استعمال کیا ہے۔" رباض کے لہجے میں کچھ تلخی تھی۔

رباض نے مصراجی سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اصل کام تو ایک صنعت کار کا ہے۔ یہ اخبار اسی کا ہے۔ اسے اپنا کوئی کام کروانا ہے جو متعلقہ وزیر کر نہیں رہے۔ صنعت کار نے پہلے تو اپنے ایک ملازم سے ان کے خلاف مضامین لکھوائے کہ ڈر کر وزیر موصوف اس کا کام کر دیں۔ لیکن وہ اور ناراض ہو گئے۔ اب ڈپٹی سیکرٹری صاحب کے ذریعے کوشش ہو گی۔ ان کی بات کو وزیر صاحب کبھی نہیں ٹالتے۔

منترالے پہنچا تو کلرک نے بتایا کہ فائل انڈرسیکرٹری کی سفارشی کلمات کے ساتھ ڈپٹی سیکرٹری کے پاس پہنچ گئی ہے۔ اور انھوں نے دستخط بھی کر دیے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں گزارش کی ذلّت اٹھاؤں یا ان پر کوئی اخلاقی دباؤ محسوس ہو، انھوں نے دستخط کر دیے تھے۔ کام ہو جانے کی خوشی میں میں نے کلرک کو ایک سبز نوٹ بطورانعام پیش کیا اور خوش ہو کر اس نے بقیہ بھر کے اندر اندر خط ٹائپ کروا کر سیکرٹری صاحب کے دستخط کے ساتھ مجھے بھجوا دیا۔

میں نے مصراجی کو بھی انعام دینا چاہا، لیکن "گھور پاپ" کہتے ہوئے انھوں نے اپنے کان پکڑ لیے۔ "ظفر بھائی، ہم تو سیوا کو دھرم سمجھتے ہیں۔"

ایک دن دوپہر کے وقت دفتر میں کھانا کھا کر ہاتھ دھو رہا تھا۔ ایک ساتھی نے پوچھا، "وہ تمھارا منترالے والا کام ہو گیا؟"

"ہاں۔ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یار میرا بھی کچھ ایسا ہی کام آ پڑا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ فکر نہ کرو، میں کروا دوں گا۔" میری زبان سے بےساختہ نکلا۔

میں نے حیرت سے سامنے لگے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔

کیا یہ میں نے کہا تھا؟

قمر احسن

شیرِ آبپوخانہ

"اگر تمہارے دل کو اُس سراپا ناز سے تعلق ہے تو خود اپنے آپ پر نظر رکھو۔ گوکہ وہ کمال ظہورِ حسن کی وجہ سے آفتاب نصف النّہار کی طرح حجاب میں ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی ذرّہ اس کے پرتو سے محروم نہیں۔ غور کرو اور اپنی حقیقت کو سمجھو۔ تم خود ہی اپنا مقصود ہو۔

"شیخ شہاب سمنانی نے پہلے خود پر غور کیا اور پھر فرض کر لیا کہ وہ ایک لاغر اور مریل گائے ہیں۔ لہذا وہ گائے ہو گئے۔۔۔"

راجہ توکّل حسین ایک کرم خوردہ گہرے زرد رنگ کی کتاب سے اتنا ہی پڑھ سکے تھے کہ حاضرین میں سے ایک بول پڑا۔

"راجہ صاحب، تو کیا اگر ہم فرض کر لیں کہ ہم چوہے ہیں تو ہم چوہا ہو جائیں گے؟"

"ہاں ہو جائیں گے، اس لیے کہ ہم خود ہی اپنا مقصود ہیں۔ بس ہمیں اسی شدت سے فرض کرنا ہو گا جس شدت سے شیخ شہاب سمنانی نے فرض کیا تھا۔" راجہ صاحب نے جواب دیا اور پھر کتاب کے صفحے پر نظریں جما دیں۔

"اے بستی کے کم آب دریا کے ساحل پر پیاسے رہنے والو! اگر لب تر کرنا چاہو تو آ جاؤ۔

"۔۔۔جب فقیر کے غصے کی آگ بھڑکتی ہے تو خشک و تر سب کو جلا ڈالتی ہے۔ انہیں میر سایا کو ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ جامۂ سبزی تن پر لپیٹے تیزی سے لپکتے آگے بڑھے اور ایک تیلی کے مہمان ہو گئے۔ سرِشام قریب وقت مغرب تیلن نے دیکھا کہ میر صاحب شیر کی کھال پہنے شیر کی کھال پر بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ وہ رخ کے جلال پر تادیر نظر نہ جما سکی اور جا کر ایک گوشے میں چھپ گئی۔ کچھ دیر بعد جھانک کر دیکھا تو میر سایا شیر کی کھال سے غائب تھے۔ اس کی نظر اوپر گئی تو جو کچھ اسے نظر آیا وہ اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ میر صاحب کا سر ہوا میں معلّق تھا اور بند سے بند جدا وہ پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔

"تیلن روتی پیٹتی بیچ بازار میں آ کر چلانے لگی، لوگو دوڑو! میر سایا کو نہ جانے کس نے

قتل کر دیا۔ خلقت دوڑ پڑی تو سب نے پایا کہ میر صاحب اسی طرح شیر کی کھال پر بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ عوام الناس خاموش اور تیلی الگ محوِ استعجاب۔

"جب لوگ چلے گئے تو میر سایا نے تیلن سے مخاطب ہو کر کہا، تو میرا راز جان کر خاموش نہ رہ سکی، اپنے عذاب کو خود بھگتے گی۔

"وہ فرماتے: یہ دنیا ایک دلکش کارواں گاہ ہے۔ یہاں سے حسرت کے سوا کچھ نہیں جاتا۔ اس کی بےرنگی میں رنگ ہے اور سازِ وحدت میں آہنگ ہے۔ یہ پردۂ کثرت کی نواسازی ہے اور شش جہت سے آواز آتی ہے: قبرستان میں جایا کرو!

"پھر ایک دن انہیں میر سایا نے فرض کیا کہ وہ ایک افعی ہیں۔ لہذا وہ کالا سانپ ہو گئے۔۔۔"

راجہ توکل حسین کتاب بند کر کے برامدے سے دور بڑے میدان کی طرف دیکھنے لگے۔ حاضرین دھیرے دھیرے اٹھ کر اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔

راجہ صاحب نے بڑے ٹھسّے سے بائیس سال پولیس کی ملازمت کی تھی۔ لیکن اب طبیعت کی مستقل خرابی کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لیا تھا۔ تھے تو وہ ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس، لیکن اکثر بےتکلف دوست اب بھی داروغہ صاحب ہی کے نام سے پکارتے تھے۔

انتہائی وجیہ اور بارعب جسم اور چہرے کے مالک تھے اور خاص طور سے آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ انہیں دور سے دیکھتے ہی ذہن میں کسی چیتے کا تصور آ جاتا تھا۔ آنکھوں کی وہی ہلکی سی زردی اور کاٹ دار چمک دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں کوئی آزار ہے۔

بس عجیب سی بیماری تھی۔

پہلے پہل جسم پر خشک دھبّے سے پڑے جن میں سے خشکی جھڑتی تھی۔ ڈاکٹروں نے الرجی جان کر علاج کیا تو کچھ دنوں کے لیے خشکی ختم ہو گئی لیکن دھبّے باقی رہے۔ کچھ دنوں بعد پھر خشکی پیدا ہو گئی۔ حکیموں اور ویدوں نے خیال ظاہر کیا کہ بلغمی مزاج لوگوں کو مرطوب آب و ہوا راس نہیں آتی؛ یہ اسی کا شاخسانہ ہے۔ لیکن مرض کی تشخیص کے باوجود وہ بھی شافی علاج نہ کر سکے۔

پھر ان خشک دھبوں میں سرخی پیدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ خارش اور جلن بھی بڑھنے لگی۔ ڈاکٹروں نے ہر ہر طرح کے الرجی ٹیسٹ بھی کر لیے لیکن کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ یہ دھبے پھیلتے پھیلتے چہرے اور سر تک بھی پہنچ گئے اور خارش کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے بھی راجہ صاحب کو چین نہ ملتا۔ ڈاکٹروں نے ہزار طرح کے پرہیز کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ کپڑا جسم پر نہ ڈالیں۔ اب ننگے بدن رہنا ان کی وضع داری کے خلاف تھا، لہذا ہفتوں کمرے میں بند، جسم پر مرہم کا لیپ لگائے پڑے رہتے۔ جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے مہینوں کی چھٹی لے کر وطن آ گئے۔ ٹونے ٹوٹکے سے لے کر دیسی نسخوں تک کو استعمال کرنے کے بعد بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر چھٹیاں ختم ہونے پر ڈیوٹی پر جانا

ہی پڑا۔ اور مرض بڑھتا ہی گیا۔ باقی جسم تو لباس میں چھپا رہتا لیکن چہرے اور ہاتھوں پر انتہائی مکروہ سرخ سرخ دھبّے پڑے رہتے تھے جن میں سے خشکی جھڑا کرتی تھی۔ کچھ دنوں بعد ان دھبوں میں سوجن بھی پیدا ہونے لگی اور اس میں سے پانی جیسا مادہ رسنے لگا۔

راجہ صاحب کی طبیعت اور مزاج میں مرض کی طوالت کی وجہ سے اشتعال سا پیدا ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر غرّانا اور غصہ کرنا، چیزوں کو توڑپھوڑ دینا اور لباس چیرپھاڑ ڈالنا اب ان کا معمول سا ہی گیا تھا۔ گھر کے تمام افراد اب ان سے کترائے کترائے پھرتے اور خود یہ بھی زیادہ تر اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب اس مرض کے ساتھ فرائض منصبی کا ادا کرنا ممکن نہیں رہ گیا ہے تو رضاکارانہ سبکدوشی کی درخواست دے دی اور اعلیٰ عہدےداروں سے مل کر انھیں صورت حال بتا کر اس کی منظوری بھی حاصل کر لی۔ چنانچہ سبکدوشی کے بعد سے پھر اپنے وطن واپس آ گئے تھے جہاں علاج بھی باقاعدہ چل رہا تھا۔ گھر اور گھر کے باہر اعزاواقربا ان کی دلجوئی میں بھی لگے رہتے تھے۔

اب ان کا معمول ہو گیا تھا کہ صبح اپنے کمرے سے نکل کر خاندانی لائبریری میں چلے جاتے اور خاصی دیر تک کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ پھر جو کتاب انھیں دلچسپ لگتی اسے لے کر باہر برآمدے میں آ جاتے اور اس کے کچھ حصے یا اقتباس بلند آواز سے پڑھ کر حاضرین کو سناتے۔ کبھی کبھی کسی خاص موضوع پر سب گفتگو میں بھی حصہ لیتے۔

دوپہر کے بعد سے پھر وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتے۔ بس اذاں کی آواز پر باہر نکلتے۔ مسجد جا کر فرادہ نماز پڑھتے، پھر کمرے میں واپس آ کر کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول ہو جاتے۔

آج کل تصوّف اور صوفیا میں ان کی دلچسپی بڑھی ہوئی تھی۔ احوالِ صوفیا پر جو بھی کتاب ہاتھ لگتی وہ اسے اٹھا لاتے۔ چنانچہ "نفحات الانس" اور "طبقات الصوفیا" اپنے کمرے ہی میں اٹھا لائے تھے۔

آج حاضرین کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ خلا میں گھورتے رہے، اور پھر اسی طرح کھوئے کھوئے سے اپنے کمرے میں واپس آ کر مسہری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

اچانک انھیں محسوس ہوا کہ کوئی پیلے رنگ کی پرچھائیں سی کمرے کی دیواروں پر دوڑ گئی ہے۔ انھوں نے چونک کر ادھر اُدھر، پھر دروازے کی طرف دیکھا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔

جب سے اس مرض کی شدت ہوئی تھی انھوں نے سب کے ساتھ بیٹھ کر دسترخواں پر کھانا ترک کر دیا تھا۔ اب ان کی اہلیہ ہی ان کا کھانا لے کر ان کے کمرے میں آ جاتی تھیں۔ ملازمہ خالی برتن اٹھا لے جاتی اور ان کے علم میں لائے بغیر ان کے جھوٹے برتن علیحدہ سے دھلوا لیے جاتے تھے۔

کھانے کے بعد جب ان کی بیوی چلی گئیں اور ملازمہ برتن سمیٹ لے گئی تو انھوں نے ایک گوشے میں رکھی سنگھارمیز کے قدآدم شیشے میں اپنےآپ کو دیکھا۔ کرتے کے نیچے پیٹ، سینے اور مونڈھوں پر لمبے لمبے سرخ نشان سے اُبھر آئے تھے جیسے رول یا کوڑوں کی مار سے ابھرتے ہیں۔ انگلیاں دیکھیں تو سرخ دھبوں کے نیچے گوشت کم ہو گیا تھا اور ہڈیاں گرہوں کی طرح

ابھر آئی تھیں جس سے انگلیاں پوروں پر سے مڑی مڑی لگنے لگی تھیں۔ انھوں نے رومال اٹھا کر ناک خشک کرنا چاہی تو لگا جیسے ناک پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی ہو۔ کان کی لوئیں بھی لٹکی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ابھی وہ آئینے میں اپنا سراپا دیکھ ہی رہے تھے کہ آئینے میں پھر پیلے رنگ کی پرچھائیں سی دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ ایک لمحے کے لیے انھیں لگا جیسے یہ شیر کا سراپا ہو۔ اضطراری طور پر انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو سپاٹ دیواروں پر کچھ نظر نہ آیا۔

بستر پر قیلولہ کرنے کے لیے لیٹے تو ایک دم سے خیال آیا کہ محرّم آنے سے پہلے امام باڑے کی صفائی ستھرائی پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ چنانچہ وہ ویسے ہی باہر نکل آئے اور ملازموں سے امام باڑے کا دروازہ کھلوا کر جوکھٹ چُوم کر اندر داخل ہوئے۔ سب سے پہلے سامنے فریم پر نظر جم گئی۔ جس میں سونے کے زرد پانی سے شیر کی شکل میں نادعلی لکھی ہوئی تھی۔ انھیں لگا کہ کمرے میں دو بار جو پرچھائیں سی نظر آئی تھی وہ بالکل اسی تصویر سے مشابہ تھی۔ وہ کچھ الجھے ہوئے سے تھوڑی دیر تصویر کے سامنے کھڑے رہے، پھر ملازموں کو کچھ معمولی سی ہدایتیں دے کر واپس چلے آئے اور بستر پر لیٹ گئے۔ چند ثانیوں بعد پھر اٹھ کر بیٹھ گئے اور لکھنے کی میز پر آ کر کاغذ قلم اور لفافے نکال کر اپنے دونوں بیٹوں کو خط لکھنے لگے۔

ان کا ایک بیٹا مقابلے کا امتحان پاس کر کے اب شہر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، اور دوسرا بیٹا یونیورسٹی میں تعلیم کا آخری سال پورا کر رہا تھا۔

انھوں نے بڑے بیٹے کے نام خط ختم کرنے سے پہلے اس میں فرمائش کے طور پر لکھا کہ وہ ان کے لیے شہر سے حیوانات پر اچھی کتابیں بھجوائے۔ خاص طور سے شیر کے متعلق اچھی کتابیں تلاش کرے۔ اور چھوٹے بیٹے کو انھوں نے شہر کی ایک مشہور دکان سے دیوار پر لگانے کے لیے شیر کی عمدہ تصویریں خرید کر بھجوانے کی ہدایت کی۔ دونوں خط ختم کرنے کے بعد وہ بستر پر آئے اور تھوڑی دیر بےچینی سے کروٹ بدلنے کے بعد حسب عادت سو گئے۔

سہ پہر کو دورانِ نماز حالت رکوع میں انھیں لگا جیسے دونوں پیروں کی انگلیوں کی اگلی پوریں منورم ہو کر آگے سے مڑ گئی ہیں۔ جب تک نماز ختم نہ ہو گئی ان کی خلش بڑھتی گئی اور سلام پھیر کر جلدی جلدی انھوں نے دونوں پیروں کی انگلیوں کو چھُوا اور دیکھا تو ان کا گمان اور مضبوط ہو گیا۔ وہ فکرمند سے ہو کر پھر اپنے آبائی کتب خانے کی طرف چل پڑے۔ پہلے تو تصوّف اور مذہبی کتابوں کو الٹتے پلٹتے رہے، پھر کتب خانے کی فہرست کھول کر صفحہ گردانی کرنے لگے۔ آخر میں "صیدیہ" اور دمیری کی "حیوۃ الحیوان" نکال کر اپنے ساتھ لے آئے اور صفحات پلٹ کر شیر کا ذکر تلاش کرنے لگے۔

رات کا کھانا کھاتے کھاتے انھوں نے کن انکھیوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا، "آپ بلاوجہ اتنی دیر انتظار کرتی ہیں۔ آپ کھانا رکھ دیا کیجیے، میں اطمینان سے کھا لیا کروں گا۔"

"نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے کھانا کھائیے۔" بیوی نے کہا۔

"لیکن مجھے تو بےچینی سی رہتی ہے کہ جلدی کھانا ختم کروں۔ آپ انتظار کر رہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

بس کل سے آپ میرا کھانا چھوڑ کر چلی جائیں گی۔"

جب ان کی بیوی جانے لگیں تو انھوں نے کہا؛ "کل بُھنا ہوا مرغ پکوا لیجیے گا۔ جی چاہ رہا ہے۔"

رات دیر تک وہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر سو گئے۔ دوسرا دن بھی معمول کے مطابق تھا۔ بس دوستوں اور مصاحبوں کے درمیاں بھی ان کے چہرے پر ایک فکر کا سایہ سا لہراتا رہا تھا۔

دوپہر کو جب ان کی بیوی کھانا لے کر آئیں تو انھوں نے دیکھ لیا کہ اس میں ان کی حسب فرمائش بھنا ہوا مرغ بھی رکھا تھا۔

جب ملازمہ نے کھانا سجا دیا اور ان کی بیوی وہیں بیٹھنے لگیں تو انھوں نے اصرار کر کے انھیں کمرے سے واپس بھیج دیا اور یقین دلایا کہ وہ اطمینان سے کھانا کھا لیں گے۔ جب ان کی بیوی کمرے سے باہر چلی گئیں تو انھوں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ کھانے کے پاس آ کر تھوڑی دیر کھڑے رہے پھر گردن گھما کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا اور دوزانو بیٹھ کر دونوں ہاتھ دسترخوان پر ٹیک کر مرغ کی پلیٹ پر جھک گئے۔

وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی درندے کی طرح بُھنے ہوئے مرغ کو صرف دانتوں کی مدد سے ادھیڑ ڈالیں، لیکن مرغ باربار پھسل جاتا تھا۔ ان کی پوری باچھیں مرغ کے مسالے سے لت پت تھیں۔ وہ اسی حالت میں اٹھ کر آئنے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنی حالت دیکھ کر خود ہی ہنس پڑے، لیکن انھیں خود اپنی ہنسی غراہٹ نما سی لگی۔ آئنے کے سامنے سے ہٹ کر پھر دسترخوان پر آئے اور اسی طرح دانتوں سے روٹی بھی کاٹ کر کھانے کی کوشش کرنے لگے۔ خاصی دیر تک جدوجہد کرنے کے بعد رومال سے منھ خشک کر کے اٹھے اور ہاتھ دھو کر پھر اطمینان سے کھانا کھانے لگے۔

اب انھوں نے باہر کی نشستیں بھی کم کر دی تھیں۔ کوئی ملنے پر بہت ہی اصرار کرتا تو تھوڑی دیر کے لیے باہر آ جاتے تھے ورنہ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے مطالعے میں غرق رہتے۔ ان کے ساتھی اور دوست دوچار دن تو دروازے پر جمع ہوئے، لیکن ان کی بددلی دیکھ کر وہ سب بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

ان کے بڑے لڑکے نے شیروں اور ان کی عادات و خصلت پر بہت سی کمیاب کتابیں جمع کر کے انھیں بھجوا دی تھیں، جنھیں پا کر وہ بہت مسرور ہوئے تھے۔ اور اب رات دن ان کتابوں کو پڑھ کر کاغذ پر نوٹس اور شیر کے چہرے، کان اور پنجوں کے نقشے بنایا کرتے تھے۔ تھوڑے دن بعد ان کا چھوٹا بیٹا شیروں کی بہت سی دیوارگیر تصویریں لے کر خود ہی آ گیا اور دونوں کئی دن تک یہ تصویریں کمرے میں کیلوں اور چپکنے والے کاغذ کی مدد سے لگاتے اور لٹکاتے رہے۔ انھیں دیکھ دیکھ کر وہ اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ ان کا بیٹا دوچار دن رہ کر پھر واپس چلا گیا تو بھی یہ دیر دیر تک ان تصویروں کے سامنے کھڑے ہو کر انھیں دیکھتے رہتے یا پھر آئنے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا سراپا دیکھتے۔ کبھی انھیں اپنا ناک کا بانسا بیٹھا ہوا نظر آتا، کبھی گمان ہوتا کہ دونوں ہونٹ موٹے ہو گئے ہیں اور جبڑا باہر اٹھ گیا ہے۔ یا پھر وہی کتابیں ہوتیں

اور ان کے نوٹس اور نقشے۔

بزرگوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا کہ گھر کے افراد سال بھر کہیں بھی رہیں، کچھ بھی کریں، لیکن محرم کے چاند سے پہلے سب وطن پہنچ جائیں۔ اس رسم کی انھوں نے بھی پابندی کی تھی اور اپنی اولاد کو بھی یہی ہدایت دی تھی کہ محرم سے پہلے وہ سب گھر آ جایا کریں۔ چناں چہ ان کا بڑا بیٹا جب اپنے اہل و عیال کے ساتھ آ گیا تو ان کو بڑا اطمینان ہوا۔ چھوٹے بچوں کی ان کے کمرے سے خاص دلچسپی رہتی تھی کیوں کہ ان کے لیے یہ کمرہ عجوبۂ روزگار تھا۔ دنیا میں ان کی ہر مطلوبہ شے کسی نہ کسی ڈبے یا دراز سے نکل آتی تھی، اور انھیں اس کمرے میں دھماچوکڑی کرنے یا خاموشی سے اپنا کھیل جاری رکھنے کی پوری آزادی رہتی تھی۔ لیکن اس بار ان کے آتے ہی راجہ صاحب کی اہلیہ یعنی بچوں کی دادی نے سختی سے اعلان کر دیا کہ کوئی بچہ ان کے کمرے میں نہ جائے گا۔ اور پھر انھوں نے اپنی بہو کو دھیرے دھیرے سمجھا کر ضروری ہدایات بھی دے دیں۔ بچے پہلے ایک دو دن تو ادھر اُدھر منڈلاتے رہے لیکن تیسرے دن نظریں بچا کر ان کے کمرے میں گھس گئے اور حیران حیران سے دیواروں پر لگی شیر کی تصویروں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ راجہ صاحب اپنی کتابوں سے ذرا فارغ ہوئے تو بچوں کو دیکھ کر مسکرائے اور ہاتھوں پر دستانے پہن کر دراز سے ٹافیاں، پستے اور بادام نکال کر ان کے حوالے کر دیے۔ بچے ایک جُھرجُھری لے کر مٹھیوں میں سامان لے کر بھاگ آئے تو دیکھا کہ ان کی دادی اور باپ سر جوڑے بیٹھے ہیں۔

"لیکن امّاں یہ صورت کب تک رہے گی۔ اب انھیں کسی مخصوص اسپتال میں داخل کرا دینا ہی اچھا ہے۔" لڑکے نے کہا۔

"تم جو چاہو کرو۔ لیکن یہ خیال رہے کہ انھیں کسی بات کا احساس نہ ہونے پائے۔ وہ ابھی تک اپنے مرض کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔" ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔

"اب یہ تو بتانا ہی پڑے گا۔ وہ بچہ تو ہیں نہیں کہ اس کی اہمیت کو نہ سمجھ پائیں۔" لڑکے نے اصرار کیا۔

"وہ ذہنی طور پر بچّے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہو گئے ہیں۔ میں نے انھیں آئنے کے سامنے کھڑے ہو کر طرح طرح کی حرکتیں کرتے، دانت بھینچتے، غراتے اور خوخیاتے دیکھا ہے۔ اکثر دیواروں پر لگی تصویروں سے باتیں کرنے لگتے ہیں! ان سے اشارے کرتے ہیں اور کبھی کبھی انگلی کی بندوق بنا بنا کر ان کا نشانہ لگاتے ہیں۔ ملازمہ بتا رہی تھی کہ کسی دن وہ ہاتھوں کے بغیر دانتوں ہی سے کھانا کھانے کی کوشش کر رہے تھے۔" ماں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"ایسی حرکتیں تو ہر آدمی تنہائی میں کرتا ہے امّاں۔ یہ کون سی خاص بات ہے! اصل بات تو ان کا وہ مرض ہے جسے وہ اتنے عرصے سے پالے ہوئے ہیں۔" لڑکے نے کہا۔

"تم جو بھی قدم اٹھاؤ خوب سوچ کر اٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے ان پر اور خراب اثر پڑے۔"

لڑکے تو فاتحہ ہوتے ہی پھرا مار کر اڑ گئے۔ اور راجہ صاحب پھر اپنے معمولات میں کھو گئے۔ موسم بھی اب زیادہ گرم ہو گیا تھا، لہذا دن کی دھوپ اور لو کی وجہ سے ان کا باہر

Scanned with CamScanner

نکلنا تقریباً بالکل ختم ہو گیا تھا۔ گرمی کی شدت سے اب ان کے جسم کی خارش بھی بہت بڑھ گئی تھی اور ہاتھوں پیروں کی انگلیوں سے پانی بھی زیادہ رسنے لگا تھا۔ اب انھیں دن میں کئی کئی بار اپنے دستانے بدلنے پڑتے تھے جنھیں اسی کام کے لیے مخصوص کر دیے گئے ایک برتن میں احتیاط سے ابال کر سُکھا لیا جاتا تھا۔ اور اب تو جسم پر پڑے لمبے لمبے سرخ نشانوں سے بھی ہلکا ہلکا پانی رسنے لگا تھا اور خارش پورے بدن میں پھیلتی جا رہی تھی۔

ایک صبح نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ مچھلیاں پالنے کے لیے جو تالاب کھدا ہوا تھا اس میں اتر گئے اور خاصی دیر تک اس مٹ میلے پانی میں نہاتے رہے۔ اب یہ گدلے پانی کی ٹھنڈک تھی یا مٹی کی تاثیر کہ اس دن انھیں خارش میں کمی محسوس ہوئی؛ چنانچہ اس کے بعد سے ان کا معمول ہو گیا کہ سورج بلند ہوتے ہی تالاب میں اتر جاتے اور سارا دھڑ پانی میں ڈبائے، گردن باہر نکالے، دوپہر کے کھانے تک پانی میں بیٹھے رہتے۔ پانی میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک دن انھیں احساس ہوا جیسے ان کے سارے بدن کی طاقت سمٹ سمٹ کر ان کے بازوؤں میں آتی جا رہی ہے، سینہ ابھر کر باہر آتا جا رہا ہے اور بازو موٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ گھر آ کر آئینے میں اپنا سراپا دیکھا تو کوئی فرق نہ پایا؛ البتہ ناک بیٹھی ہوئی اور ہونٹ موٹے نظر آئے۔ وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ ہونٹوں کے موٹے ہونے سے ناک بیٹھی ہوئی لگتی ہے یا ناک کے بیٹھے ہونے کی وجہ سے ہونٹ موٹے نظر آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان پر یہ احساس حاوی رہا کہ ان کے سینے اور بازوؤں میں تمام جسم کی طاقت سمٹ آئی ہے۔ چنانچہ ایک دن باتوں باتوں میں انھوں نے ایک بھینس کے چند روز قبل پیدا ہوئے بچے کو ایک ہاتھ سے نہ صرف اٹھا لینے کا دعویٰ کیا بلکہ اسے گردن سے پکڑ کر پنجوں میں دبا کر اٹھانے کی کوشش بھی کی۔ ملازمین دور کھڑے حیرت سے انھیں دیکھ رہے تھے۔

اسی اثنا میں ایک دن بڑے میدان میں ایک سفید رنگ کی وین آ کر رکی جس کی دونوں جانب اور پشت پر سرخ رنگ سے کراس بنا ہوا تھا اور اس میں سے راجہ صاحب کا بڑا بیٹا نکل کر پاس سمٹ آئے ملازمین کو کچھ ہدایات دیتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ ملازم وین کے ڈرائیور اور اس کے ساتھ سفید وردی میں اترے ہوئے ایک شخص کی مدارات میں لگ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ملازمین نے راجہ صاحب کی زوردار گرج سنی "خبردار اگر کسی نے میرے معاملات میں مداخلت کی..."

کچھ ملازم گھر کے اندر لپکے تو راجہ صاحب کی اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بس ایک جھلک نظر آئی۔ پھر دروازہ زوردار آواز سے بند ہو گیا۔ راجہ صاحب کا بڑا لڑکا، راجہ صاحب کی اہلیہ اور دوسرے افراد خانہ سناٹے کی حالت میں چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

راجہ صاحب کی اہلیہ نے سب کو اپنے کاموں میں مصروف ہو جانے کی ہدایت دی اور بیٹے کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"اب کیا ہو؟ میں تو اس مرض کے لیے مخصوص شہر کے ایک مشنری اسپتال میں ان کے لیے تمام مناسب انتظامات کر کے ہی انھیں لینے آیا تھا، اور اسی لیے ایمبولینس..." لڑکے نے الجھے

الجھے انداز میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں انھیں سمجھاتی ہوں۔ بس تھوڑی دیر صبر کرو۔ بلکہ اتنی دیر میں تم نہادھو کر تازہ ہو لو۔" راجہ صاحب کی اہلیہ بیٹے کو سمجھا کر راجہ صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ کمرے سے بہت دیر تک ان کے گرجنے اور غرانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد ان کی اہلیہ نے اپنی ملازمہ کو بھی بلا لیا اور اندر سے کچھ رکھنے اٹھانے کی آوازیں آنے لگیں۔

شام کو مغرب سے ذرا پہلے ملازمین دو سوٹ کیس لیے ہوئے گھر سے باہر آئے اور وین میں رکھ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد باہر جمع ہوگئے لوگوں نے دیکھا کہ راجہ توکل حسین مضطرب انداز میں زمین پر قدم رکھتے ہوئے گھر سے برآمد ہو رہے ہیں اور افراد خانہ ان سے خاصے فاصلے پر ان کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ نزدیک آ جانے پر سب نے دیکھا کہ راجہ صاحب کا چہرہ غصے سے لال ہوا جا رہا ہے اور سرخ آنکھیں اضطراب میں آس پاس کے تمام منظر کو اپنے میں سمیٹے لے رہی ہیں۔ وہ برآمدوں، دالانوں اور ڈیوڑھیوں سے گزرتے ہوئے سیدھے امام باڑے کی چوکھٹ پر آئے اور کچھ دیر خاموشی سے کھڑے رہ کر واپس پلٹ آئے۔ مجمع اب بھی ان کے نزدیک نہیں جا رہا تھا۔ وہ بڑے میدان کی طرف جاتے جاتے پھر مسجد کی دیوار کی طرف بڑھ گئے اور اسے مس کر کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ پھر سرخ چہرے اور سرخ آنکھوں کے ساتھ، سینہ پھُلائے اور بازو پھیلائے ہوئے وہ وین کے کھلے دروازے سے اس میں داخل ہو گئے۔

موٹر کے روانہ ہو جانے کے بعد راجہ صاحب کی اہلیہ جب ان کے خالی کمرے میں گئیں تو لگا جیسے کوئی پیلے رنگ کی پرچھائیں سی ابھی ابھی دیوار پر دوڑ گئی ہے۔ انھوں نے گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔

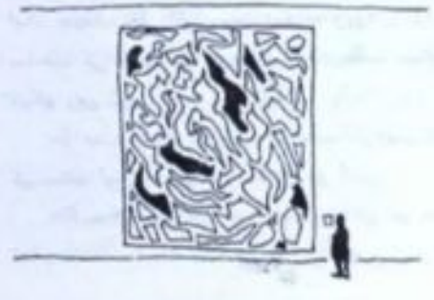

ناول

فہمیدہ ریاض

rekhta

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

گوداوری

پہاڑی بس اسٹاپ پر اترتے ہی ایک مختصر سیّاح خاندان کے چھوٹے بڑے اور بچّے بےتابی سے اپنا سامان اٹھا کر اپنی عارضی، چھٹیوں کی قیام گاہ کی جانب دوڑ پڑے۔

زمیں نے فوراً ان کے پیر پکڑ لیے۔ یہ میدان نہیں تھا۔ گھنٹوں بس میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے آنکھوں سے گردوپیش کے تمام مناظر بدلتے دیکھے تھے اور میدانوں کو پہاڑوں میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ لیکن آنکھوں کی اطلاع بےسود تھی؛ ان کی ٹانگوں کو میدان ہی کی عادت تھی۔ اونچےنیچے پہاڑی راستے پر ذرا سی دیر میں وہ پسپنے پسپنے ہو گئے۔ ہانپنے لگے۔ جوتوں کی طرف نظر ڈالی تو پہچانے نہیں جا رہے تھے؛ بالکل سرخ، سرخاسرخ، جیسے پسی ہوئی اینٹ مل دی گئی ہو۔

ناچار بوجھ تلے ہانپتے وہ الٹے قدموں لوٹے۔ بس اڈے سے قلی کیے۔ دھونیوں کے لنگوٹ کسے دو گٹھرے سانولے قلی ان کے چھوٹے بڑے سوٹ کیس، ناشتےدان، تھرمس اور ٹرانزیسٹر ریڈیو سنبھالے، پہاڑی کی پگڈنڈی کی چک پھیریاں چڑھنے لگے۔ پہاڑی کے عین سرے پر ان کی قیام گاہ تھی۔ مہاراشٹر کے مغربی کنارے پر اس پہاڑ کو بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں اور بمبئی اور سورت کے بوہروں، خوجوں، اسماعیلیوں اور پارسیوں نے بسایا تھا۔ بمبئی کی گرمی سے جب انگریز کا جی اوبھا تو انھوں نے پہلے کھنڈالا اور پھر اس سستے سستے پہاڑی مقام پر ریل کی پٹریاں بچھا دی تھیں۔ ان پٹریوں پر اب بھی دو انجن والی کھلونا سی ریل گاڑی بھاپ چھوڑتی چھک چھک کرتی آتی تھی۔ یہ کنبہ ریل وقت پر نہ پکڑ سکنے کی وجہ سے بس سے آیا تھا۔ تمام راستے انھیں پہاڑ کی گولائیوں میں ریل گھومتی نظر آتی رہی تھی۔ بمبئی سے تھوڑے سے ہی فاصلے پر، جہاں سے یہاں تک پہنچنے میں انھیں بمشکل چار پانچ گھنٹے لگے تھے، یہ تقریباً غیرپامال علاقہ جیسے مراٹھالینڈ کے پیٹ میں گھسا لٹا تھا۔ بس اسٹاپ پر مورتوں کی سی مراٹھنیں شوخ کچّے رنگوں کے سنہری کناریوں والے کاشٹے رانوں تک لنگوٹ کی طرح کسے سامانی ڈھو رہی تھیں۔ کنٹوں کے گود کے بچے ان کے سینوں، بازوؤں اور پیٹھ سے چمٹے تھے۔ ایک کو مزدوری مل جاتی تو دوسری موٹے موٹے کڑوں سے کہنی تک بھری بانہیں بڑھا کر اس کا بچہ سنبھال لیتی۔ ان کی سانولی پنڈلیاں ریشم کی طرح چکنی تھیں؛ ان پر بالکل بال نہ تھے۔ (آنے والے گروہ میں جو عورت تھی اس نے اپنی ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والی سہیلی سے

آنکھیں پھاڑ کر پوچھا تھا، "کیا ان کی ٹانگوں پر بال ہی نہیں اگتے؟" اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا، "اگتے کیوں نہیں۔" اور اسے بتایا تھا، "اکھاڑتی ہیں دھاگے سے۔") کسے کسائے سانولے مراٹھے چائے اور پاں بیڑی سگریٹ بیچ رہے تھے اور کمپاکولا کی گرم بوتلیں، جو ہر روز بمبئی کے مضافات سے ٹرک ان پہاڑی سلسلوں پر پھینک جاتے تھے۔ مردوں نے بھی دھوتیوں کو لنگوٹ کی طرح مڑھ رکھا تھا۔ ان سب کے بالوں اور بازوؤں اور سینوں پر اس پہاڑ کی سرخ مٹی کی تہہ سی جم رہی تھی جیسے غازہ لگایا ہو۔

چھٹیاں گزارنے کے لیے آنے والا یہ کنبہ بمبئی کے ایک مسلمان سرمایہ دار کی ولا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب خوشی سے اچھلتاکودتا جامنوں کے درختوں کے جُھنڈ میں کیڑے میں سوئی دھاگے کی طرح گزرتی پگڈنڈیوں پر چڑھ رہا تھا۔ درختوں تلے خودرو جھاڑیوں میں اور لمبی لمبی گھاس میں ننھے منے جنگلی جانور کھٹ پٹ کر رہے تھے۔ ایک گلہری نے تیزی سے دوڑ لگائی۔ اچانک اس قافلے میں شامل نوجوان لڑکی کی مختصر چیخ ابھری اور پھر ایک پرمسرّت قہقہہ۔ اس کے عین سر پر سے ایک سیاہ رُو لنگور نے جامن کے ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر بےحد لمبی دُم لہرا کر زقند بھری تھی۔

"ارے لنگور! لنگور!" ان کے قدم راستے ہی میں گڑ گئے۔ سب منہ اوپر اٹھا اٹھا کر تاکنے لگے۔ گہرے دبیز پتّوں کی گھنی ہوئی جالیوں سے جھن جھن کر آتی سورج کی کرنوں کے جال میں بھنوروں کی طرح کالی، رس سے لبریز جامنوں کے گچھوں میں انھیں بیسیوں بیٹھے اور منہ چڑاتے لنگور نظر آئے جو اپنی سفید، مگر پہاڑ کی مٹی سے سرخ، پلکیں جھپکاتے، بڑی بڑی بادامی آنکھوں سے انھیں تاک رہے تھے۔

مراٹھا قلی ہنسا۔

"یہاں ادھر لنگور بہت ہے۔ ان سے بچ کر رہنا صاحب۔ چیزیں اٹھا کر لے جاتا ہے اور... اور پنجہ بھی مار سکتا ہے۔"

مگر بچے لنگوروں کی قربت کے خیال ہی سے خوشی سے بےقابو ہو رہے تھے۔ وہ عمر کے بےخطر مقام پر تھے؛ بڑکی جو ابھی سولہ کی نہ ہوئی تھی؛ نیکر میں پیشاب کر کے رونے والا چیکو؛ اور ککلی جسے سب شیدبالی کہتے تھے کیونکہ اس کے بال گھنگریالے تھے اور چھوٹا تراشنے پر شیدیوں کے بالوں کی طرح گھنڈی دار ہو جاتے تھے۔

اس گروہ کا سربراہ ایک درازقد تنومند سانولا مرد تھا؛ باپ۔ ایک عورت، جسم کے کسی ضروری حصے کی طرح، اس کنبے کے ساتھ لگی تھی؛ گوشت اور خون کے ان پُتلوں کو پیدا کر کے اب انھیں پالنے پوسنے کا کام کرتی ہوئی؛ ان کی حرکتوں پر روتی؛ ہنستی اور پریشان ہوتی ہوئی؛ یہ ماں تھی۔

خوش قطع ولا کا دروازہ کھلتے ہی ان پر اس کے کشادہ اور آرام دہ ہونے کا خوش گوار انکشاف ہوا۔ جلدی جلدی تمام کمروں کے دروازے کھولتے، بچّے دھماچوکڑی مچانے لگے؛ الگ الگ کمروں پر قبضہ کرنے کے لیے دھینگامشتی میں مصروف ہو گئے۔ سب سے اچھے منظر پر کھلنے والی کھڑکی جس کمرے میں تھی، وہاں بڑکی نے فوراً اپنا سوٹ کیس جما دیا اور الماری

Scanned with CamScanner

میں سوٹ کیس سے نکال نکال کر کپڑے ٹانگنے لگی جنھیں وہ دلّی سے استری کر کے لائی تھی، اور پورے سفر کے دوران گڑگڑا کر ان کی استری نہ ٹوٹنے کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ آنے والے پُرلطف وقت کی قوی امید سے اس کا دل گنگنا رہا تھا۔

بس میں آتے ہوئے، اڈے تک پہنچتے پہنچتے اس نے راستے میں کئی خوبصورت لڑکے دیکھے تھے جو انھی کی طرح چھٹیاں گزارنے شاید بمبئی سے آئے تھے اور پہاڑ کے سرخ، تنگ، چکردار راستوں پر گھڑسواری کر رہے تھے۔ قلی جاتے جاتے اس ولا میں رہنے والی، اس کی دیکھ بھال کی ذمےدار آشا کو کھانا بنانے کا سامان خرید کر دینے کے لیے ان سے پیسے لے گیا تھا۔

جب تک آشا مکئی کے تیل میں (جو وہاں وافر مقدار میں دستیاب تھا) پتّوں سمیت مُولی کی بُھجیا، سب طرح کی ملی جُلی دال اور حیرت انگیز حد تک نرم اور ذائقےدار مراٹھی چپاتیاں پکا کر ان کے لیے لائی، بڑکی نہادھو کر، چینز اور بلاؤز پہن کر سورج کی کنکنی دھوپ میں اپنے لمبے سیاہ ریشمی بال سکھا چکی تھی، اور اب اپنا تمتماتا، اشتیاق سے گلابی مکھڑا لیے بس فوراً ان پگڈنڈیوں پر بےنیازانہ چہل قدمی کرنے کے لیے بےتاب تھی جہاں خوبصورت لڑکے گھڑسواری کر رہے تھے۔ وہ اتنی پُرکشش تھی کہ کوئی بھی لڑکا اسے دیکھ کر کم از کم دل ہی دل میں اشتیاق اور حیرت کی سیٹی مارے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ بڑکی بظاہر بےنیازی سے فوراً منھ پھیر لیتی، لیکن خوشی اور اضطراب بیہودی سے کہاں چھپتا تھا! مارے خوشی کے بتّیسی باہر نکلی رہتی۔ اس کی پوری کھلی، شفاف، چمک دار آنکھیں چکرمکر گھومتیں اور میلوں دور کسی ہاتھ پیر سے درست لڑکے کو دیکھ لیتیں۔ ما کی یہ بڑی والی ڈبیں اور حسّاس بیٹی پڑھائی پر بالکل توجہ نہ دینے کے باعث ابھی ابھی دسویں میں فیل ہوئی تھی۔ اس کی سپلیمنٹری آئی تھی۔

تب تک با لمبے سفر کی کسل مندی اتارنے کے لیے مٹی کی مہک سے بھرے کمرے میں نرم گدیلے والے دوہرے جھاڑی بستر پر مدّھم، مَسکی ہوئی خوشبو والی چادروں سے خود کو ڈھانپ کر ایک نیند لے چکا تھا۔ چیکو کے رونے پر اس کی پیشاب والی نکر اتار کر ما اسے بجلی کی راڈ سے بالٹی میں پانی گرم کر کے نہلا چکی تھی، اور اپنی بڑی باجی کے بےفکرےپن کے براہِ راست ردعمل میں چھ برس کی عمر ہی میں کسی اسکول ہیڈمسٹریس کی طرح سنجیدہ، غصیلی اور پڑھاکو بن جانے والی کِکلی کا ہاتھ منھ دھلا کر اسے نئی پھول دار فراک پہنا چکی تھی۔ اب ما خود نہانے جانے والی تھی کہ آشا کھانے کی سینی لیے دروازے پر آ پہنچی۔

پانچوں کی نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ کھڑی تھی وہاں گندمی رنگ کی ایک حسینہ۔ اس نے کام کرنے والی گھالنوں یا پہاڑنوں کی طرح کاشٹے کا لنگوٹ نہیں کس رکھا تھا باقاعدہ ساری پہنے تھی۔ تیس پینتیس کا سِن رہا ہو گا۔ پتلی پتلی بھنویں تھیں۔ بڑی آنکھیں۔ نازک ناک میں البتّہ وہ سبک سا مراٹھی طرز کا ترنج نما زیور ڈالے تھی جو اس کے لبوں کو چُھو رہا تھا۔

"میں ہوں آشا۔" اس نے برتنی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "طاہر بھائی کا بمبئی سے فون آیا تھا۔ آپ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ میں ہی یہاں بنگلے کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔"

"اچھا! اچھا...چھا...! تو آپ ہیں... آشا۔ آئیے آئیے!" ما نے فوراً ریشہ خطمی ہو کر کہا۔

خوشی سے وہ فوری طور پر بےحال بلکہ نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کا یہی حال تھا۔ کوئی بھی اور کیسی بھی عورت ہو، وہ ریشہ خطمی ہو جاتا تھا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر بڑکی نے کوفت سے ہونٹ بھینچ لیے۔ چمک دار، چکرمکر گھرمنی آنکھوں سے با کو تاکا۔ ما نے بھی اس کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور گویا انھوں نے مل کر کہا! "یہ ہو گئے ریشہ خطمی!" اس پر ما اور بڑکی کی ہنسی چھوٹ گئی، جسے انھوں نے فوراً دبا لیا۔ لیکن با کچھ نہ سمجھا۔ وہ سمجھنے کی حالت میں باقی ہی کہاں رہا تھا! ککلی اور چیکو تیز بھوک میں خوشی کی چیخیں مارتے ہوئے کھانے اور پھلوں پر پل پڑے۔ آشا تازہ چپاتی ڈالنے کے لیے باہر چلی گئی۔ ذرا دیر میں جب وہ چنگیر لائی تو ما نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک حسین عورت تھی! اپنے لائے ہوئے سلاد کی ککڑی کی طرح نرم اور لچکیلی، اور اپنی بنائی ہوئی نرم ذائقےدار مراٹھی چپاتی جیسی نمکین۔

کھانے کے بعد با نے فوراً پیش کش کی کہ بچوں کو ما سیر کرانے لے جائے! وہ خود ولا میں کچھ دیر سونا چاہتا ہے۔ صبر اور تحمّل سے ما نے یہ پیش کش مسترد کی، اور چیکو، ککلی اور بڑکی کے بلند آواز مطالبوں کی گونج میں بادلِ ناخواستہ با انھیں سیر کرانے لے گیا۔ کھڑکی سے لگی ما دور تک ان کے ہنسنے اور لنگوروں کی چھلانگوں پر ان کی مسرت بھری چیخوں کی آوازیں سنتی رہی جو پہاڑی کی ڈھلانوں میں گونج رہی تھیں۔

ooo

اب ولا میں خاموشی تھی۔ یہاں اب کوئی نہ تھا۔ دو عورتیں، جدا جدا، اپنے کاموں میں مصروف۔

ما نہائی۔ ولا کے پرانے، ٹائیلز لگے غسل خانے میں بیلی تھی، اور کائی، جسے انھیں کسی نے مدّت سے صاف نہ کیا ہو۔ شاید اس سیزن میں یہ کمرے اور غسل خانے اور الماریاں پہلی بار کھلی تھیں۔ پانی اس کے اداس بدن پر یخ تھا۔ وہ بجلی کی راڈ سے ٹھیک پانی گرم نہ کر پائی تھی اور وقت سے پہلے اسے نکال لیا تھا۔ پھسلتے پیروں سے، ساری لپیٹ کر، ما باہر آئی۔ احاطے میں سہ پہر کی کمزور پڑتی دھوپ پھیلی تھی۔ اس نے احاطے کی وسعتوں پر نظر ڈالی۔ "ارے! یہاں تو ایک جُھولا بھی ہے۔" بچپن کی کوئی امنگ سرک کر اس کے بدن میں سما گئی۔ وہ خوشی سے تیز قدم بڑھاتی جھولے پر جا بیٹھی۔ دائیں طرف، دور، جامنوں کا جُھنڈ تھا جس پر لنگور قلابچیں بھر رہے تھے۔ ما جھولے میں جھولی۔ اس وقت یہاں کوئی نہ تھا، وہ جو دل چاہے کر سکتی تھی۔ مگر انجانی بدن نے امنگ بھرے دل کا ساتھ نہیں نبھایا۔ لمبی اور اونچی پینگ لینے سے ما کا سر چکرانے لگا۔

جھولے سے اتر کر وہ گھاس کے تختے پر بیٹھ گئی جو خودرو سبز چیتھڑوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھری تھی۔ سرخ مٹی میں سبزہ اسے بہت خوبصورت لگا۔ اس نے ولا پر نظر دوڑائی۔ ولا

Scanned with CamScanner

سے متصل دو تین آؤٹ ہاؤسز تھے۔ دو میں تالا پڑا تھا۔ ایک کوٹھری کھلی تھی جس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ آشا اسی کوٹھری میں رہتی تھی۔ ولا کے باورچی خانے کو سنبھالنے کے لمبے چوڑے کام سے بچنے کے لیے وہ اپنی کوٹھری ہی کے چولھے پر ولا میں ٹھہرنے والے مہمانوں کا کھانا بنا دیتی تھی۔

بال سکھاتی ما، ٹہلتی ہوئی آشا کی کوٹھری کی طرف چل دی۔ جانے کیوں اس نے دروازے پر دستک نہ دی۔ شاید وہ کسی ناخوشگوار خیال کی گرفت میں تھی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا، صرف بھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے کھل گیا۔ کوٹھری کے نیم اُجالے میں آشا نے، چولھے کے سامنے بیٹھے ہوئے، اسے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

"اؤ بائی---" اس نے کہا۔

کوٹھری کھولتے ہی ایک لطیف، مگر نہایت واضح سگندھ کا بھبکا جیسے ما کے چہرے سے ٹکرا گیا۔ مہک اتنی سُرعت سے اس کے نتھنوں میں گھُسی، اور اتنی غیرمتوقع تھی، کہ پل بھر کو ما نے جھٹکے سے سر پیچھے کیا جیسے سچ مچ کسی چھوٹی جانے والی شے سے چہرہ بچاتی ہو۔ یہ ایک مَسکی ہوئی خوشبو تھی جس میں گرم مسالوں اور باسی پھولوں کے ساتھ مٹّی کی دھانس شامل تھی، اور جو شاید اپنی لطافت کے باعث حیرت انگیز طور پر خوش گوار ہی گئی تھی۔

کوٹھری کے مدّھم اجالے میں ما نے قدم بڑھایا۔ یہ کوٹھری عمودی لمبان میں بنائی گئی تھی اور بالکل سادہ سی تھی۔ حالانکہ یہ ولا کا حصہ تھی، لیکن اس کی بناوٹ کسی جھونپڑی کی طرح تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ تین پتھروں کا چولھا بنا دیا گیا تھا (جیسا پورے ہندوستان میں ہزاروں برسوں سے چلا آ رہا ہے) جس کے پاس راکھ بکھری تھی۔ ساتھ برتی بھانڈے دھرے تھے۔ مٹی کے کونڈے میں ہلدی کی گانٹھیں اور لہسن پیاز رکھا تھا۔ بانس جوڑ کر کوٹھری میں پارٹیشن سا کھڑا کر دیا گیا تھا جس نے کھانا پکانے کے حصے کو باقی کی کوٹھری سے جدا کر دیا تھا۔ پارٹیشن سے پرے ایک کھاٹ پر آشا کا بستر بچھا تھا۔ دیوار کے ساتھ اوپرتلے ٹین کے دو تین صندوق تھے جن کے اوپر دیوار کی کیل میں ٹنگا آئینہ تھا اور اس کے بالکل ساتھ سات رنگوں کی دھنک میں رنگی معصوم سی سونڈ والے گنیش جی کی مورتی دیوار پر آویزاں تھی۔

وہ آشا سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی جیسی دو عورتوں میں آپ ہی آپ نکل آتی ہیں۔

"جب مہمان نہیں ہوتے تب میں بیڑیاں بناتی ہوں۔" اس نے ما کو بتایا اور بانسوں کی جالی میں اُڑسا اپنے کے پتوں کا گٹھا دکھایا۔ اس کے ساتھ بانس کا ایک کھوکھلا تنا دیوار کے سہارے ٹکا تھا۔ اتنا گھیردار بانس ما نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ (ما نے تو بانس ہی ٹھیک سے اور غور سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ بانس کو کسی نہ کسی چیز میں لگا ہوا ہی دیکھا تھا جس پر کوئی غور نہیں کرتا۔ ما نے حیرت سے اس ستون جیسے کھوکھلے نباتی عجوبے کو دیکھا جسے برتی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا!)

"پانی کتنی ہوتا ہے اِدھر ما؟" آشا نے کہا۔ "آج آپ سب نے سنان کیا۔ ایک دم کھلاس ہو گیا۔ پینے کا پانی میرے گھڑولے سے لے لینا۔ ٹنکی دن میں ایک بار چلتی ہے۔ ٹنکی چلانے والا

سواجی سویرے آئے گا۔"

(تھوڑی دیر بعد، باتوں ہی باتوں میں، ما کو معلوم ہوا، لم ٹرنک سواجی صرف سویرے ہی نہیں، رات کو بھی آتا ہے۔ ٹنکی چلاتے نہیں، پہاڑ کی ٹھنڈی رات میں آشا کے سنگ سونے۔ لیکن جب بنگلے میں مہمان ہوں تو پھر اس کو مشکل پڑتی ہے۔)

آشا کا کوئی بچّہ نہ تھا۔ اس کا شوہر تھا یا نہیں یا کہاں گیا، اس بات کو وہ بالکل گول مال کر گئی۔

"ہاں تھا وہ الوتےدار بلوتےدار۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"ہاں؟" ما نے حیرت سے ہونٹ پر انگلی دھر کر پوچھا۔

"ترکھان تھا۔"

پھر ما کو پتا چلا۔ یہاں الوتےدار بلوتےدار کاریگر کو کہتے ہیں۔ مراٹھی محفورے میں فارسی کی جڑاوٹ سے وہ پہلے کافی چکرائی۔ پولیس والوں کو معاملت دار کہتے تھے، زمین داروں کو کھاتے دار۔ لیکن مراٹھے تو اپنے بادشاہ کو بھی پیشوا کہتے تھے۔ وہ دل میں ہنسی۔ تاریخ داں اس بات پر حیران تھے۔ مغلوں سے جتنا لڑتے تھے، اتنی ہی فارسی بولتے، گویا جل جل کر۔

(بعد میں کسی نے اسے بتایا۔ برسوں پہلے آشا کا آدمی چلا گیا تھا۔ بمبئی۔ فلم ایکٹر بننے۔ کسی نے اس سے کہا تھا وہ بہت سُندر ہے، ہیرو بن جائے گا۔ پھر اس کی کوئی خبر ہی نہ آئی۔)

آشا پڑھی لکھی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی پہاڑ پر بوجھا ڈھوتی پہاڑنوں سے زیادہ مہذّب معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک دبیں عورت تھی۔ اس نے ما کو بتایا کہ وہ طاہر بھائی کے ساتھ کئی بار بمبئی ہو آئی ہے۔ کچھ مہینے تک اس نے بمبئی میں طاہر بھائی کی فیملی کی خدمت گزاری بھی کی ہے۔ وہ باپ کی وجہ سے واپس آ گئی جو ابھی زندہ ہے اور نیچے کہیں ترائی میں رہتا ہے۔ بمبئی میں طاہر بھائی کا شاندار بنگلا تھا۔ ان کا عطر کا کاروبار تھا۔ ما اور با کی طاہر بھائی سے ملاقات دراصل طیّب بھائی کے ذریعے ہوئی تھی۔

ما اور با اسّی کی دہائی میں کسی نہ کسی سنکٹ میں پڑ کر پڑوسی ملک پاکستان سے بھٹکتے اِدھر آ نکلے تھے۔ وہ دلّی میں رہ پڑے تھے۔ یہ دو سیاسی جیوڑے تھے۔ رفتہ رفتہ یہاں ان کے ہم خیال دوستوں کا وسیع حلقہ بن گیا تھا۔ ان میں کتنے ہی کمیونسٹ تھے۔ طیّب بھائی ایک جیّد عالم اور سیاسی کارکن تھے۔ وہ ہندو مسلم فرقہ واریت کے خلاف تقریباً کل وقتی تحریک چلاتے تھے۔ اب سوئےاتفاق دیکھیے کہ ان کا تعلق اُدے پور میں گڑھ رکھنے والے ایک چھوٹے سے مسلمانوں کے فرقے سے تھا۔ کسی جن کی طرح وقت نکال کر وہ اس فرقے کے پیشوا کے ظلم و ستم کے خلاف ایک اصلاحی تحریک بھی چلاتے رہتے۔ ان کے زیادہ تر دوست اس حرکت سے عاجز رہتے۔ روشن خیال مسلمانوں کا، اور ہندوؤں کا بھی، خیال یہ تھا کہ ایک چھوٹے سے، رائی جتنے فرقے کو کیوں چھیڑا جائے۔ بھئی کرنے دو جو ان کا دل چاہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

"طیّب بھائی،" ما پیار سے کہتی۔ "آپ کا بنیادی کام اتنا اہم ہے۔ آخر کیوں آپ اپنے فرقے کی اصلاح کے پیچھے پڑے ہیں؟ خواہ مخواہ اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں؟"

طیب بھائی کے سینکڑوں ہندو مسلمان سکھ پرستار ایسا ہی کہتے۔ کسی کو بھی اس فرقے کی اصلاح سے دلچسپی نہیں تھی۔

بچوں کی سی معصوم شکل والے طیّب بھائی کھچڑی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے، گول مٹول سے چہرے کو دائیں بائیں گھماتے، عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے بڑی بڑی سیاہ گجراتی آنکھیں اور بھی پھیلا کر کہتے؛

"یہ لیجیے! اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو سب سے اہم مشن ہے۔ اس فرقے کی اصلاح تو سب سے زیادہ ضروری ہے۔"

سب لوگ اپنا سا منھ لے کر رہ جاتے۔

طاہر بھائی عِطر والے اسی اصلاحی تحریک کے حمایتی تھے۔ تگڑا ٹیکس وصول کرتے تھے اس فرقے کے پیشوا، اور جو نہ دے سو برادری باہر۔ سنا ہے قبرستان میں دفن ہونے کی جگہ بھی نہ دیتے تھے۔ (سارے چھوٹے فرقوں کی طرح ان کے فرقے کا بھی علیحدہ قبرستان تھا۔)

"ارے تو لعنت بھیجیے،" لوگ کہتے۔ "عام قبرستان میں دفن ہو جائیے۔" (لوگوں کا مطلب ہوتا تھا کہ اپنے مُردوں کو عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیں۔)

وہ بےبسی سے منھ دیکھتے۔ "آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ یہ تو ایسا ہے کہ گویا... اب کوئی مسلمان اپنے مولوی جی سے ناخوش ہو تو آپ کہہ دیں؛ تو بھئی سیدھے سادھے چتا کیوں نہیں جلا لیتے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظلم کیوں برداشت کریں۔"

اصل بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی اس فرقے کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا جو راجپوتانے سے کسی سامری عمل سے گجرات تک جا پہنچا تھا۔ طیّب بھائی کے چکر میں کتنے ہی عام مسلمانوں نے اس کے موجودہ پیشوا کی ظلم کی داستانیں صبر اور تحمّل سے سنی تھیں اور تاسّف سے "چہ چہ" کہا تھا۔ کس طرح وہ دین کے بنیادی مثالی اصولوں سے بھٹک کر گمراہ ہو رہے ہیں۔ طیب بھائی کے منھ پر کون کہتا کہ عام مسلمان اس فرقے ہی کو صریحاً خواہ مخواہ سمجھتے ہیں۔

"کیا ضرورت تھی بھئی؟" وہ چپکے چپکے آپس میں کہتے۔ "ختم کریں یہ احمقانہ پالٹکس۔ اصل مقابلہ کفّار سے ہے۔ اب سب کے سامنے اپنے گندے کپڑے دھونا! لاحول ولا..."

مگر طیب بھائی سے کوئی کیا کہتا! طیب بھائی نمازی تھے، پنج وقتہ۔ (اپنے فرقے کے مطابق ادا کرتے تھے۔) اور مسلم نشاۃ ثانیہ کے لیے رات دن ایسے جی توڑ کر محنت کرتے تھے کہ عام مسلمان دیکھنے سے اپنی کم مائیگی اور کم عملی پر شرمندہ ہی ہو سکتے تھے۔

طاہر بھائی کا ذکر سن کر، آشا سے باتیں کرتے کرتے، یہ سارے خیال ما کے ذہن سے آہستہ رفتار لہروں کی طرح گزرے۔

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اٹھتے اٹھتے ما سے رہا نہ گیا۔ وہ ایک تردّد میں مبتلا تھی۔ با کے ریشہ خطمی ہونے سے اس انجان پہاڑی مقام پر کسی ناخوشگوار صورت حال سے خود کو، اور اپنے پورے کنبے کو (بشمول با)، بچانا چاہتی تھی۔ اس تردد کے ہاتھوں ہار کر اس نے آشا سے کہا؛

"بچوں کے با ذرا... ریشہ خطمی ہیں۔"

آشا نے اسے سادگی سے دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں گہری ہو گئیں۔ اس نے غور کیا کہ ما کے لہجے میں غصّہ یا جلن نہیں تھی۔ بس ایک گہری اور طویل تھکن!

وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر کالی لمبی پلکیں جھپکائے بنا، اس نے ما سے عجب بےخوفی سے کہا؛

"مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے بائی۔ مرد کتّا ہے! آپ کیوں پھکر کرتی ہے؟ مرد لوگ ادھر اُدھر ڈبکی لگا لیتا ہے۔ اس کا کچھ گھس تو نہیں جاتا، اور نہ عورت کا کچھ گھس جاتا ہے۔ دونوں جیسے کے تیسے رہتے ہیں۔"

"نہیں، میں فکر نہیں کرتی،" ما نے کچھ بددلی سے ہنس کر کہا۔ "مگر... میں نے تمھیں بتا دیا ہے۔"

"ضرورت نہیں تھی،" آشا نے کہا۔ "میں کیا آدمی کی آنکھ نہیں پہچانتی؟ مگر... آپ پھکر نہ کرو۔"

ما اس سے رخصت ہونے لگی۔ کھلے دروازے میں اس نے مڑ کر کہا؛ "اچھا میں چلتی ہوں،" لیکن اس کا دھیان بٹ گیا۔ سورج اب دروازے کے عین سامنے آ گیا تھا۔ کھلے دروازے سے داخل ہونے والی لمبی ترچھی کرنوں نے کوٹھری کی دیوار روشن کر دی تھی۔ ما کی نظریں دیوار پر جم کر رہ گئیں جہاں قطار میں ان گنت نقش و نگار بنے تھے۔ انتہائی عجیب و غریب، مستطیل اور مثلثہ چھ پتّوں والے پھول جن کا زرگل کا حصّہ اتنا چوڑا تھا کہ پھول سورج معلوم ہو رہا تھا؛ کئی قسم کے ہلال، یا شاید وہ خم کھائے ہوئے سینگ ہوں؛ مچھلی، مچھلی کے کانٹے جیسا بک جو ہندی کی "ٹ" سے مشابہ تھا۔ ما اچانک حیرت کے ریلے میں انھیں دیکھتی رہ گئی۔ "یہ کیا ہیں؟" اس نے بےاختیار پوچھا۔

آشا ہنسی۔ "دیوی دیوتا ہیں ما۔"

کسی اسپاٹ لائٹ کی مانند گھستی سورج کی شعاعوں میں ما حیرت سے تکتی رہ گئی۔ اسے مور کا پنکھ نظر آیا۔ اسے جو نظر آیا وہ ہوبہو آم جیسا تھا۔ آم! آم دیوتا ہے! لنگڑا ہو کہ سندوری؟ اس کے دل نے ہنس کر سوچا۔ آم میٹھا ہوتا ہے۔ میٹھا ہی تو نہیں، خوشبو بھی تو غضب کی۔ مرزا غالب کو پسند تھا آم۔ اس کا دیوتا بن جانا کیا برا تھا۔ شاید آم لوگوں کا پیٹ بھرتا ہو، اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا مہاراشٹر کا آم جہازی سائز کا ہوتا ہے؛ ایک آم دو جنوں کی ایک وقت کی خوراک کے لیے کافی۔ اتنا سرخ کہ سیاہ لگتا تھا۔ سیاہ آم۔ الفانسو! دلی میں تو پچاس روپے کا ایک ملتا ہے۔ اس کے دل نے آم کو پرنام کیا۔ ایک ہنسی بھرا پرنام۔ "میٹھے ہوں اور بہت ہوں،" ما نے دل ہی دل میں کہا، اور بمبئی کا سوچا جہاں میرٹھ کا باسی فلم ایکٹر

بھارت بھوشن مرزا غالب کا سوانگ رچاتا تھا اور بہت حسین غالب نظر آتا تھا۔ (ما میرٹھ کی تھی۔)

پھیکے گیرو سے بنے ان نقوش کو مسحور ہو کر دیکھتی، جنھیں — پہر کی روشنی نے کوٹھری میں گھس کر اچانک دمکا دیا تھا، آخر وہ آشا کو اس کے دہلیز سے قدم پیچھے ہٹانے یا دوبارہ اندر آنے کا منتظر دیکھ کر کچھ شرمندہ ہو گئی اور واپس جانے کو مڑی۔ میں انھیں پھر کبھی آ کر تفصیلاً دیکھوں گی، اس نے سوچا۔ جاتے جاتے آشا نے دھیرے سے کہا،

"رات کو ورانڈے کی پرلی والی بتّی دس بجے تک گل کر دینا بائی۔ نہیں تو... سواجی سردی میں کھڑا رہے گا۔"

ما مسکرا کر "اچھا" کہتی ہوئی اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ مسکرا تو وہ دی تھی لیکن اب اسے اور فکر لگ گئی۔ با کی کہیں پٹائی نہ ہو جائے۔ وہ کمرے میں بستر پر بیٹھی کچھ دیر ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے سوچتی رہی۔

پھر اسے خیال آیا۔ چیکو کے نہانے کا پانی ٹھیک سے گرم نہیں ہوا تھا۔ چیکو کو کہیں زکام نہ ہو جائے۔ بڑکی کی نظر کسی لڑکے پر نہ جا پڑے۔ یہ بات بھی یقینی تھی اور خاصی کوفت کا باعث۔ اور ککلی؟ بس ککلی ہی تو ٹھیک تھی۔ چھٹیوں تک میں ہوم ورک کرنے کے لیے بستہ ساتھ لائی تھی۔ اس کی ننھی ہیڈماسٹریانی! اسے کبھی کسی پریشانی میں نہ ڈالنے والی اس کی چھوٹی سی شبدبانی! دل ہی دل میں ککلی کو پیار کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ سفر سے تھکی ہوئی ما فوراً نیند میں ڈوب گئی۔ بستر اس کے لیے جیسے ایک جزیرہ تھا۔ باہر — پہر کی تیز پہاڑی ہوا میں جامنوں کے پتّے اور سرخ غبار اڑ رہا تھا۔ ما کے سپنے میں سواجی لنگی والا با کے پیچھے کوئی خطرناک ہتھیار اٹھائے دوڑ رہا تھا۔

000

رات پڑ چکی تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔

ولا کے گول کمرے سے اس کے کنبے کی باتوں اور ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ کسی وقت یہ لوگ واپس آ گئے تھے۔

ما نے دروازہ کھولا اور ورانڈے میں قدم رکھا۔

جیسے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جائے! اس کے چاروں طرف آتش بازی سی چھوٹ رہی تھی۔ جہاں تک نظر دیکھ سکتی تھی، گہرے اودے اندھیرے میں، دور دور تک جگنوؤں کے جمگھٹ کے جمگھٹ اڑ رہے تھے، ناچ رہے تھے۔ ان سے ایک غیرارضی قسم کی سبز روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دور دور تک پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ جگنوؤں کے دَل کے دَل! سینکڑوں، ہزاروں، سوئی کی نوک جیسی باریک، چمکتی روشنیاں، ہر طرف اڑتی ہوئی!

آنکھیں پھاڑے ما دیکھ رہی تھی۔ پہاڑ پر اتنے جگنو کہاں ہوتے ہیں؟ یہاں کے گرم مرطوب

موسم کی وجہ سے ہو گئے اتنے جگنو! اور ان کا یہ رنگ! یہ سبز کیوں؟ پتوں کا عکس کیا؟ یا پتّے کھا کھا کر ایسے ہو گئے؟ ما کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ مبہوت ہو کر اس منظر کا سحرخیز حسن دیکھ رہی تھی جس نے اسے پل بھر کو دنیاومافیہا سے غافل کر دیا۔ جب ہوش آیا تو تیزی سے پلٹ کر اس نے گول کمرے کی کھڑکی پہ ہاتھ مارا اور چلائی، "جگنو!"

دروازہ بھڑاک سے کھول کر سب لوگ باہر دوڑے آئے۔ پل بھر کو حیرت کی مورت بنے فطرت کے اس عجوبے کو دیکھا کیے۔ راتری نے جادو کی کوئی چھڑی چھو کر پورے منظر کو کیا سے کیا بنا دیا تھا!

پھر وہ کلکاریاں مارتے، تالیاں بجاتے، احاطے کے میدان میں پھیل گئے، جیسے جگنوؤں کی بارش میں نہاتے ہوں۔ وہ دور دور تک جگنوؤں کے پیچھے دوڑنے لگے۔ جگنو ان کے بالوں میں الجھ رہے تھے، ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں اور بانہوں پر چیک رہے تھے۔ بچوں کے ہنگامے سے جامنوں کے خاموش، برگزیدہ، موٹے ٹہنوں میں سوئے ہوئے لنگوروں کی نیند ٹوٹ گئی۔ لنگور بڑبڑانے اور چڑچڑ کرنے لگے۔ لنگوروں سے ڈر کر بچے واپس دوڑے۔ اپنے کپڑوں اور بالوں میں جگنوؤں کی افشاں سی چُنے ہوئے۔

کوٹھری کے دروازے سے لگی آشا جھانک رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ "اندر جاؤ اندر... لنگور کاٹ لے گا۔"

وہ سب جلدی سے گول کمرے میں گھس گئے۔ بجلی کی کمزور روشنی میں آتے ہی جگنوؤں کی چمک ناپید ہو گئی۔ اب تو وہ بس بھورے بھورے کیڑے تھے۔ سب سے زیادہ جگنو بڑکی کی بانہوں اور گردن پر چپٹے تھے۔ سب سے زیادہ اونچی چھلانگیں وہی لگا رہی تھی، لمبی بانہیں چاروں طرف لہراتی۔ اب جگنو اس کی قمیص میں گھسے پھرپھرا رہے تھے۔

اوں! آ! اوہ۔ تھت تھت تھت..." بڑکی بلبلا کر گیند کی طرح اچھلتے اور اپنے بدن پر تابڑتوڑ ہاتھ مارنے لگی۔ ما نے اچھلتی لڑکی کو غور سے دیکھا، "یہ کیا حرکتیں کر رہی ہو؟"

ما نے بڑکی کو ڈانٹا۔ کون کہے گا یہ سولھویں میں لگی ہے! اس نے دل ہی دل میں متھے پر ہاتھ مارا۔

"جاؤ باتھ روم میں جا کر کپڑے جھاڑو!" اس نے بڑکی کو حکم دیا اور خود ککلی اور چیکو کے کپڑے اتار کر جھاڑنے لے چلی۔ پھر اس نے آواز دی۔ "با!"

با ابھی تک ورانڈے میں کھڑا جگنوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ آشا کی کوٹھری کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ما کو یاد آیا۔ ارے ورانڈے کی بتّی۔ پرلی والی بتّی کہا تھا نا آشا نے؟ کھڑکی سے جھانک کر اس نے اطمینان کر لیا۔ بتّی کسی نے جلائی ہی نہیں تھی جو بجھائی جاتی۔

یوں ہی ڈبکی لگا لیتے ہیں۔ کچھ گھس تھوڑا ہی جاتا ہے۔ ما نے یاد کیا۔ ایک عورت کے منھ سے یہ بات سن کر اس کی اندر کی آتما ہنس دی تھی۔ اس جملے کی پھکڑ ذومعنویت بھی پی گئی تھی۔ آشا کی روح نہیں ہے کیا؟ ما نے سوچا۔

Scanned with CamScanner

روح اور بدن کی یکجائی کے چکر میں نہیں پڑتی کیا وہ؟ جس میں خود اس نے ساری عمر بِتا دی۔ یا گنوا دی؟ اس زمین کے پراچین کالوں کا کہیں پڑھا خیال اس کے دماغ میں گونجا۔ "شے میں جو کچھ نہ گھٹتا ہے، نہ بڑھتا ہے، نہ متغیّر ہوتا ہے، سدا پُرسکوں اور شانت، وہ ذی روح ہے۔ جو کچھ بڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، جنم لیتا اور جنم دیتا ہے، وہ ذی روح نہیں۔ وہ سوچ نہیں سکتا۔" وہ دل میں ہنسی۔ مجھ میں مادہ نہیں ہے کیا؟ جو سوچ نہ سکے؟ بس یوں ہی، بِناسوچے، ماس کا لطف لے سکے، اور دے سکے؟ ہو گا تو ضرور... اس نے سوچا، کہیں روح کے مساموں میں پھنسا ہوا۔ کوئی گہرا اداس اندھیرا اس کے اندر ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تب ہی چیکو رویا۔ ما اپنی سوچوں کے سفر سے واپس لوٹ آئی۔

— پہڑ کی بےوقت نیند لے کر، اس کا دماغ الجھا الجھا سا تھا۔ اس دھندلکے میں اس نے آشا کی باتُ ٹھیک سے سمجھنے کی دوبارہ کوشش کی۔ اسے آشا کی پُرسکوں، مسکراتی آنکھیں یاد آئیں۔ "مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے۔" اور "تم فکر مت کرو۔" کیا مطلب تھا اس کا؟ ایک مطلب تو یہ ہو سکتا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا، تم فکر نہ کرو۔ اور دوسرا مطلب... دوسرا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے، تم فکر مت کرو۔

اچھی خاصی سمجھ رکھنے والی ما، ان جملوں کو آگے پیچھے کر کر کے آشا کی بات کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اسے اپنی حماقت پر زور کی ہنسی آئی۔ بچّے کپڑے پہنتے پہنتے ما کی طرف منھ اٹھا کر دیکھنے لگے۔ کیوں ہنس رہی ہے؟ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بنا کچھ سمجھے ہنسنے لگے۔ آپ ہی آپ۔ ما نے انھیں بھینچ بھینچ کر پیار کیا، دونوں کو ان کے کمرے میں جدا جدا بستروں پر لٹا دیا۔ ساتھ سونے سے لڑتے تھے دونوں۔ ایک دوسرے کا تکیہ گھسیٹ لیتے تھے۔

رات دیر گئے... سب اپنے کمروں میں۔ برسوں پرانی بنی ولا میں بند کمروں کی مسکی خوشبو میں تیرتے، ڈھیلی پڑی اسپرنگوں والے گدوں پر، موہوم سی فنائل کی مہک والی رضائیوں میں، ایک دیوقامت ڈبل بیڈ پر ما، با کے ساتھ۔

خاموشی۔

"کہاں گئے تھے؟"

اس نے با کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"بازار۔"

انھوں نے بتّی بجھا دی تھی۔ دو جگنو بچوں کے کپڑوں سے نکل کر بھٹک کر کھڑکی کی کگر تک آ گئے تھے۔ دو سبز جگنو دیر تک جھلملاتے رہے۔ ما انھیں دیکھ رہی تھی۔ ما کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ دیر تک جاگی۔ دیر تک جگنو جھلملاتے ہوئے پورے کمرے میں گھومتے رہے۔

ooo

ایک دم اُجالا۔ جیسے سورج پہاڑ کے پیچھے چھپا، بےچین اور منتظر بیٹھا تھا اور چھلانگ مار کر نکل آیا تھا۔ رات ما کی نہ جانے کب آنکھ لگی تھی اور کب وہ پھر جاگ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سوئی ہی نہ ہو۔ با ابھی تک پڑا بےخبر سو رہاتھا۔ بچوں کے کمروں میں بھی خاموشی تھی۔ ما جلدی سے ساڑی لپیٹ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

باہر خوب اُجالا پھیل چکا تھا۔ آشا ولا کے کچن میں کھٹرپٹر کر رہی تھی جہاں شہر سے لوٹ کر بڑکی اور با نے ساتھ لایا ہوا سارا سامان پھیلا دیا تھا۔ سبزیاں، پکانے کا تیل، مرچ مسالے، رسوئی کا سارا بکھیڑا۔ آشا انھیں سنگوا رہی تھی۔

"چلو نیچے چلتے ہیں۔" ما اسے اصرار سے اپنے ساتھ نیچے لے چلی۔ "ان کے جاگنے سے پہلے لوٹ آئیں گے۔"

اب وہ لنگوروں سے اتنی گھبرا نہیں رہی تھی۔ جیسے سمجھ گئی ہو۔ انھیں نہ چھیڑو تو یہ کچھ نہیں کہیں گے۔ جامنوں کی شاخوں کا، تنوں کا سہارا لیتی، تقریباً پھسلتی، وہ آسانی سے، تیزی سے پہاڑی سے نیچے اتر آئیں۔ نیچے تو سب دنیا جاگ پڑی تھی۔ پہاڑی کی گھڑسواری کے قابل سڑکیں آباد ہو گئی تھیں۔ نیچے ہی بس کا اڈّا تھا۔ ایک تھڑے سے ما اور آشا نے صبح کا پہلا پہلا چائے کا گرم پیالا پیا۔ چائے اتنی میٹھی تھی کہ ما کے ہونٹ چپک گئے۔ "بہت سستی ہے شکر یہاں۔" آشا نے کہا۔ یہ گنّوں کا علاقہ تھا۔ ترائی میں میلوں تک گنّے کے فارم تھے۔ "میرے چھوٹے ہوتے تو۔" آشا نے کہا۔ "گڑ کی بھیلی بھی نہیں ملتی تھی۔"

ما نے کتنی ہی سیّاحوں سے دعاسلام کر لی۔ زیادہ تر چھوٹے اسٹیشنوں سے آئے تھے۔ اور کچھ بمبئی سے۔

ما کو تعجب بھری ہنسی آئی جب اسے لگا، الوتےدار ملونےدار بھلے ہی فارسی کی کوئی بگڑی ہوئی ترکیب ہو، پھر بھی اس مراٹھی پہاڑی اسٹیشن پر ہر پورے عمر کے مرد کا نام سواجی ہی تھا۔ مراٹھی ماؤں کو دوسرا کوئی نام نہیں سوجھتا!

لنگی والا سواجی، گھوڑوں والا سواجی۔ اور چائے کی دوکان والا سواجی۔ حالانکہ گھنے جنگلوں میں گھسی اس پہاڑی پر سواجی مرہٹے کے گھوڑوں کے سُم نہ پڑے ہوں گے۔ ڈیڑھ سو برس پہلے تک یہاں سوری ہندو تہذیب بھی نہ پہنچی تھی۔ جو کچھ لوگوں سے باتیں کر کے اس کے پلّے پڑا تھا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پہلے یہاں آدی واسی رہتے تھے، ہندوستان کے قدیم انسان جنھیں مار بھگا کر انگریزوں اور شہری لوگوں نے سو ڈیڑھ سو برس پہلے یہ تفریحی مقام آباد کر لیا تھا۔

جب وہ پہاڑ پر ملنے والے اصلی مرغی کے اصلی انڈوں کا اور توے پر سکی ڈبل روٹی کا اور اصل دودھ کا ناشتہ کر چکے تھے تب ما کو پتا چلا۔ جو کچھ نہ ہونا تھا سب ہو چکا تھا۔

(ما کو پہلے ہی پتا تھا۔)

چیکو کو زکام تو نہیں ہوا تھا مگر اس کی ران پر کسی کیڑے نے کاٹ کھایا تھا۔ کاٹنے کا

نشان سرخ سرخ ددوڑا بن کر پھیلتا جا رہا تھا۔ کسی زہریلے کیڑے کے خیال سے ما کا دل سہم گیا۔ ہائے میری ماں! اب یہاں ڈاکٹر کہاں ہو گا!

با بھی سہم گیا۔ "ہے ڈاکٹر۔ اسٹیشن کے پاس۔ ڈاک خانے کے پیچھے۔ فرینش کی ڈسپنسری ہے۔" با منھ ہاتھ دھوئے بنا، چیکو کو کندھے پر لاد کر، ڈھلان پر جما جما کر قدم دھرتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا، دو پہاڑیاں پار بازار کی سمت چل دیا۔ سمجھ دار چیکو نے دونوں بانہیں با کی گردن میں ڈال کر مضبوط حلقہ بنا لیا تھا اور اپنا سر با کی گردن اور شانے کے خم میں مضبوطی سے جما دیا تھا۔ جامن کی ٹہنیوں پر لنگور چرچرائے اور سرعت سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر منتقل ہونے لگے۔

بڑکی کی نظر لڑکے پر پڑ گئی تھی۔ منھ سے ڈبل روٹی کے ذرے جھاڑ کر، خوشی سے بےقابو ہوتے ہوئے، ہنستی چمک دار آنکھیں میچ کر، اس نے ما کی گود میں سر رکھ دیا۔

"رمیش نام ہے اس کا... رمیش سنگھ۔ ما، اس قدر اسمیشنگ ہے کہ کیا بتاؤں! ہی کام میں پڑھ رہا ہے۔ انگریزی ذرا کمزور ہے۔ اپنے ڈیڈی کے ساتھ آیا ہے۔ اور تیسری پہاڑی پر ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ رائیڈنگ کرتا ہے۔ گھوڑا اپنا ہے۔ اس کا اپنا۔ وہ ہر سال یہاں آتے ہیں اس لیے گھوڑا خرید لیا۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"کہاں مل گیا تجھے؟" ما نے اترے منھ سے پوچھا۔

"میں نے تو کل ہی دیکھ لیا تھا۔" بڑکی نے جھٹ سے کہا۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ رومانی لہجے کے بجائے وہ بالکل سمجھ داری سے مستعد اور ہنرمند لڑکی کی طرح باتیں کرنے لگی۔ "وہی جو سفید گھوڑے پر تھا۔ آپ نے نہیں دیکھا تھا؟ بس کی کھڑکی سے؟"

ما نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ما کو کچھ نظر ہی کہاں آتا تھا! مسکراہٹ ضبط کرتی، وہ بڑکی کو تکتی رہی جو اس کی گود میں پڑی تھی۔

"با کی نظریں بچا کر تو نے اتنی ساری باتیں اس لڑکے سے کیوں کر کر لیں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"گوشت کی دکان میں گئے تھے با۔" بڑکی کی ہنسی پھر باہر آ گئی۔ اس نے پھر آنکھیں میچ لیں اور شدید رومانی ہو گئی۔ کچھ روتی اور کچھ ہنستی ما نے بڑکی کا سر سہلایا۔ "تو پھر؟"

"پھر کیا؟" بڑکی جھٹ پٹ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ "تو بینکی بینکی؟

"وعدہ؟" ما نے کہا۔

"ہنڈریڈ پرسنٹ۔" بڑکی نے فوراً ما کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھانی شروع کر دیں۔

"دیکھ بڑکی؟" ما نے کہا۔ "اگر تم رائیڈنگ پر جاتے ہو اور یہ رمیش لڑکا بھی جاتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ تم سب۔ یعنی چیکو، کنکلی، اور تم، اور با؟"

بڑکی کا منھ اتر گیا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔

"اور تو اپنی کتابیں تو لائی ہے نا؟ زولوجی؟ اور میتھس؟ جن میں زیرو انڈا ملا ہے؟ روز دو گھنٹے ضرور پڑھنا ہے۔"

"لائی ہوں۔" بڑکی نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے لگی۔

"رمیش کی انگریزی... کمزور ہے اس کی انگریزی۔ میں اسے پڑھا نہ دیا کروں؟ ہر روز دو گھنٹے؟" اس نے بہت فکرمند منھ بنا کر پوچھا۔

"نہیں؟" قطعیت سے ما نے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بڑکی کی آنکھوں کے نیچے، انگلیاں نچا کر کہا۔

"یہ دیکھتی ہے یہ کیا ہے؟ میرے ناخوں، کیا ہے ان میں؟"

"کیا ہے؟" بڑکی نے آنکھیں پھاڑیں۔ وہ بور ہو گئی تھی۔

"تیری چالیں! میرے ناخنوں میں ہیں یہ چالبازیاں تیری۔ دو گھنٹے تک تم خود پڑھو گی۔ کیا سمجھیں؟" اس نے مصنوعی غصّے سے بڑکی کو ڈانٹا۔ بڑکی سہم گئی۔

کنکلی نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔ اسے نہ آنا چاہیے تھا، مگر آ گئی تھی۔ اس نے ما کا آخری جملہ سن لیا تھا۔ وہ ما کے پیچھے چپ چاپ چلتی آئی اور اپنے حصّے میں آئی الماری ٹٹولنے لگی۔

ما کرسی پر بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔

با ابھی تک نہیں آیا۔ چیکو کی دوا ملی کہ نہیں! بڑکی کو پڑھائی کے لیے وہ یوں ہی یاد نہ دلاتی تھی۔ چھٹیوں کے فوراً بعد امتحان ہیں۔ اس تندرست لڑکی کو جیسے کسی وہیل چیئر پر بٹھا کر، دھکا لگا کر دسویں سے نکالنا تھا۔ با کو آشا کے ساتھ متھا مارنے سے کسی نہ کسی طرح روکنا تھا۔ پھر اس کی نظر کنکلی پر پڑی۔

سانولی ننھی شیدیانی، پوری سنجیدگی سے، اپنے چھوٹے سے وجود کی ساری توجہ مجتمع کیے کاپی پر جھکی ہوم ورک کر رہی تھی۔

خوشی اور تشکر سے ما کی آنکھ میں پانی آ گیا۔ "کنکلی! تو ہی تو ہے نا ایک، مجھے کبھی نہ ستانے والی!" کنکلی کی توجہ نہ توڑنے کی خاطر ما نے دل ہی دل میں اسے پیار کیا۔

منگل کے دن (ما کو پتا چلا) پہاڑ کے کھلے، آسمان تلے پھیلے بازار میں ترائی سے آنے والے دیہاتوں کا میلا لگتا تھا۔ زمین پر کپڑا بچھا کر انھوں نے اپنے منکوں کے ہار اور کنگھیاں، کھڈی پر بنے کمبل، لاکھ کے بنے ٹکلیوں‌دار زیور، جن پر چاندی اور دوسری دھاتوں کی پتریاں چڑھائی گئی تھیں، اور چھوٹے بڑے دیوی دیوتاؤں کی، لکڑی، پتھر اور مٹی کی مورتیاں سجا رکھی تھیں۔ ڈھلانوں سے اترتی اور پہاڑی کے پیچ و خم کے ساتھ گھومتی ان گنت زمینی دوکانیں، جو جیسے کسی جادو سے موجود ہو گئی تھیں اور کسی جادو سے جنھیں دوسرے دن غائب ہو جانا تھا۔ بھاکری دال موٹھ کے خوانچے، چائے کے ٹھیلے۔ دکان دار چوڑے پلس کے پتوں کا پھرتی سے دونا بناتا اور چائے بھر بھر کر بانٹتا جاتا۔ پتوں کے دونے سے (جس میں پی کی طرح کانٹا چبھو دیتا تھا) ایک قطرہ چائے بھی تو زمین پر نہ گرتی تھی! کنکلی اور بڑکی خوشی سے اچھلیں۔ انھوں نے

Scanned with CamScanner

پتے موڑ موڑ کر دونے بنانے کی مشق شروع کر دی۔

پا میلے میں کہیں ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ ہر چیز خریدنے پر آمادہ، وہ کئی طرح کے ننھے منے راکھی داں جمع کر رہا تھا۔ چیزیں جمع کر کے وہ ان کے پاس تنکوں کی ٹوکری میں رکھوا جاتا۔

ما نے ترائی سے نمودار ہونے والے دکان داروں کو غور سے دیکھا۔ ان دیہاتیوں کے چہرے اسے عام مراٹھوں سے کچھ مختلف لگے۔ ان کے رخساروں کی ہڈیاں خفیف سی ابھری ہوئی تھیں اور جلد کا رنگ مراٹھوں کی طرح گہرا سانولا نہیں، گندم گوں تھا۔ وہ گاہکوں سے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کر رہے تھے۔ کوئی کوئی تو انگریزی کے ایک دو لفظ بھی بول دیتا۔ یہ دلّی میں جن پتھ پر بھیڑ لگانے والے نیپالیوں کی طرح راک موسیقی کے گائیکوں جیسے ماڈرن تو نہیں تھے، لیکن شہریوں سے بات چیت کرنے میں کافی منجھے ہوئے لگ رہے تھے۔

"تم ہندی جانتے ہو؟" ما نے ایک نوجوان سے پوچھا جس نے پھول دار بش شرٹ اور ایک پھٹی پرانی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے تیل لگے بالوں کے پٹھے کانوں سے نیچے تک آ رہے تھے۔

دکان دار مسکرایا۔ "تھوڑی تھوڑی۔"

"مراٹھی بولتے ہو؟"

"نہیں--- تھوڑی تھوڑی۔" دکان دار نے کہا۔ وہ اسے منکوں کے ہار دکھانے لگا۔ "پانچ روپے بائی۔ پانچ۔" اس نے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلا کر دکھائیں۔

"مراٹھی نہیں جانتے تم؟" ما نے شوق سے پوچھا۔ وہ ان کی مورتیاں دیکھنے لگی۔ اپنے پہچانے دیوی دیوتا کھوجنے لگی۔ شیر پر سوار دُرگا، مورپنکھ بالوں میں سجائے کرشن، گلے میں سانپ لپیٹے شوجی، یا رام۔ جن کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا تھا اور جو بس ایک کنول پر کھڑے رہتے تھے اور جو اتر کی طرف عام تھے، گنگا جمنا کے علاقوں میں۔ لیکن ان مورتیوں میں اسے ایک بھی آشنا مورتی نہ نظر آئی۔ یہ تو کچھ اور ہی قسم کی تھیں۔

"یہ مورتیاں کن دیوتاؤں کی ہیں؟" اس نے پوچھا۔ پھر اسے کرید ہوئی۔ "تم رام اور سیتا دیوی کو مانتے ہو؟"

"نہیں۔" نوجوان نے اختصار سے کہا۔ وہ دوبارہ اس کے ہاتھ منکوں کا ہار بیچنے کی کوشش کرنے لگا۔ "یہ دیکھو--- ایک دم چمکیلا ہار۔ یہ پہنے گا ناک میں۔" اس نے ما کو ایک بڑا سا نکیل نما حلقہ دکھایا جس میں ستارے ٹکے تھے۔

ما حیرت اور اشتیاق سے اپنی دریافت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے انگریزی میں پا سے کہا جو ان کی ٹوکری میں کچھ رکھنے ابھی ابھی آ نکلا تھا۔

"یہ لوگ مراٹھا نہیں ہیں--- اور حقیقت میں ہندو بھی نہیں ہیں۔ یعنی کہ جیسا ہم انھیں جانتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں میڈم آپ؟" اس کے پیچھے سے آواز آئی۔ ما نے چونک کر پلٹ کے دیکھا۔ ان کے پیچھے انھی کی طرح پہاڑ گھومنے آئے دو مراٹھا لڑکے کھڑے تھے۔ طالب علم معلوم ہو رہے تھے۔ اور کافی گھبراہٹ اور غصّے سے اس سے مخاطب تھے۔ ان میں سے ایک اس سے

الجھنے پر اتارو تھا۔

"یہ لوگ بالکل مراٹھا ہیں۔ ہنڈریڈ پرسنٹ! اس طرح تو آپ ہمیں مہاراشٹر ہی میں اقلیت میں تبدیل کر دیں گی۔ ایک تو ویسے ہی پورے انڈیا کے گنڈوں اور بیروزگاروں نے مہاراشٹر پر دھاوا بول رکھا ہے۔ ایک تو ویسے ہی بلا بول رکھا ہے گجراتیوں نے--- گجّو بھائیوں نے---"

وہ تو اور جانے کیا کچھ کہتا، لیکن اس کا ساتھی اسے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوسری طرف لے گیا۔

ما حیران پریشان کھڑی رہ گئی۔ جیسے کسی نے گھنٹی بجا کر اس کے سامنے ہندوستان کے نقشے کو چکر کی طرح گھما دیا ہو۔ "اوہو! تو یہاں بھی وہی مسئلہ ہے" ابھی ابھی جو اس نے سنا یہ ایک سنی ہوئی بات تھی۔ کسی اور پردیش میں--- کسی اور ملک میں--- کسی اور سرزمین پر---

"یہ آدی واسی ہیں۔" ما نے آہستہ سے کہا۔

مگر ایسے نہیں جیسے فلموں میں نظر آتے ہیں۔ یہ تو اچھے خاصے--- ماڈرن ہندوستانی ہیں۔ ما نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے آشا کی کھنکھناتی ہنسی سنی جو بالکل اس کے پاس کھڑی تھی۔ ایک عجیب موسیقی جیسی، مدھم، ننھی منی گھنٹیوں کی طرح بجتی ہوئی ہنسی۔

"تو میں کون ہوں؟" آشا ہنستی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"تم؟"

"ورلی ہیں یہ بائی۔ ادھر نیچے رہتے ہیں۔ جنگلوں میں۔ موسمانی کے پاس، داہانو، پال گڑھ تعلقے میں۔ اور امبر گاؤں میں--- جہاں میرا گاؤں ہے۔"

"تم--- آدی واسی ہو؟" ما نے چکرا کر پوچھا۔ اچانک اسے آشا اور ترائی سے آئے ہوئے ان دیہاتیوں کے نقوش میں مشابہت کا احساس ہوا۔ وہی پُرسکوں خط و خال--- اُور گندمی رنگ۔

"ورلی، ہماری گوت ورلی ہے۔ وہیں رہتا ہے میرا باپ۔ مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ اب کے منگل وار کو آئے گا شاید۔ آپ ملو گی؟"

سامان کی ٹوکریاں اٹھائے دونوں عورتیں آہستہ آہستہ ریل کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ ولا کی طرف واپس آنے لگیں۔ پیچھے پیچھے پا ایک لمبی چھڑی سے جیکو، ککلی اور برکی کو تقریباً ہانکتا ہوا آ رہا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک اکتا دینے والی سیر تھی۔ کسی بھی بہانے وہ آشا کو گھر پر کھانا تیار کرنے اور خود آرام کرنے۔ اور ما کو بچوں کے ساتھ بازار بھیجنے کی ترکیب پر عمل درآمد نہ کر سکا تھا۔

"تو یہ تھے آدی واسی!" ما نے تعجب کی سنسنی میں ڈوب کر سوچا۔ کہاں تھے یہ لوگ

ہزاروں برسوں سے؟ کیا بس یوں ہی...؟ سب سے کٹے ہوئے رہتے ہوں گے؟ جب ان علاقوں میں سواجی مرہٹے کے گھڑسواروں کی دھمک سے پہاڑ گونج رہے تھے، جب تاریخ کے منچ پر اورنگ زیب کی افواج اور مراٹھوں کی جھڑپوں کا خونیں مگر پُرشکوہ ڈراما کھیلا جا رہا تھا، تب... یہ کہاں ہوں گے؟ جنگلوں میں؟ گھنے جنگلوں میں چھپے جھانک رہے تھے؟ جھانک کر دیکھ رہے تھے ہزاروں برس سے۔ یہ انسانی تاریخ کے سب سے زیادہ غیرجانبدار انسان۔ سوئٹزرلینڈ سے بھی زیادہ! ما نے فیصلہ کیا۔ جنگلوں میں ہزار برسوں سے چھپے، لاکھوں لوگ! اس نے پھر سننا کر سوچا۔ جنگلوں میں رہنے کی وجہ سے ان کا رنگ سنولایا نہیں۔ دھوپ نہیں آتی ہو گی نا وہاں، اس نے سوچا۔

"کہا جاسکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے۔"

بمبئی میں سنچری بازار کے پاس، پارٹی آفس میں کامریڈ رانگانیکر نے ہنستے ہوئے سرہلایا۔ (ما کی یہ بات سن کر کہ ورلی آدی واسی نہ مراٹھا تھے اور نہ ہندو۔)

"مگر اب لگتا ہے، تہذیب کا شری سے گھومتا چکر انہیں جھوڑے گا نہیں۔ وہ انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر ہی دم لے گا۔ اور یہ... آدی واسی... جسے ہیں اور جہاں ہیں، وہیں کی تہذیب میں رُل گھُل کر، اسی کا ایک انگ بن جائیں گے۔ پچاس برس بعد، اسی پچاسی برس بعد۔ آپ کو بالکل ویسے ہی ایک ورلی مراٹھا مل سکتا ہے، جیسے آج ایک رانگانیکر مراٹھا مل رہا ہے۔"

"مگر یہ صرف مہاراشٹر ہی میں تو نہیں..." ما نے کہا۔

"نہیں نہیں! ایک چوڑی پٹی ہے پہاڑوں کی، اور بنوں کی..." کامریڈ رانگانیکر کرسی سے اٹھ کر شیلف میں لگی کتابیں الٹنے پلٹنے لگے۔ "یہ دیکھیے!" انہوں نے ایک کتاب کھول کر اسے سبز اور خاکی رنگوں سے بنائے ہوئے نقشے دکھائے۔

"یہ تو ایک چوڑی پٹی میں پورے ہندوستان کو لپیٹے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھیے۔ عرب ساگر کے پاس سے، سورت، کھنڈیش، میل گھاٹ، چنڈا، بستر، سریکاکلم، کورایٹ، چھوٹا ناگپور، سنتھال پرگنہ سے لے کر ہمالیہ کی ترائیوں اور اروناچل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہیں یہ پہاڑوں اور ان کے سنگ اگنے والے بہت گھنے بنوں میں رہتے ہیں۔"

"چھوٹا ناگپور!" ما کی یاد میں گھنٹی سی بجی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اخبار میں ایک عجیب خبر دیکھی تھی۔ چھوٹا ناگپور کے ٹرائبلز نے حکومت انگلشیہ کو درخواست بھیجی ہے کہ انہیں ایک الگ ملک قرار دے دیا جائے۔ وہ پیٹ دبا کر ہنستی رہی تھی۔ "یہ ہے ہندوستان! یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہی۔ مدھیہ پردیش کی نابھی میں جما چھوٹا ناگپور (بڑا بھی نہیں!) بقیہ ہندوستان سے علیحدگی کا... لیکن..." اس پر دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔ "یہ درخواست... ایسے... انگریزی سرکار کو کیوں بھیجی گئی؟ ان کے جانے کی خبر جنگلوں میں دیر

سے پہنچی کیا؟ یا پہنچی ہی نہیں؟"

اس خبر کو سب نے ہنسی میں اڑا دیا تھا، لیکن اس وقت وہ ایک پیچیدہ صورت حال کو نئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹا ناگپور تو جہاں بھی ہو... لیکن وہ خود... کیا انجانے میں انسانی وجود کی نابھی سے جا ٹکرائی تھی؟

ooo

آخر ما نے ایک ترکیب سوچ لی۔ ایک بیچ دار ترکیب۔ بدھ وار کی صبح وہ ما کو بازار لے جائے گا۔ اس کے بعد، جب کہ آشا کھانا پکا چکی ہو گی، وہ ما کو واپس لے آئے گا۔ پھر ما بچوں کو سیر کرانے لے جائے گی۔ اور با؟ وہ تھوڑی دیر سوئے گا۔

ما با کے ساتھ بازار گئی، پروگرام کے مطابق واپس آئی، اور پھر بہت تھک گئی۔ با جب چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹا تو ما کو وہاں پا کر ششدر رہ گیا۔

"بچے شور مچائیں گے۔ ضد کریں گے بچے۔" اس نے ما کو سہولت سے سمجھایا۔ "تم انہیں سیر کرانے لے جاؤ۔"

"وہ تو دیر ہوئی آشا کے ساتھ جا چکے ہیں۔" ما نے اسے اطلاع دی۔

با بستر پر اچھل پڑا۔ اس کا پورا بدن اکڑ گیا۔ وہ فوراً بستر سے اتر کر موزے جوتے پہننا چاہتا تھا۔

"آشا اکیلی... وہ ککلی کو... چیکو کو... کیسے سنبھالے گی آشا انہیں؟" اس نے سرعت سے کہا۔ اب وہ بستر پر بیٹھ چکا تھا۔

ما آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ وہ واقعی تھک گئی تھی۔

آنکھیں بند کیے کیے اس نے آدمی کو بستر سے نکلتے، ادھر ادھر کھڑبڑ کرتے سنا۔

"کہاں؟ کس طرف گئی ہے؟ کس طرف گئے ہیں سب لوگ؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آخری پہاڑی پر۔ جہاں دوربین لگی ہے۔" ما کی اداس آواز آئی۔

افوہ! اتنی دور؟ گریں گے سب لوگ! اکیلی..." با نے افسوس سے کہا اور چشم زدن میں کمرے سے باہر دوڑ پڑا۔ اپنے اوپر مردانہ آفٹرشیو کی پھوہاریں ڈالتا۔ کمرہ خوشگوار مہک میں بس گیا۔

بچے آشا کے ساتھ آخری پہاڑی پر نہیں گئے تھے۔ اتنی دور تک وہ واقعی انہیں کیسے سنبھالتی! وہ تو بڑی مال تک گئے تھے۔

با کو دھوکا دے کر ما آرام سے سو گئی۔

اندھیرا پڑتے ہوئے جب با، آخری پہاڑی سے اکیلا منّا مار کر، سنگلاخ سرخ چٹانوں میں آشا آشا پکار کر، اور ان کی گونج کو دور دور تک نالیاں بجاتے سن کر، اور بےبسی میں دو

روپے دے کر دوربین سے دور نظر آنے والے بتوں کو دیکھ کر واپس لوٹا۔ سرخ مٹی میں آٹا ہوا، تب آشا کب کی واپس آ چکی تھی اور اپنی کوٹھری میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ بڑکی اور ککلی اس کے پاس زمین پر بیٹھی، ڈھیر سے جمع کیے ہوئے جوڑے پلس کے پتوں اور کانٹوں سے لیا چھپ دونے بنا رہی تھیں۔ چیکو گندھے آٹے سے ہاتھی گھوڑے بنا رہا تھا۔

ما کے بازوؤں میں نا بےدم ہو کر گر پڑا۔

"ہو سکتا ہے ہندوستان کا قدیم انسان ہنائی اور برما سے آیا ہو۔ ان دونوں خطوں میں قبل از تاریخ پتھروں کے اوزاروں کی ساخت اور وہ مادہ جس سے یہ اوزار بنائے گئے ہیں، یکساں پایا گیا ہے۔"

ما کوسمبی کی کتاب کے ورق پلٹتی رہی۔ یہ نا کی کتاب تھی۔ پہاڑ پر مطالعے کے لیے وہ اسے دلّی سے ڈھو کر لایا تھا۔

"یہ خوراک بینتے تھے، کاشت نہیں کرتے تھے۔ گھنے جنگلوں میں آج بھی، خودرو باجرہ، جوار، گیہوں، چاول اور گرم مسالا تک مل سکتا ہے۔ تاریخ نویسوں کو یہ بات حیرت زدہ کر دیتی ہے کہ، جب کہ ان کے بالکل پڑوس میں کاشت کاری شروع ہو چکی تھی، کیوں کر ان میں سے اتنے زیادہ تعداد میں صرف خوراک بیننے پر قانع رہے۔ ان کا پیداوار کا طریقہ نہ بدلا۔ اسی طرح ان کی زندگی کا اور عقائد کا محور جوں کا توں رہا۔"

آگے لکھا تھا۔

"ہندوستان کی پریشانی کی خاصیت، متصل خطوں میں ادوار کا ایک دوسرے پر تہہ در تہہ حاوی ہونا ہے۔ ایک دور شروع ہو کر اختتام پذیر ہو جاتا تھا، جب کہ پہلا دور پھر بھی باقی رہتا تھا۔ جنوبی علاقوں میں ان آدی واسیوں کے بنائے ہوئے دو عجوبے ملتے ہیں۔ یہ پتھروں پر ایک دائرہ سا کھود دیتے تھے۔ اس کے علاوہ چٹانوں پر دوسری چٹانیں رکھ دیتے تھے۔ مہاراشٹر میں یہ اوپرتلے رکھی چٹانیں ہزاروں کی تعداد میں ملی ہیں۔ ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ آج تک کوئی نہیں جان سکا۔

"خوراک بیننے والوں کی ایک دیوی ماں تھی۔ بعد میں گوالوں کا دیوتا دریافت ہوا ہے۔ ابتدا میں دیوی ماں کی دیوتا سے جنگ تھی۔ جب ان قبیلوں میں صلح ہوئی تو دونوں کی شادی کر دی گئی۔ پھر بھی بعض ان مندروں میں، کہیں کہیں دیوی ماتا کاشت کاروں کے دیوتا مہاسوبھا کا سر کچلتے ہوئے ملتی ہے، جب کہ ایک کوس کے فاصلے پر کسی مندر میں دیوی مہاسوبھا سے بیاہ رچا رہی ہو گی۔

"بعد کے آنے والے براہمنوں نے اس جوڑے کو دراوڑی جوڑے شو اور پاربتی کی ابتدا قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر دراوڑی پاربتی شو کا اس طرح سر نہیں کچلتی۔ آدی واسی ابتدا میں اپنے مُردوں کو دفن کرتے تھے۔ دراوڑ صرف جلاتے تھے۔ اب جلانے کی رسم آدی واسیوں میں رائج ہو گئی ہے۔ آدی واسی کاشت کاروں میں کاشت کاری کا کام عورتیں کرتی تھیں۔ دراوڑ

کلچر میں زمین کھودنے کا کام عورتوں سے نہیں کروایا جاتا۔ یہ لوگ مٹی کے بالکل مدوّر، گول برتن، کمہار کے چاک کے بغیر، صرف ہاتھوں سے بناتے تھے..."

تھے کیا مطلب؟ اب بھی بناتے ہیں، ما نے سوچا۔ اسے منگل وار کے میلے میں کپڑا بچھائے، مٹی کے برتن سجتی عورت یاد آئی۔ سب کے سامنے چکنی سرخ مٹی کے لوندے کو ہاتھوں سے تھاپ تھاپ کر گول کر رہی تھی۔ اس کے گرد سیّاحوں کی بھیڑ تھی۔ پندرہ منٹ میں چھوٹے سے منھ اور بڑے سے پیٹ کی ہانڈی تیار ہو جاتی۔ فاتحانہ انداز میں وہ سب کو دکھا کر سوکھنے کے لیے قطار میں رکھ دیتی۔ عورت پر جھکا ہوا مجمع تعریف میں تالیاں بجاتا۔ ان میں سے زیادہ تر تو (بعد میں نا نے بتایا جو یہ تماشا دیکھنے والوں میں شامل تھا) عورت کی نیم عریاں چھاتیوں کے گول، گندمی ہیالے دیکھ رہے تھے جو "ایشور نے اتنی، کیا کہتے ہیں کہ، کاری گری سے بنائے تھے۔" دیکھنے والوں میں سے ایک نے رقت سے آہ بھر کر کہا تھا، اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ہندوستان کی اَن لکھی، آدی تاریخ... ما نے سوچا... کتابوں کے بدلے ہر جگہ موجود ہے۔ اور کوئی دَور بھی... اس نے حیرت کی کہ... ختم نہیں ہوا۔

OOO

بدھ وار کی صبح، ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے۔ آشا نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"باپ آیا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

ما بال جھاڑتی اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ اس کوٹھری میں بہت ہی کم آتی تھی، جہاں اگر بتیوں اور تمباکو کی عجیب ملی جلی خوشبو بسی رہتی تھی اور جہاں ــ پہر کی روشنی میں ایک دن اس نے دیوار پر عجیب نقش و نگار دیکھے تھے۔ آشا نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ کچھ جھجھک کر اس نے پٹ کھولے۔ یہ کوٹھری کچھ ایسے زاویے سے بنی تھی کہ دوپہر تک باہر احاطے میں دور دور پھیلا ہوا اجالا، جس میں سب کچھ صاف نظر آتا تھا، کوٹھری کے اندر براجمان اندھیرے کا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا تھا۔ آشا کی کوٹھری کی نیم تاریکی میں اسے ایک ہیولا سا نظر آیا۔

"ارے مجھے کچھ نہیں دکھ رہا۔" ما نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بےاختیار کہا۔ اسے ڈر تھا زمین پر دھرے برتن بھانڈوں سے ٹھوکر نہ کھائے۔

آشا نے اپنی کوٹھری کی بائیں دیوار میں جڑی کھڑکی کھول دی۔ اس کھڑکی کا اسے پہلے کیوں پتا نہ چل سکا؟ شاید دیوار کے رنگ کی رنگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلنے کے ساتھ ہی روشنی کی ایک چوندھ، چوڑی ترچھی لکیر کوٹھری میں گھس آئی۔ پل بھر تک تو ما اس زرد روشنی

Scanned with CamScanner

بی کو دیکھ سکی جس نے اچانک فضا میں معلق اس گنت نہ جانے کس قسم کی دھول کے خوردبینی ذرّات روشن کر کے اسے سجھا دیے۔ شاید آشا نے ابھی جھاڑو دی ہو، ما نے سوچا۔ لیکن اب کمرہ روشن ہو چکا تھا۔

ایک ہاتھ سے اپنی مچمچاتی آنکھوں کو روشنی سے بچاتا ایک بہت بوڑھا، جھرّیوں کی پوٹلی سا آدمی ایک لمبی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہو رہا تھا۔ اس کے تن پر ایک کسی ہوئی لنگوٹی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ بائیں ہاتھ کے کتے اُون کی ایک رنگ برنگی کملی اس کے برہنہ شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔

ما اسے نہایت حیرت اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے مٹھی بھر بال، جن میں اب بھی، جیسے کسی حیاتی معجزے سے کافی سیاہ بال موجود تھے، سکھوں کی طرح لمبے، جی کا اس نے تالو پر جوڑا بنا رکھا تھا۔ لیکن داڑھی مونچھ نہیں تھی۔

لاٹھی آشا کو تھما کر، بڈھے نے سینے کے ساتھ ایک ہاتھ کا پیالا بنایا اور دوسرے بازو کی کہنی پیالے میں ٹکا کر ناسہ اپنی ناک کے سامنے لکڑی کی طرح سیدھی کر لی۔

ما کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اسے شدید سنسنی محسوس ہوئی۔ وہ ایک سچ مچ کے آدی واسی کو دیکھ رہی تھی جو شاید اسے سلام کر رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک بےبس قسم کی ہنسی کو اپنے اندر کروٹیں لیتی محسوس کیے بنا نہ رہ سکی جو اس عجیب سلام سے پیدا ہو رہی تھی۔ جو اس کے اپنے تمام تر ثقافتی تجربے میں کسی فحش اشارے سے مشابہ تھا۔

"بیٹھو بیٹھو!" ما نے کہا۔

ہاں ہاں کرتا بڈھا بیٹھ گیا۔

ما نے حیرت سے پوچھا، "یہ ترائی سے، امبر گاؤں سے، اتنی اوپر پہاڑ پر چڑھ کر کیسے آ گیا؟"

"نہیں!" آشا ہنسی۔ "یہیں میں آیا ہے۔"

ما آشا کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا کرتا ہے تمہارا باپ؟"

"اب کیا کرے گا؟ بڈھا اتنا ہو گیا ہے۔ ہاں پہلے... پہلے جنگل جلاتا تھا۔"

"جنگل؟"

آشا ہنسی۔ "کوئلہ! کوئلہ جانتی ہے نا آپ؟ جو انگیٹھی میں جلتا ہے۔ پیڑ پورا جلا کر کوئلہ بناتا تھا۔"

"اچھا۔" ما نے کہا۔ وہ جانتی تھی (اسے یاد آیا۔ کوئلہ وغیرہ تو کب کا استعمال کرنا چھوڑ چکے تھے شہروں کے لوگ، کم از کم جن شہروں میں وہ رہی۔ پچیس تیس برسوں سے۔ کراچی اور دلّی۔ دلّی تک میں، جہاں قدرتی گیس نہیں تھی، وہ گیس کے سلنڈر استعمال کرتے تھے) کہ کوئلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پتھر کا کوئلہ اور لکڑی کا کوئلہ۔ مگر یہ بنتا کیسے ہو گا؟ اس بات کے سوچنے پر اس نے اپنے جیون کے پندرہ منٹ بھی کبھی نہیں گزارے تھے۔ ایسا اس نے صرف کبھی بچپن میں نصاب کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ زندگی کیا اس قدر زیادہ لمبی تھی؟ اس

ایک پل میں اس نے سوچا تھا۔ کچھ باتیں، پڑھی ہوئی، سنی ہوئی، کیا مٹی کے کسی تودے کے نیچے دفن ہو گئی تھیں؟ لیکن اس کے باوجود... کس قدر چھوٹی محسوس ہوتی تھی زندگی! جیسے کل ہی کی بات ہو... سب کچھ!

"ہاں..." آشا کہہ رہی تھی۔ "کوئلہ بنانا یہاں بس ورلیوں ہی کو آتا تھا۔ اب تو نہیں بناتے یہاں۔ سرکار نے منع کر دیا ہے۔ لیکن میرے چھوٹے ہوتے تک، ہم پیڑ کاٹتے تھے۔ ہر رات الاؤ جلتا تھا۔ بہت بڑا الاؤ! اس میں پورا پیڑ بھسکتے تھے... ایک بار... ایک بار تو ایک آدمی کو پھینک دیا تھا۔"

"آدمی کو؟ کس نے پھینک دیا تھا؟"

ما نے مسحور سا ہو کر پوچھا۔

"کھانےدار نے۔" بڈھے نے سادگی سے کہا۔

000

شبی وار۔ آج ما نے سویرے اشنان کیا۔ بال دھوئے۔ دھوپ میں بال سکھانے بیٹھی۔ پہاڑ کی ٹھنڈی دھوپ یہاں سویرا کتنی جلدی ہو جاتا تھا! یا اور بچے اس سے بھی پہلے اٹھ گئے تھے۔ یا بچوں کو جگایا تھا۔ "بادل" اس نے اشتیاق سے اطلاع دی تھی۔ علی الصباح بادلوں کے ٹکڑے پہاڑ پر اتر آئے تھے۔ روئی کے گالوں جیسے، بھٹکے بادلوں کے ٹکڑے، کسی اپسرا کے چھپرکھٹ کی طرح، ولا کے دروازے کے عین سامنے اڑتے چلے آ رہے تھے۔ بچوں نے حیرت اور خوشی سے چیخیں ماری تھیں۔ پھر خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ کہیں بادل انہیں لپیٹ نہ لیں اور اڑا نہ لے جائیں۔ انہوں نے ما کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سوچا ہو گا یا زیادہ بھاری ہیا بادل اسے تو نہ اڑا پائیں گے۔ لیکن پاس آتے بادل دھند نظر آنے لگے تھے۔ وہ اس کنبے سے ٹکرا کر ولا کو پار کرتے چلے گئے تھے، جاتے جاتے سب کو گیلا چھوڑ کر۔ بچے چیخیں مار مار کر ہنستے رہے تھے۔ بادلوں نے انہیں سچ مچ چھوا! اڑتے بخارات کے لمس کی گدگدی وہ دیر تک اپنے بدنوں پر محسوس کرتے رہے تھے۔ اب سب اپنے اپنے پروگرام کے مطابق باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

ما دھوپ میں بال سکھا رہی تھی۔ وہ برآمدے سے آرام کرسی گھسیٹ لائی تھی۔ پرانے زمانے کی لکڑی اور بنت کی بنی ہوئی کرسی احاطے میں گھسیٹ کر وہ سورج سے پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ کہ نیر شفاف دھوپ آنکھوں میں نہ پڑے، اور کل کا باسی انگریزی اخبار الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جو با استثنیٰ سے متصل بازار سے لایا تھا۔ وہ خبروں پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ زیادہ تر فلموں کے اشتہار دیکھ رہی تھی ما۔ اس کا دھیان بٹا ہوا تھا۔

بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر انہیں سکھاتے ہوئے ما نے بلند آواز میں کہا،

"یہ تو صریحاً ناانصافی لگتی ہے۔ بالکل عقل کے الٹ بات ہوئی یہ تو... کہ جس چیز میں

Scanned with CamScanner

روح ہی نہیں، جو ناسمجھ ہے، بےشعور ہے، وہ تو پھلے پھولے اور بڑھے... اور جو چیز باشعور ہے، سمجھ دار ہے، وہ بس ساکن و صامت رہے۔ ٹھنٹھ کی ٹھنٹھ۔ کسی سوکھے مارے پیڑ کی طرح۔ بلکہ پتھر کی طرح۔ جس میں تبدیلی نہیں آتی۔ پتا نہیں باہمنوں نے اکیلے بیٹھ بیٹھ کر کیا الٹی مت کی باتیں سوچیں۔ دھوپ میں کھوپڑی پگھل گئی ہو گی۔ مت ماری گئی ہو گی۔ ظاہر ہے۔"

"کون کہتا ہے پتھروں میں تبدیلی نہیں آتی؟" بڑکی نے جھولا جھولتے ہوئے پکارا۔ "بالکل آتی ہے۔ مگر ہزاروں برسوں میں۔ ایسا ہماری جیوفزکس کی کتاب میں لکھا ہے۔"

"اور باہمن دھوپ میں نہیں بیٹھتے تھے۔ پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھتے تھے۔" با نے لقمہ دیا۔

ما مسکرائی۔ پھر بھی اسے مادے کی روح پر برتری پسند نہیں تھی۔ مادہ مر جاتا ہے۔ مگر صرف مر جانے سے کیا ہوتا ہے؟ اس کے شعور کی زیریں رو میں یہ بات تھی کہ مر تو سب ہی جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد آتما نہیں مرتی تو نہیں مرتی ہو گی۔ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے، اس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بات تو زندگی کی تھی۔ آتما کا مطلب اس کے ذہن میں شعور کا تھا۔ آتما کا مطلب اس کے مطابق تھا خیال، احساسات، وغیرہ۔ وہ انھی کو برتر سمجھنا چاہتی تھی۔ ادھڑائی عورت بےچاری! جب کشش ثقل اور پیدائش بچگاں کی مشترکہ بیہودہ سازش سے بدن ڈھل رہا ہو، تب وہ روح کی برتری نہ چاہے گی تو کیا بدن کی برتری چاہے گی؟ نہیں! روح ہی برتر ہونی چاہیے۔ اور صرف ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے، مانی بھی جانی چاہیے۔ لوگوں کی نظروں میں، اس کی اندرآتما نے خواہش کی، آتما ہی کی زیادہ قدر ہونی چاہیے۔

دور جامنوں کے جھنڈ پر لنگور ہڑدنگے مچا رہے تھے اور زقندیں لگا رہے تھے۔

تب ہی پاس مٹی میں کھیلتے چیکو نے الٹی کی۔ "ہائیں! یہ کیا؟" اخبار پھینک کر وہ گھبراہٹ میں کھڑی ہوئی۔ اس نے چیکو کو گود میں اٹھایا۔ ستھری دھلی ساری پر چیکو کی الٹی سن گئی۔ چیکو کا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔

"ڈاکٹر نے کہا تھا بخار ہو سکتا ہے۔" با نے اسے تسلّی دی۔ "تم نے اسے دوا کی صبح کی خوراک پلائی؟"

ما نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔ چیکو کو ناشتہ کرا کے اسے دوا پلائی تھی۔ لیکن چیکو کو بخار ہو گیا تھا۔ اب چیکو آج سیر پر نہیں جاسکتا تھا۔ اور... ما بھی نہیں!

با کے تو پوبارہ ہو گئے۔ بےپناہ مسرت کو چھپاتا، چھپانے کی ناکام کوشش کرتا، وہ بےربط جملے بولنے لگا۔

"بہت ضروری ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا۔ سب کچھ لانا ہے۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے تو دکانیں معلوم ہی نہیں۔ آشا کو جانا ہے۔ اور ہاں، ککلی کو تو بڑکی سنبھال لے گی۔"

بڑکی بال لہراتی آئی۔ آنکھیں مسرت سے تاروں کی طرح روشن۔ "بالکل ما... تم فکر نہ کرو۔ ککلی کو میں سنبھال لوں گی۔ میں اسے گھومنے والے جھولے پر بٹھاؤں گی۔" اس نے چٹاچٹ ما کے رخساروں پر بوسے دیے۔

ما کے آدھے دماغ نے سوچا۔ بڑکی ککلی کو سیر کرائی ہو گی۔ اتنے دنوں بعد با کو آشا کے ساتھ تنہا ہونے کا پہلا موقع ملے گا۔ لیکن اس کا آدھا دماغ چیکو کے بخار میں کب کا لگ چکا تھا۔ وہ چیکو کو بانہوں میں بھر کے اندر لے گئی۔ آشا جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بجلی کی راڈ سے اس نے خود ہی بالٹی میں پانی گرم کیا۔ چیکو کے منھ اور بدن سے تولیہ بھگو کر الٹی صاف کی۔ پوڈر لگایا۔ اسے صاف کپڑے پہنائے۔ اپنی ساری اور بلاؤز تبدیل کیا۔ چیکو کو چھاتی سے لگا کر تھپکتے ہوئے جب ما نے کھڑکی سے جھانکا تو ککلی، بڑکی، با اور آشا کا چھوٹا سا قافلہ ولا کی ڈھلان سے اتر رہا تھا۔ سب سے آگے ککلی، سمجھ داری سے جما جما کر قدم دھرتی ہوئی۔ اس کے پیچھے بڑکی، ککلی کی آہستہ روی سے بیزار، لنگوروں کی طرح زقندیں لگانے کے لیے بےتاب۔ اس کے پیچھے تھی آشا، پُرتمکنت، حسین اور پُرسکون؛ آشنا راستوں پر لاشعوری اعتماد کے ساتھ قدم دھرتی۔ اور آخر میں با، جس نے دونوں ہاتھوں میں خالی سودے کی ٹوکریاں خود ہی اٹھا رکھی تھیں؛ جس کی باچھیں بالکل بڑکی ہی کی طرح کھلی تھیں، اور جو اتنی دور سے بھی آشا پر واری صدقے ہوتا نظر آ رہا تھا؛ جس کا پیر بار بار رپٹ رہا تھا کیوں کہ اسے راستے کا ذرہ برابر دھیان نہ تھا۔

ان کی آن میں وہ سب ما کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ما کسی عامل کے معمول کی طرح چیکو کو تھپکتی رہی۔ ابھی تک اس کا دماغ چیکو میں لگا تھا، لیکن اب، جب چیکو اس کے سینے سے لپٹ کر اونگھ رہا تھا، اور وہ سب جا چکے تھے، اس کے ذہن نے چیکو کی فکر سے آزاد ہو کر پوری صورت حال کا جائزہ لیا تھا۔ با اور آشا کے بارے میں سوچا تھا، اور ذلت اور غم میں ڈوبنے لگا تھا۔ ما کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔ سر کو جھٹکے دے دے کر اس نے غم کو بھگانے کی کوشش کی۔ چیکو اس کی بانہوں میں سو گیا۔ جانے کب سے سو رہا تھا چیکو، جب کہ وہ اسے گود میں لیے ٹہلے جا رہی تھی۔

ما نے چیکو کو اپنے بستر میں لٹایا۔ حفظ ماتقدّم کے طور پر اس کے نیچے ننھی سی چادر اور پلاسٹک بچھایا (کیوں کہ چیکو پیشاب ضرور کرے گا)۔ اسے رضائی اُڑھائی۔ پھر کچن میں چلی گئی۔ اس نے ایک بڑا سینڈوچ بنا کر کھایا۔ اسے اتنا نہیں کھانا چاہیے! وہ جرم کے احساس اور پچھتاوے میں ڈوبی۔ وزن نہیں بڑھانا چاہیے اپنا۔ اسے سر کے بل کھڑا ہونا چاہیے، کشش ثقل کے اثر کو رد کرنے کے لیے، اس نے مایوسی سے سوچا۔ کیوں کہ وہ ایسا سب کچھ کر نہیں پاتی تھی۔ بھول جاتی تھی۔ ما کا دھیان کہیں اور بٹا رہتا۔

اور ایک بار پھر بالکل ایسا ہی ہوا۔ دھیان بٹانے والی ایسی بات جس سے بڑی شاید ہی کوئی اور ہو سکتی۔ اگر روس اور امریکا میں تیسری عالمی جنگ شروع ہو جاتی تو شاید ما کے ذہن کو کم جھنجھوڑتی۔ جب گول کمرے میں جا کر ما نے وقت ہلاک کرنے کے لیے ٹرانزسٹر ریڈیو لگایا، دوپہر کی خبریں ہو رہی تھیں؛ اور اسے پتا چلا ان مہاراشٹری پہاڑوں کی ترائی میں تھوڑے ہی فاصلے پر بھیونڈی میں شدید ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔

ہندو مسلم فساد تو ہوتے رہتے تھے۔ ہر مہینے کہیں نہ کہیں تو ضرور ہی ہوتے ہوں گے۔ اب اگر وہ بچوں کے اسکولوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر آئے ہوئے تھے تو بلوائیوں کو تو اس کی خبر اور پروا نہیں تھی نا۔ یا ہونی چاہیے تھی؟

ما پریشانی میں ریڈیو سنتی رہی۔ خبروں کے بعد فلم کے گیت اسے اچھے نہیں لگے۔ وہ ٹرانزسٹر کی "اے مالک تیرے بندے ہم، ایسے ہوں ہمارے کرم، نیکی پر چلیں اور بدی سے ٹلیں، تاکہ ہنستے ہوئے نکلے دم" کی پُرسوز التجا کو بددلی سے سنتی رہی تھی، جو اسے پتا تھا کہ ایک مراٹھے ہدایت کار وی شانتارام کی فلم "دو آنکھیں بارہ ہاتھ" میں گایا گیا تھا۔ ما نے یہ فلم دیکھی تھی۔ ٹی وی پر دکھائی گئی تھی۔

"بڑا کم زور ہے آدمی۔ ابھی لاکھوں ہے اس میں کمی۔ پر تو جو کھڑا ہے دیالو بڑا۔ تری کرپا سے دھرتی تھمی۔"

ریڈیو کہہ رہا تھا۔

جی ہاں! ما نے سوچا تھا۔ آدمی اتنا کمزور ہے۔ شانتارام نے اپنی حسین بیوی جے شری کو چھوڑ، سندھیا کو گھر میں ڈال لیا تھا، داشتہ بنا لیا تھا اپنی! اس نے تلخی سے تبصرہ کیا تھا۔ یہ فلم بنا کر... اور یہ گیت گوا کر۔ اس نے سوچا تھا۔ آدمی جو کہتا ہے اس کے الٹ کیوں کرتا ہے؟ یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اور وہ سمجھنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ جب کہ اسے اپنے ذاتی معاملات بہتر بنانے کی کم از کم کچھ کوشش کرنی چاہیے تھی۔ جب کہ اسے ذاتی حالات کا کافی غم تھا۔ حالاں کہ زندگی کی رواروی میں غم تک کی فرصت آدمی کو کم ملتی ہے۔

گیت چل رہا تھا:

"یہ اندھیرا گھنا چھا رہا۔ تیرا انسان گھبرا رہا۔ ہو رہا بےخبر۔ کچھ نہ آتا نظر۔ سُکھ کا سورج چھپا جا رہا۔"

خالی خالی آنکھوں سے ما سفید دیوار کو تکتی رہی۔

"پر تو جو کرے گا کرم۔ تو (نہ جانے کیا) ہو جائیں گے ہم۔ نیکی پر چلیں۔ اور بدی سے ٹلیں۔"

ما نے ٹرانزسٹر ریڈیو بند کر دیا۔

کھڑکی سے ما کو نظر آیا ولا کی ڈھلان پر دو نفسوں کے خطوط بابڑتابڑ چڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ آگے آگے بڑکی تھی جس کی چمک دار آنکھیں چکرمکر گھوم رہی تھیں اور چہرے پر سنجیدگی اور کچھ برا منانے کا تاثر۔ گال سرخ ہو رہے تھے، شاید چڑھائی چڑھنے سے۔ لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی تھی پندرہ سال کی اس کی بڑکی۔

اور اس کے پیچھے با تھا۔ سبزی ترکاری، دالوں، دودھ کے ڈبوں، تیل کے ڈبوں، چاکلیٹوں اور گوشت سے ابلتی ٹوکریوں سے لدا پھندا۔ ٹوکریوں سے مسالوں کے پیکٹ ابل ابل کر گرے پڑ

رہے تھے۔ با کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں ابلی آ رہی تھیں اور منھ سے مارے غصّے کے جھاگ نکل رہے تھے۔

بڑکی اس سے کچھ بھی کہے بغیر، تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی! پورے برآمدے میں اس کی مشک نافہ کی سی خوشبو پھیل گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے میں جا کر با اسے پوری بات بتا پایا۔ اس کا غصہ اور گھٹن اس قدر زیادہ تھی۔

ہوا یہ تھا کہ بڑکی کے چڑیل پن نے سارا پروگرام تلپٹ کر دیا تھا۔ با کا ارادہ یہ تھا کہ خریداری کے بعد، یا خریداری کے دوران، بڑکی ککلی کو سنبھالے گی۔ لیکن بڑکی نے ایسا کچھ بھی نہ کیا تھا۔ بڑکی نے آشا کو پٹا اور رجھا کر پہلے ساری خریداری کرا دی تھی۔ اور جب با گوشت کی دکان میں گیا تھا اور آشا ہندو ہونے کی وجہ سے نہ گئی تھی، تب ککلی کو آشا کے حوالے کر کے بڑکی رفوچکر ہو گئی تھی۔

گوشت کی دکان پر ایک کلو قیمہ اور ایک کلو گوشت تلوا کر، اسے چار پیکٹوں میں بندھوا کر، جب با باہر آیا تھا، اس نے ککلی کے سنگ آشا کو کھڑے دیکھا تھا اور بڑکی غائب تھی۔ جیسا کہ کسی مثنوی میں ایسے موقعوں کے لیے لکھا تھا:

> اڑتی چوکی پہ خاک باقی
> پردے کی قنات چاک باقی

یعنی کہ داستان کی اصل ہیروئن اڑنچھو ہو چکی تھی۔

بڑکی کہاں گئی؟ اس استفسار پر آشا نے شمال کی جانب منھ کر کے کہا تھا "وہاں۔ کہتی تھی، ابھی آتی ہوں۔"

گوشت کی دوکان کے سامنے، جب کہ کاغذ کے تھیلوں سے خون رس رہا تھا، با، ککلی اور آشا نے اتنی عرصے تک بڑکی کا انتظار کیا جو انھیں کئی گھنٹے معلوم ہوا۔ ککلی نے دونوں ہاتھوں کا جھولا بنایا اور انھیں دیر تک جُھلاتی رہی۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر کنکروں کی قطاریں بنائیں۔ پھر اس نے پہلے جسامت اور پھر رنگ کے حساب سے کنکروں کی الگ الگ کئی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنائیں۔ مگر بڑکی شمال کی طرف سے واپس نہیں آئی۔ آخر ککلی کھڑی ہو گئی۔ اس نے سکون سے کہا: "با۔ اب میں جھولے پر بیٹھوں گی۔"

با پریشانی اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اتنی دیر تک آشا سے فلرٹ بھی نہیں کر سکا تھا۔ ککلی کے صبر پر اور بھی اس کا دل کٹا۔ (با بچوں پر جان دیتا تھا۔) مارے غصّے کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بڑکی کہاں مر گئی؟ وہی تو لے جاتی تمھیں جھولا جھلانے" اس نے غم و غصّے سے تلملاتے ہوئے کہا۔

آشا نے تسلی دی۔

"بابو صاحب، پھکر نہیں کرو۔ بے بی کو میں سیر کراتی ہوں۔ آپ سامان لے کر بڑکی کو ڈھونڈ لیجیے اور واپس چلے جائیے۔"

Scanned with CamScanner

ککلی خوشی سے کھلکھلانے لگی۔ اس نے جھٹ آشا کی انگلی تھام لی۔

با بڑبڑایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی ترکیب سوچ پاتا، ککلی اور آشا جا چکے تھے۔

بڑکی کی تلاش میں، سامان کی کئی ٹوکریاں اٹھائے، با شمال کی طرف گیا۔ لیکن بڑکی وہاں نہیں تھی۔

با جنوب اور مشرق اور مغرب کی طرف گیا مگر بڑکی ان چاروں سمتوں میں نہیں تھی۔ با پریشان ہو گیا۔

بڑکی کو آسمان کھا گیا کہ زمین نگل گئی؟ پریشانی میں وہ ان تمام جگہوں پر گیا جہاں پہلے جا چکا تھا۔ ٹوکریوں سے پیاز اور آلو لڑھک لڑھک کر گرتے رہے۔

اب اگر با بڑکی کو مزید تلاش کرتا تو وہ پریشانی سے بےہوش ہو سکتا تھا۔ اس نے دل کو سختی سے تسلی دی کہ کسی وجہ سے بڑکی واپس ولا چلی گئی ہو گی۔ اور یقیناً وہیں ہو گی۔ جیسے ہی وہ ولا میں قدم رکھے گا بڑکی اسے نظر آ جائے گی۔

با، لداپھندا، ولا کی سمت جانے کے لیے، پہاڑی کی چکراتی پگڈنڈیاں چڑھنے لگا، جو ریل کی چھوٹی گیج کی پٹریوں کے ساتھ اور کبھی ان سے ہٹ کر موڑ کاٹتی اوپر جا رہی تھیں۔

ایک موڑ کاٹ کر با کیا دیکھتا ہے کہ ریل کی پٹریوں کے ساتھ دو بڑے پتھروں پر بڑکی بیٹھی ہے۔

اور اس کے ساتھ ایک سولہ سترہ برس کا سانولا، عینک پوش مگر اسمارٹ لڑکا بھی بیٹھا ہے۔ ایک سفید گھوڑا پاس کھڑا چر رہا ہے۔

بڑکی!

با نے پہلے اطمینان کا سانس لیا۔ بجلی کی طرح اطمینان کی لہر تن بدن میں دوڑ گئی۔ اور پھر مارے شدید غصّے کے دل ہی دل میں زاروقطار رویا۔

"بڑکی!" اس نے غصّے کی دردناک چیخ ماری۔ بڑکی نے اچھل کر اس کی طرف دیکھا اور فوراً کھڑی ہو گئی۔ پھر بغیر بال برابر افسوس یا ندامت کے، خوش باشی سے مسکراتے ہوئے بولی: "اوہ با!"

پھر بال لہرا کر بولی:

"رمیش، یہ ہیں میرے با۔ اور با، یہ رمیش ہیں۔"

انگریزی بول رہی تھی بڑکی۔ جیسے کہ انگریزی فلموں میں بوائےفرینڈ کا خاندان سے تعارف کراتے ہیں۔

سانولے لڑکے نے فوراً کھڑے ہو کر، مسکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"گڈمارننگ سر!" اس نے نہایت خوش خلقی سے کہا۔

با غصے، اپنی بشیت کذائی پر شرمندگی، اور جھجک سے چکرا رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے مصافحے کی کوشش کا جواب دیا اور زبردستی باچھیں چیر کر مسکرایا۔ اس نے یہ تک کہا کہ اسے رمیش سے مل کر نہایت خوشی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اس کا کیا اچھا گھوڑا ہے۔ دیگر یہ کہ ایرانی بیکری والے مسٹر کیقباد کی ولا میں شام کو وہ اس کے ڈیڈی کے ساتھ ضرور

چائے پئیں گے۔

جس کے بعد سانولا عینک پوش لڑکا اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ بڑکی نے ٹوکریاں اٹھانے کی پیش کش کی مگر با نے شدید غصّے میں سر جھٹک کر انکار کر دیا۔ وہ ولا کی طرف روانہ ہوئے، خوشی سے تقریباً اڑتی ہوئی بڑکی کے پیچھے، با قہر و غضب کے بھیانک کالے بادل کی طرح برستا ہوا ولا کی طرف آیا۔

"غیرذمےدار!" با نے داستان سنانے کے دوران اور اختتام پر پچاسویں بار چیخ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "کوئی بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔" اس نے شدید غم میں سر ہلایا، "کہ یہ لڑکی جو اتنی بڑی ہو گئی ہے، اور دراصل بڑی نہیں ہوئی ہے، مگر پھر بھی کافی بڑی ہے، نہایت ہی غیرذمےدار ہے۔"

ما خاموشی سے داستان سنتی رہی۔ اس کے دل میں ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ با کے رومانی ارادوں کی بڑکی نے اچھی درگت بنائی! لیکن یہ تو قصّے کا ایک پہلو تھا۔ اب رہی بڑکی...

وہ بڑکی کے کمرے میں آئی۔

چالاک بڑکی نے چور نظروں سے بھانپا کہ ما کا غصّہ اصلی ہے کہ مصنوعی۔ وہ لحاف اوڑھے بستر میں پڑی تھی۔ ما کے بارے میں وہ اتنا جانتی تھی کہ کوئی بھی دوسرا ذی روح نہ جانتا ہو گا۔ ما کب ہنستی ہے، کب غصہ کرتی ہے، کب پریشان ہوتی ہے، اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ ما کی تیوریاں تک پہچانتی تھی۔ ہاں ان تیوریوں کا اشارہ مانتی نہیں تھی تو یہ دوسری بات تھی۔ اس بار بھی اس نے ما کی روپوش مسکراہٹ کو اندرونی آنکھوں سے پڑھ لیا۔ فوراً خوشی سے چیخیں مارتی لحاف سے برآمد ہوئی اور ما کے گلے میں جھول گئی۔

جب وہ دونوں پلنگ پر بیٹھیں تو اس نے پھر ما کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوشی سے بےقابو ہو کر کہا:

"میں رمیش سے... رمیش سے ہی بیاہ کروں گی۔"

ما کو اسی بات کی توقع تھی۔ دونوں بانہوں سے بڑکی کو پرے دھکیل کر ما نے ماتھا پیٹا۔ "پچھلے چھ مہینوں میں یہ بارھویں بار تم مجھ سے کہہ رہی ہو۔ اس بکواس کا میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتی۔"

"نہیں نہیں ما۔ اس بار یہ بالکل سچ ہے!" بڑکی نے بسور کر کہا۔ پھر وہ شدید رومانی ہو گئی۔ خلاؤں میں تکنے لگی۔ "میرے اور رمیش کے درمیان ایک کیمیکل ری ایکشن ہو رہا ہے ما!" اس نے اونٹ کی طرح گردن چھت کی طرف اٹھا کر کہا۔

"چپ! چڑیل۔" ما نے ڈانٹا۔ پھر زچ ہو کر بولی۔ "دیکھ بڑکی! کیمیکل ری ایکشن ہو رہا ہو یا ایٹمی دھماکا ہو رہا ہو۔ میں یہاں تجھے رومانس وغیرہ نہیں چلانے دوں گی۔ اور بیاہ! ایک نہیں ہزار بار کہہ دیا ہے پہلے پڑھائی پھر بیاہ۔ تم نے آتے وقت وعدہ کیا تھا کہ روز پڑھو گی۔ سپلیمنٹری آئی ہے۔ لڑکی دسویں فیل! کیا میرے جنم میں ٹھکوائے گی؟"

"میں دسویں پاس کر لوں گی۔" بڑکی جنکھاڑی۔ "کہا نا!"

Scanned with CamScanner

"جب سے آئی ہو میں نے ایک بار تمہیں کتاب کھولتے تک نہیں دیکھا۔ سوٹ کیس بھر کتابیں میں ڈھو کر لائی ہوں۔" ما کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ بڑکی سہم گئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا،

"میں رمیش کے ساتھ اس کے گھوڑے پر کل سویرے سیر کے لیے چلی جاؤں؟"

"نہیں!" ما نے کہا۔ "اکیلے اس کے ساتھ کہیں جنگلوں میں جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ اور نہ تم شام کو کیقباد کے گھر جاؤ گی۔ اور اب بیاہ کی بات کی تو میں طمانچا رسید کروں گی تمہارے منہ پر۔" ما نے غصے سے ڈانٹا۔ بڑکی کا منہ اتر گیا۔

بڑکی نے دانت پیس کر کہا، "آشہ کو پتا رہے پیں بد۔"

ما نے کوئی جواب نہ دیا۔ زور سے دروازہ بند کر کے چلی آئی۔ بڑکی اس کی رازدار بیٹی تھی۔ با کے ریٹائر خطمی ہونے پر وہ مل جل کر ہنس سکتی تھیں۔ لیکن ما کو کوفت بھی ہوتی تھی۔ غصے میں بڑکی نے جان بوجھ کر ما کے چٹکی لی تھی۔ ما با کی حرکتوں پر بڑکی کے آگے شرمندہ ہو گئی۔ بڑکی نے بھی آج اچھی حرکت تو نہ کی تھی۔ یوں چپ چاپ غائب ہو جانا واقعی غیرذمےداری کی بات تھی۔ حالاں‌کہ بڑکی بچی ہی تو تھی۔ پھر بھی وہ با کے آگے شرمندہ ہو گئی تھی۔ ملاجلا غصہ اسے بڑکی پر ہی آیا۔

شام تک چیکو کا بخار اتر گیا۔

شام کو کیقباد کے گھر وہ بچوں کو نہ لے گئی۔ اس نے بڑکی سے بات چیت بند رکھی۔ کیقباد وسیع لان میں گجراتی جھولے پر جھول رہے تھے۔ بات لمبی نہ کرنے کے لیے وہ سفر میں کسی کو اپنی جلاوطنی کے بارے میں کچھ نہ بتاتے تھے۔ بس یوں کہہ دیتے تھے کہ دلّی سے آئے ہیں؛ کسی اسکول کالج میں پڑھاتے ہیں۔ دوسری بار کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ کسی کو کیا پتا چلتا ہے! ان کے چہرے مہرے، بول چال والے، ہزاروں لاکھوں مسلمان تو رہتے تھے انڈیا میں۔

کیقباد پارسی تھے۔ بمبئی میں رہتے تھے۔ ان کے دادا یا پردادا نے یہ ولا بنائی تھی۔ پھر ایرانیاں بیکری بن گئی۔ سارے سال دھندا مندا ہوتا ہے۔ بس سیزن میں رونق ہوتی ہے۔ کیقباد گجراتی پارسی تھے۔ رمیش کے ڈیڈی سے خاندانی دوستی تھی۔ رمیش کے ممی اور ڈیڈی ممی اچھے ولائتی عطر سے مہکتی، سونے کے زیوروں میں دمکتی، کشیدہ ابروؤں کی بیچ چوڑی بندی لگائے ہوئے ڈیڈی لہجے سے میٹھی معلوم ہو رہے تھے۔ اور ما سے خوش اخلاقی کی بھلی باتیں کرنے کے دوران وہ آپس میں نہ سرعت "سوں چھے"، "کیم چھے" کہتے ہوئے تبادلۂ خیالات کرتے جاتے۔ رمیش وہاں کچھ دیر بعد پہنچا تھا اور اب لکڑی کے تختے کی طرح سیدھا بیٹھا تھا۔ چھ مہینے میں بارھویں بار ما نے بڑکی کے پسندیدہ لڑکے کو شوق سے دیکھا۔ حالاں‌کہ وہ خوب جانتی تھی کہ یہ سب بڑکی کی بچپنے کی باتیں ہیں، لیکن پھر بھی شوق سے دیکھنے سے باز نہ آئی تھی۔ بس یوں ہی۔ بےوقوفوں کی طرح۔ لڑکے میں، ماسوا لڑکا ہونے کے، پسند آنے والی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑکی کے لیے تو لڑکے کا لڑکا ہونا کافی ہوتا تھا۔ لیکن لڑکے تو یہاں

پہاڑی پر بہت سے آئے ہوئے تھے۔ پھر آخر رمیش ہی کیوں؟

"تم نے اس کا گھوڑا دیکھا؟ اس کا گھوڑا؟" بڑکی نے منہ بسور کر تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔

"تو گھوڑے سے کر لے بیاہ!" ما نے پھٹکارا تھا۔ پھر اس نے بڑکی کو سمجھایا،

"یہ گھوڑا وہ ترائی میں نہیں لے جائے گا۔"

مسٹر کیقباد نے کیک پیسٹری کے بعد انھیں سینڈوچز کھانے کی دعوت دی۔ گہری زعفرانی مراٹھی میٹھی ڈش، ایک بڑی قاب میں ایک حسین اور جواں لڑکی لے کر آئی۔

خاموش اور پُرسکون لڑکی نے میز پر پیالے اور چمچے قرینے سے رکھے۔ اس کے لبوں پر ایک نامعلوم سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے کم قیمت مگر صاف ستھری ساری باندھ رکھی تھی۔ سینڈوچز بہت مزےدار تھا۔

"کس نے بنایا؟" ما نے شوق سے پوچھا۔

مسٹر کیقباد مسکرائے۔ لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولے،

"گھر کی مالکہ نے، اور کس نے۔"

لڑکی اسی طرح خاموش، پُرسکون، مسکراتی رہی۔

مہمان کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ لڑکی برتن لے کر چلی گئی۔ تب شرمندگی مٹانے کے لیے رمیش کے باپ نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا،

"یہ ورلی لڑکی کب سے ڈال لی؟ ہیں؟"

"ہا؟ یہ تو تین چار سال سے..." کیقباد ہنسا۔ ما کو یہ بےحیائی لگی۔ "مگر سال میں بس دو مہینے کی بیگم۔ کیا سمجھے؟" کیقباد نے کہا۔

"اور بچے اتنے سب؟" رمیش کے ڈیڈی نے پوچھا۔

"او ہو ہو... ہاں!" کیقباد خوش دلی سے ہنسا۔ "گائب کر دیتا ہوں اس کو۔ ایک دم گائب۔ زمیں کے نیچے۔ ایکدم انڈرگراؤنڈ۔" وہ اونچا اونچا ہنسنے لگا۔

"کہاں؟ جنگل میں؟" با اور رمیش کے ڈیڈی خوشی سے ہنس رہے تھے۔ ما اور رمیش کی ممی میزبان کے لحاظ میں کھسیس کاڑھ رہی تھیں۔ کیقباد نے اپنا داشتہ رکھنے کا راز مہمانوں کی مرضی کے بعیر، کسی مذاق کی طرح ان کے سر پر دے مارا تھا، اور اب انھیں بھی اس کو مذاق ہی کی طرح لینا تھا۔ رمیش انھیں بونگوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ گناہ اور ڈھٹائی کی یہ دنیا اس کی اپنی معصوم، بھولی بھالی دنیا سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تھی۔ یا شاید صرف چند برسوں کے فاصلے پر۔

"غار میں۔ غار میں۔" کیقباد نے زمیں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا غار بھی ہیں؟" ما نے حیرت سے پوچھا۔

"مذاق کرتے ہیں بد۔" رمیش کے ڈیڈی نے ہنس کر کہا۔

Scanned with CamScanner

"یہی غار تو ہیں۔" کیقباد نے ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "برابر ہیں غار۔ کیوں نہیں ہوں گے؟" اس نے کہا۔

ooo

"اور اگر بچہ ٹھہر جائے... تب؟"

ما نے یہ سوال دیر تک چپ رہنے کے بعد با سے پوچھا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ تیزی سے ادلتی بدلتی پگڈنڈیوں پر اپنی ولا کی طرف آ رہے تھے۔ جب وہ کیقباد کے گھر سے رخصت ہوئے تھے تب صاف اجالا تھا۔ پگڈنڈی کا ایک موڑ کاٹا اور اچانک اندھیرا۔ گویا وہ وقت کے کسی علاقے کو اچانک پار کر گئے ہوں۔ سورج اچانک ڈوب گیا۔ جیسے پہاڑوں پر ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساتھ لائی ٹارچ کام آئی۔ اب وہ سوئے ہوئے درختوں کی شاخیں احتیاط سے پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھ رہے تھے، درختوں کے تنوں اور اندھیرے پتوں کے پراسرار گچھوں میں خوابیدہ جانداروں کو اچانک بیدار کرنے سے خوفزدہ۔ فاصلے سے ولا کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ٹرانزسٹر ریڈیو بج رہا تھا۔

"انتظام کرتے ہیں..." ذرا توقف کے بعد اندھیرے میں با کی آواز آئی۔ "رکھیلوں کے ساتھ کچھ انتظام تو کرنا پڑتا ہے۔" با نے سکون سے کہا۔ اس کی آواز میں پُراعتماد دنیاداری تھی۔

ما پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا پیر رپٹ رہا تھا۔ لیکن اسے سہارا کون دیتا! اس وقت اگر کوئی بھوت بھی ہوتا تو ما اس کی بانہہ تھام کر جلد سے جلد ولا پہنچ جاتی۔ اسے فکر ہونے لگی تھی۔ جگنو کو پھر سے بخار تو نہیں ہو گیا۔ ایک اور موڑ کاٹا تو سامنے واقعی بھوت سا نظر آیا۔ ٹارچ کی روشنی دو مردانہ قدموں پر پڑی۔ با نے ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ ارے، سواجی!

سواجی لنکی والا چپ چپاتے ولا کی طرف جا رہا تھا۔

"اس وقت کہاں؟" با نے دوستی سے پوچھا۔ وہ محنت کش طبقے کے ہر آدمی سے پل بھر میں دوستی کر سکتا تھا۔ کوئی ایسا گر آتا تھا اسے۔

ما نے جلدی سے بات بنائی۔ "لنکی چلا کر آ رہا ہو گا۔ پانی ختم ہو جاتا ہے شام تک۔"

سواجی کو سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہیں! وہ آ رہا تھا کہ جا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی آنکھیں چمکیں۔ موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں آپ کو دوسرا راستا بتاتا ہوں۔ یہ بہت لمبا ہے۔ چلیے میرے ساتھ۔"

وہ انہیں ایک چھوٹے مگر زیادہ مشکل راستے پر لے چلا۔ لمبے ڈگ بھرتی ما سب سے آگے نکل گئی۔ وہ ڈال پکڑ پکڑ کر جلد سے جلد اوپر پہنچنا چاہ رہی تھی۔ شاید ڈال ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پل بھر میں وہ سواجی کی بانہوں میں تھی، جس نے ما کو کھٹ سے جھیل لیا تھا۔

دوسرے ہی پل وہ الگ ہو چکے تھے۔ ما کے نتھنوں میں پسینے اور میل کچیل کی ملی جلی

مردانہ خوشبو رہ گئی تھی۔ کوئی پرندہ گھونسلا بدل جانے سے بےچینی اور وحشت سے پھڑپھڑایا۔ [illegible] وہ ولا تک پہنچ ہی چکی تھی۔ شاخوں میں تقریباً جھولتی، لمبے سے لمبے قدم بڑھاتی، وہ ولا کی [illegible] تک جا پہنچی۔ ورانڈے کے بلب کی کمزور روشنی احاطے میں پھیلی تھی۔ [illegible] اس کی گود میں جگنو۔ آشا جگنو کو کھانا کھلا رہی تھی۔

"بخار تو نہیں ہوا اسے؟" اس کی طرف لپکتے ہوئے ما نے پکارا۔ کتنی اچھی تھی آشا! کیسے پیار سے سمیٹے بیٹھی تھی جگنو کو، ننھے بھر کو۔ آشا کی گود میں جگنو، ما کی آنکھ میں تصویر سا [illegible] لگتا ہے جیسے وہی اس کی ماں ہے۔ یہ خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح چمک کر غائب ہوا۔ وہ ان کے پاس پہنچ چکی تھی۔

"نہیں دیدی" آشا نے جگنو کو ما کی گود میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے لیے کھانا لانے چلی گئی۔

جگنو [illegible] جیسے گھڑی دیکھ کر، ان [illegible] پتا چلا ان کے نکلنے کے فوراً بعد [illegible] جانا چاہا۔ مگر [illegible]

"نہیں! [illegible]"

[illegible] کیقباد کے گھر آیا تھا۔ مگر [illegible] نے قیاس [illegible]

[illegible] اور [illegible] اس نے آواز میں [illegible]

[illegible] کھڑکھڑایا تو وہ بھاگی۔

[illegible] وہ منہ بھر بھر کر چیونگ گم [illegible] اور بھوک رہی تھی۔

"[illegible]" وہ تلملائی۔ "ڈیموکریسی... اب لوگ [illegible]" اس نے [illegible] "[illegible]" اس نے کہا۔

ما نے [illegible] کی طرح خاموش ہو گئی۔

ولا میں [illegible] "سواجی [illegible] واپس چلا جاؤں گا۔" ما نے بتایا۔

"ہوں" [illegible] اور [illegible] کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کھانا کھانے کے بعد بجھا [illegible]

بڑکی کھانے پر نہ آئی، ماں نے بھی نہ بلایا۔ ایک رات کھانا نہ کھانے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا، ما نے کٹھورپن سے سوچا۔

کِکلی کو سلا کر، خبروں کے لیے ٹرانزسٹر لگایا۔ بھیونڈی کے فسادات کا ذکر نہ تھا۔ کئی منتری کئی دوسرے منتریوں سے ملے تھے، ان کی ہی کتھا سناتی رہی نیوزریڈر۔ ما اور با نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ختم ہو گئے ہوں گے فساد،" با نے پُرامید ہو کر کہا۔ "کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

"کپڑامنتری رکھشامنتری سے ملے،" نیوزریڈر نے کہا۔ ما اور با پل بھر خاموش رہے اور پھر زور سے ہنس پڑے۔ انھوں نے چشم تصوّر سے ایک کپڑے کا گڈا اور ایک رکشا چلاتا آدمی دیکھا تھا۔ ان لفظوں سے ان کی زندگی بھر کی، دوسری طرح کی پہچان انھیں ایسا ہی دکھا سکتی تھی۔

کمرے میں۔ بستر پر۔ با کے ساتھ۔ (ما نے ورانڈے کی بتّی بجھا دی تھی۔) جب انھیں یقین ہو گیا کہ پورا سنسار سو چکا ہے، تب انھوں نے اپنی بیدارحواسی کھو دی۔ ما نے اپنی آپ کو سواجی لنگی والے کے سپرد کیا۔ ایک پل کے سیس لانگ، ابزی سے جولی تک کی لمس میں اس پر یہ حیران کن انکشاف ہوا تھا کہ صرف دیکھنے ہی میں نہیں، چھونے میں بھی سواجی لنگی والا با کے جڑواں بھائی جیسا تھا۔ وہی لانبا قدبُت، چکنی چھاتی، لمبی لمبی ٹانگیں اور گھنے بال۔ مگر وہ با نہ تھا۔ وہ اس کے سنگ جو چاہے کرے۔ انھیں ایک دوسرے سے محبت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بس ایک بدن تھا۔ اس میتھن سے بچہ بھی نہیں ہو گا۔ ما نے سکون سے سوچا تھا۔

با نے آشا کے سنگ محیرالعقول جیسی کارنامے انجام دیے۔ پھر اس نے ما کی طرف دیکھا۔ ما ہموار سانسیں لیتی لیٹی رہی۔ اب با کیا کرے گا؟ اس نے شدید تجسس سے سوچا۔ تصوّر میں دوسرے آدمی کے ساتھ ہو کر ما کے دل پُرسکون ہو گیا تھا۔

با بستر سے اٹھا۔ ٹٹول کر چپل پہنے اور ذرا سی بھی آواز کیے بغیر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

ما اندھیرے میں جی بھر کر مسکرائی۔ تھوڑی دیر میں فاصلے سے دبی دبی آوازیں۔ ذرا سی دیر میں با واپس آ چکا تھا۔ اس کا سارا اعتماد کہیں چکناچُور ہو گیا تھا۔ بھونڈے پن سے دروازہ کھولا تو اندھیرے میں زور سے چرچراہٹ ہوئی۔

"کیا ہے؟" ما نے سوئی آواز بنا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ باتھ روم،" با نے بڑبڑا کر کہا۔

ما نے لمبی سانس لی۔ تو معلوم ہو گیا با کو، آشا کی کوٹھری میں کون ہے۔ اس نے دل میں ہنس کر سوچا۔ تھوڑی دیر میں دونوں سو گئے۔

ooo

بدھ وار۔

"اب میری باری،" ما نے کہا۔

اس نے بچوں کی ایک نہ سنی تھی۔ بڑکی پر بدقلبی نظریں ڈالی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ ایک دن صرف اپنے لیے نکال ہی لیتی تھی۔ ہر بات میں تھوڑے سے، بالشت بھر حصّے پر میرا بھی حق ہے۔ برسوں پہلے اس نے منطقی سے فیصلہ کیا تھا۔ ما نے پہاڑ گھومنے کا یہ دن چُنا تھا۔ چیکو ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا اور فرش پر کھیل رہا تھا۔ کِکلی جھولنے پر بیٹھی تھی۔ بڑکی منہ تھتھائے بستر میں پڑی چھت کو ٹکر ٹکر تک رہی تھی۔ ما نے ذرا پروا نہ کی۔ وہ با کو ساتھ لے کر نکل کھڑی ہوئی۔

چھوٹی بڑی سات پہاڑیاں تھیں جنھیں ملا کر یہ پہاڑی اسٹیشن بنایا گیا تھا۔ ولا ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھی۔ پگڈنڈیوں سے اترتے اور چڑھتے وہ سب سے اونچی پہاڑی کی چوٹی کی طرف جا رہے تھے۔

بس اسٹاپ پر ورلی عورتیں اور مرد قلی۔ بسوں میں سامان لادتے ہوئے، جانے کیوں ما کو لگا جیسے اچانک کئی سیاح واپس جا رہے ہوں۔

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے انھوں نے کاشٹے کے لنگوٹ باندھے ورلی عورتوں کو ایک قطار میں بوجھ ڈھوتے دیکھا۔ ما ان سے باتیں کرنے لگی۔

"آج شاید بارش ہو،" اس نے آسمان پر اوڈے بادلوں کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"بارش؟ ابھی کہاں،" قلی عورت نے کہا۔ "یہ مہینا جائے، تب بارش ہو گی۔ تب تو یہاں آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔"

"کیوں؟" ما نے حیرت سے کہا۔ "پہاڑ پر تو بارش بہت اچھی دکھتی ہو گی؟"

"اس پہاڑ پر نہیں،" ورلی عورت ہنسی۔ "بارش ہو گی نا بائی، تو یہ ساری مٹی بہ جائے گی۔" اس نے سرخ مٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ما اور ورلی آدھی بات اشاروں میں کرتے تھے۔

"کیا سچ مچ؟ واقعی؟"

"ہاں۔ مٹی بہ جاتی ہے۔ پھر نکل آتا ہے پتھر۔"

تبھی شاید یہاں کچھ اگتا نہیں۔ ما نے حیرت اور کچھ تاسّف سے سوچا۔ جامنوں کے جھنڈ اور اکّادکّا جھاڑجھنکار کے سوا، ان پہاڑوں پر ہریالی نہ تھی۔ ما نے چشم تصوّر سے ساری سرخ مٹی کو بہ جاتے دیکھا۔ اس نے تصور کیا جیسے پہاڑ کی سفید سفید ہڈیاں نکل آئی ہوں۔ جیسے بدن سے سرخ گوشت کی پرت ہٹ جائے۔ شاید ایسا نہ ہوتا ہو گا، اس نے خیال کیا۔ پہاڑ کی چوٹی سے، آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر، ما نے دور دور نظر دوڑائی۔ چاروں طرف مہاراشٹر کے مغرور، سنجر، باسالٹ کے اونچے ہیبت ناک پہاڑ اپنی قدیم خاموشی میں کھڑے تھے۔ دور دور تک پانی کا، کسی ندی نالے کا نام نشان نہ تھا۔

"تب پانی کہاں سے آتا ہے یہاں؟" اس نے سرگوشی میں، گویا خود سے پوچھا۔

"کنواں کھودتے ہیں۔" سواجی لنگی والے نے بتایا تھا۔

"اور یہ اتنے گھنے ترائی کے جنگل؟"

"ہوں ہوں؟" بھنٹی میں، سنچری بازار کے پاس، پارٹی آفس میں کامریڈ گوینکر نے بتایا۔ "اسی کارن مراٹھے جنگجو بن گئے۔ یہ علاقہ زرخیز نہ تھا۔"

"غیرت کے مارے نہیں؟"

وہ ہنسے۔ "پتا نہیں۔" پھر انھوں نے کہا، "غیرت تو سب میں ہوتی ہو گی۔ میرا مطلب ہے، زرخیز میدانی علاقوں میں بھی۔ لیکن وہاں کے لوگ جنگجو نہیں ہوتے۔ اب اپنے پنجاب ہی کو لیجیے۔ اتہاس میں مستقل باہر کے لوگ حکومتیں کرتے رہے وہاں۔ اور مضبوط باڑ کے پنجابیوں نے انھیں کچھ بھی نہ کہا۔ ذرا بھی نہ لڑے۔ تو کیوں؟"

"کیوں نہ لڑے پنجابی؟" ما نے خودکلامی سی کی۔

"زمین زرخیز تھی۔" گوینکر ہنسنے لگے۔ یہ تھی اصل وجہ، نہ لڑنے کی!

"پھر سترھویں صدی میں، اسی سرزمین سے سواجی مرہٹہ اٹھا اور طوفان کی طرح ہندوستان پر چھا گیا۔ مغلوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا۔"

"عجیب و غریب تحریک تھی۔" کتابوں میں پڑھی تاریخ کو یاد کرتے ہوئے ما نے تبصرہ کیا تھا۔ اسے سواجی کا دھوکے سے اورنگ زیب کے سپہ سالار، فضل خاں کو قتل کرنا یاد آیا۔ مغلوں کے اس ہندوستانی سپہ سالار سے معانقہ کیا تھا سواجی نے، اور پشت میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ "ایک ہی حضرت تھے سواجی بھی۔"

"اوہ! وہ..." گوینکر ہنسے۔ "سو تو ہر مراٹھی ہندو، اور ہر مسلمان کو آج بھی یاد ہے۔"

"مگر جے سنگھ کے ہاتھوں سواجی کی شکست کسی کو یاد نہیں۔" ما نے تبصرہ کیا۔ اس کی دلی تمنّا تھی کہ ان جنگوں کو مذہبی رنگ میں نہ دیکھا جائے۔ (لیکن اس کی دلی تمنّا کی کسے پروا ہو سکتی تھی؟) سواجی نے ہندو دھرم ہی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ دیش کی آزادی کا، گئورکھشا کا، ہندو دھرم کا۔ مراٹھا گوریلے نے باہمنوں کا شودروں تک کے ساتھ ملاپ کرا دیا تھا۔ کیسا رومانی کردار تھا سواجی کا! جے سنگھ کے ہاتھوں گرفتار ہو کر، اورنگ زیب کی قید سے پھلوں کی ٹوکری میں چھپ کر فرار ہونے والا، نڈر، زیرک، پھرتیلا جنگجو! پھر کیا تعجب ہے کہ مراٹھی مائیں اپنے بیٹوں کا نام سواجی رکھتی ہیں! اگر وہ مراٹھی ہوتی تب؟ لیکن اس کے دل نے کہا کہ وہ چیکو کا نام سواجی نہ رکھتی۔ لڑائی جھگڑے اسے پسند ہی نہ تھے۔ کیا رکھتی وہ چیکو کا نام، اگر وہ مراٹھی ہوتی تب؟

"جنانی ایشور،" گوینکر نے مدد کی۔ "شاعر تھے۔ بھگود گیتا کا مراٹھی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح مراٹھی زبان کی نوک پلک ٹھیک ہوئی۔ عجب اتفاق تو یہ ہے،" انھوں نے کہا، "سواجی سے دو صدی پہلے بھگتی تحریک ہندوستان کے انھی پچھمی گھاٹوں سے نکلی، جسے آج مہاراشٹر کہتے ہیں۔ گیتا کو مراٹھوں نے سنسکرت سے پہلی بار عوامی بولی میں لکھا اور اس کا پیغام تھا محبت۔"

"جنانی ایشور باہمن تھا؟" ما نے تجسس سے پوچھا۔ "آریا؟"

"ارے نہیں بھئی۔ سب برہمن آریہ کہاں تھے! کتنے ہی تو یہیں آدی واسی ہیں۔"

"آدی واسی؟ وہ باہمن کیسے ہو گئے؟"

"قبیلوں کے سردار ہو جاتے تھے باہمن۔" گوینکر نے سمجھایا۔ "باہمنوں کو پیسے دے دلا کر۔" (سیدھی سی بات تھی، ما کی سمجھ میں کیوں نہ آئی؟) "ایک بڑا سا سونے کا برتن بنایا جاتا تھا، گویا سمجھو گربھ۔ سردار اس میں بٹھایا جاتا۔ بڑا سا پوجا ہوتا۔ پھر سردار باہر نکلتا۔ گویا دوبارہ پیدا ہو رہا ہے۔ بس ہو گیا برہمن! اسے ہرنیہ گربھ کہتے تھے۔ یعنی سونے کا گربھ۔"

"اچھا! جاتی بدل جاتی تھی؟" ما نے خوش ہو کر کہا۔ پھر وہ بڑبڑائی، "ہماری طرف بھی کتنے شیخ پاکستان جا کر سید ہو گئے۔"

"تب آدی واسی ہندوؤں میں مل گئے ہیں کیا؟" اس نے سوچ سوچ کر کہا۔

"بے شمار۔"

"شودر ہو کر؟"

"نہیں تو! کتنے ہی تو اونچے ہندوؤں میں شامل ہیں۔"

وہ سوچتی رہی۔ الغرض کہ ایک لمبی چوڑی کھچڑی پک چکی ہے۔ [illegible] کھچڑا۔

"تو پھر یہ کون ہیں؟ یہ آدی واسی؟"

"یہ جو رہ گئے۔"

سواجی کی ہندو دھرم کی تحریک کا ساتھ باقی ہندوؤں نے نہ دیا۔ کیوں نہ دیا؟ ایک [illegible] سے [illegible] تھا۔ [illegible] کہ کچھ [illegible] تو، مراٹھوں کی نظر میں ہندو ہونا اور مراٹھا ہونا ایک ہی بات تھی۔ [illegible] دوسرے علاقوں کے ہندوؤں نے خاطرخواہ جواب نہ دیا۔

"کیا جواب دیتے؟"

"نہیں ہی تھا [illegible]"

"[illegible] جو اکثر سب [illegible] ہیں، تو یہ جو تحریکیں چلتی ہیں کہ ہم ہی سب سے بہتر، اور [illegible] اور [illegible]..."

"[illegible]" گوینکر مونگ پھلی کھانے لگے۔ پھر انھوں نے ما کو تسلی دی، "کبھی کبھی لوگوں پر [illegible] ہو جاتا ہے۔"

[illegible] سے [illegible] میں سر ہلایا۔ ما سے بہتر کون جان سکتا تھا؟ ما تو پاکستانی تھی۔

[illegible] [illegible] بعد [illegible] میں ہوتی نہیں۔ اس وقت تو ما نے صرف ایک لمبی [illegible] کی [illegible] جو [illegible] کسی سمت رواں دواں ڈوبے کی اچانک منجمد ہو جانے والی [illegible] کی طرح [illegible] اداسی سے واپس لوٹنے لگی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی

تھی کہ اس کا دل اتنا بھاری کیوں ہے۔ جب تک ہوا کا ایک جھونکا سرسراتا ہوا نہ گزرا۔ کب سے اس کی نظر جامن کے تنے سے پھوٹتی شاخ پر لگی تھی۔ ہوا سرسراتی گزری تو بھاری، گھرے کاہی رنگ کے پرانے پتوں پر اثر نہ ہوا۔ بس ایک نوخیز ہلکے دھانی رنگ کا پتّا مضراب سے چھیڑے تار کی طرح شدت سے لرزنے لگا۔ ما کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کی آنکھوں میں پانی امڈ آیا۔ "بڑکی" اس نے سوچا۔ "بڑکی" اور پچاسویں بار اپنی بیٹی کو کبھی نہ ڈانٹنے کا عہد کیا، جسے وہ نبھا نہ سکے گی۔

با آگے آگے جا رہا تھا۔ آشا کی کوٹھری میں سواجی کو دیکھ کر اس کی ہمت پست نہ ہوئی تھی۔ دوسری بار سوچنے پر تو موقع اور بھی شاندار تھا۔ جب کہ عورت ہے ہی ایسی، تو پھر اب کیا مشکل تھی؟ اب تو مسئلہ صرف سواجی کو ایک آدھ دن کے لیے کسی بہانے ادھر اُدھر کر دینے کا تھا۔ اس کا ذہن ترکیبیں سوچ رہا تھا۔

ما سر جھکائے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔ پریشان اور اکتائی ہوئی عورت! پہاڑ کی خوشگوار اوزون بھری ہوا نے بڑکی اور با کی جسمانی امنگوں کو بےمہار کر دیا تھا جو سرپٹ دوڑی جا رہی تھیں اور ان میں کسی کا بھی رخ اس کے ذہنی سکون اور اس کے وجود کے اثبات کی طرف نہ تھا۔ دو رات پہلے ہی بےوقوف بڑکی مکالمے بول رہی تھی:

"آپ تو با کے ساتھ آئی ہیں۔ اور میں؟ میں کس کے ساتھ آئی ہوں؟"

"تھنّی اپنے بھیّا کے ساتھ۔"

"اوں ہوں۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟" بڑکی شرمندہ ہو کر اور بھی جھنجھلاتی تھی۔ "آپ تو ان سب کے ساتھ آئی ہیں۔" اس کی نظر میں فی الحال دنیا جوڑے جوڑنے کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔

"میں کسی کے بھی ساتھ نہیں آئی ہوں۔" اس نے کہنا چاہا تھا۔

ٹنکی جل گئی۔ پانی کی ٹنکی۔ صبح سویرے با اور سواجی ولا کی چھت سے لٹکے، ٹنکی میں ہاتھ ڈال کر کوئی اسکرو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیچے وہ سب کھڑے تھے، آشا، ما، اور تینوں بچے۔ با اور سواجی کے آدھے دھڑ ٹنکی میں گھسے ہوئے تھے۔ وہ سب آنکھوں پر سایہ کیے اوپر تک رہے تھے جہاں چار لمبی ننگی مردانہ ٹانگیں الجھ رہی تھیں۔ سانولی، لمبی، بالوں بھری ٹانگیں۔

بہرحال ما با کی ٹانگوں کو پہچان سکتی تھی (گو وہ اس سے کوئی دلی مسرّت محسوس کرنے سے قاصر تھی۔) کیا آشا پہچان سکتی ہے؟ اس نے تجسّس سے آشا کو تاکا، اور مایوسی سے محسوس کیا کہ آشا کا چہرہ پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس کے خیالات کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ کب نفرت محسوس کرتی ہے، کس سے محبت کرتی ہے، کس بات سے خوش ہوتی ہے، کس بات پر اسے غصہ آتا ہے؟ ما یہ سب بالکل نہیں سمجھ پاتی تھی۔ اس کے چہرے پر سدا

یکساں شانت تاثر رہتا۔

لیکن با کی مراد بر آئی تھی۔ چھت سے چھلانگ لگا کر، کمرے کی منڈیر پر کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ ٹنکی ٹھیک ہونے کے لیے جی فاضل پرزوں کی ضرورت ہے -- اور جو جل گئے ہیں -- وہ اس پہاڑ پر دستیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا سواجی کو ترائی میں قریب ترین اسٹیشن جانا پڑے گا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے، جب دو مردوں کے آدھے دھڑ ٹنکی میں گھسے تھے اور ان کے الٹے لٹکے سروں کے نیچے تاریک پانی بلبلے بنا رہا تھا، تب انھوں نے کیا باتیں کی تھیں، اور با نے سواجی کو کیا پٹی پڑھائی تھی۔ یوں بھی آشا کوں سی سواجی کی بیاہتا تھی۔ وہ تو سواجی کی محبوبہ بھی شاید نہ تھی۔ سواجی یوں ہی اس کے پاس آ جاتا تھا۔ جو روپے با نے دوڑ کر اسے کمرے سے لا کر دیے، اس کو شاید مفت میں مل گئے۔ دھوتی کا لنگوٹ کسے، سواجی ہنستا مسکراتا ولا کی ڈھلان اتر گیا۔ جامنوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ بچے سیر پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

"پانی زور لگا کر کھینچنے سے پہاڑی پر مشین باربار جل جاتی ہے بائی۔" آشا نے ما سے کہا۔

"پہلے بھی جلی ہے کیا؟"

"ارے ہاں! بہت بار۔"

"تب تم پانی کہاں سے لاتی ہو؟"

"نیچے سے۔ کنواں ہے وہاں۔"

"اچھا... تو۔" ما نے فیصلہ کیا، "ہم تم دونوں نیچے کپڑے دھونے چلیں گے۔ با بچوں کو اکیلے سیر کرا لے گا۔"

آشا اور ما احاطے میں کھڑے تھے۔ بڑی بڑی ہلکی بھوری آنکھوں والا ایک بھورا سا لنگور، بےتحاشا لمبی دم سانپ کی طرح پھنکارتا، عین ان کے سامنے زمین پر دھم سے کودا۔ ہلکی سی چیخیں مار کر دونوں عورتیں پیچھے کی طرف دوڑیں۔ محفوظ فاصلے سے جھانک کر دیکھا تو لنگور زمین پر قلابازیاں سی لگا رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" ما حیران تھی۔ پھر اس نے غور سے دیکھا۔ لنگور کے منھ پر چیونگ گم لپٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پر بھی چیونگ گم سن گیا تھا، ربڑ کی لمبی سی تار کی طرح۔ لنگور باربار اسے منھ کے نزدیک لاتا اور دور لے جاتا۔ تار اور بھی لمبا ہوتا جاتا۔ ذرا سی دیر میں اپنےآپ کو لنگور نے چیونگ گم کی ڈوریوں میں باندھ لیا۔

ما تھوڑی دیر دیکھا کی۔ پھر ہنسی سے دوہری ہو گئی۔ بڑکی کے تھوکے چیونگ گم، جامنوں کے نیچے۔ اسے یاد آیا۔

یہ لنگور با ہے، اس نے سوچا، اور یہ چیونگ گم... یہ چیونگ گم، مَیں۔

با کی ایک نہ چلی۔ بچوں کو اسے اکیلے ہی گھمانے لے جانا پڑا۔ دونوں عورتیں میلے کپڑوں کی بالٹیاں سنبھالے پہاڑی اترنے لگیں۔ جب وہ ریلوے اسٹیشن جانے والی پکی سڑک تک پہنچیں

تو انھیں عینک پوش رمیش اپنے سفید گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ ما اور آشا خبردار ہو گئیں۔ انھوں نے راستے سے ہی خطرے کو لوٹا دیا۔ "برکی با کے ساتھ بازار گئی ہے۔ آج نہ مل سکے گی۔" انھوں نے کہا۔ مایوس لڑکا سر لٹکا کر واپس جانے لگا۔ لیکن وہ گھوڑا موڑ کر پھر واپس آیا۔

"آنٹی، یہ بہت ضروری تھا۔ دراصل ہم... واپس جا رہے ہیں۔"

ما حیران ہوئی۔ حالاں کہ اس کے دل سے بوجھ سا ہٹ گیا۔ شدید مطمئن ہو گئی ما۔ چلو ایک طرف سے تو فرصت ہوئی، اس نے سوچا۔ "ایسا تو تمھارے ممی ڈیڈی کا پروگرام نہ تھا؟" ما نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن... بمبئی سے فون آیا ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے۔" اس نے کچھ جھجھک کر کہا۔ پھر اس نے جیب سے کاغذ نکالا۔ "میرا ایڈریس ہے آنٹی۔ دے دیں گی نا آپ اس کو؟" اس نے ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔ ما کا دل پگھل گیا۔ "ضرور۔" اس نے کہا، اور کاغذ تہہ کر کے اپنے بلاؤز میں رکھ لیا۔ بمبئی میں تو ہرگز نہیں، اس نے دل میں سوچا، مگر دلّی پہنچنے پر وہ یہ پتا برکی کو دے دے گی۔ پھر اس نے اضافہ کیا، سپلیمنٹری کے بعد بھلے ہی قلمی دوستی کرے۔

"کیا آج ہی جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ شاید آج ہی۔"

ما نے کچھ سوچ کر کہا، "وہ لوگ بڑی مال روڈ پر گئے ہیں۔"

"تھینک یو آنٹی!" رمیش نے ایڑھ لگائی اور مشاقی سے اپنا شاندار گھوڑا دوڑاتا راستوں کے پیچ و خم میں اوجھل ہو گیا۔ رمیش کو دھوکا دے کر (وہ لوگ کسی دوسری طرف گئے تھے) یہاں برکی اور اس کی ملاقات کا امکان ختم کر کے دونوں عورتیں کچے راستوں سے سڑک سے نیچے اترنے لگیں۔ ما کو پہاڑی سے اس طرح اترنا نہ آتا تھا، جب کہ آشا ہرنی کی طرح چھلانگیں لگا سکتی تھی۔ ما باربار آشا کا سہارا لیتی۔ کون اس بات کو سمجھے گا اور جانے گا کہ سرخ پہاڑ کی پوری مشکل ڈھلان ما نے آشا کے سہارے طے کی۔

نیچے شاید کبھی ڈائنامائٹ سے پتھر اڑا کر شگاف ڈالے گئے تھے۔ وہ جیسے جیسے نیچے جا رہی تھیں، ہریالی بالکل ختم ہوتی جاتی تھی۔ ان کے چاروں طرف سرخ پتھروں کے شگاف بڑے بڑے دہانے کھولے ہوئے تھے۔ اس منظر میں خوبصورتی نہیں، ہیبت سی تھی، جو ادی واسی عورتوں کی چھوٹی بڑی ٹولیوں کی آمدورفت سے دب جاتی تھی۔ درمیانی شگاف کے بالکل تلے میں ایک بڑا تالاب سا تھا۔ کیا اسی کو کنواں کہتے تھے یہ لوگ؟ "کیا یہ بارش کا پانی ہے؟"

"نہیں، تازہ۔ برسات کا پانی تو مٹی میں پڑ کر ڈھٹیلا ہو جاتا ہے بائی۔ پینے جیسا نہیں رہتا۔ ادھر کی مٹی میں دھات ہے دھات۔ لوہا۔"

یہ لوہے کے پہاڑ ہیں! ما نے گرتے پڑتے سوچا۔ اس بنجر زمین سے روزی اینٹھتے یہ لوہے کے لوگ؟ اس نے خیال کیا۔ اور پھر اسے کچھ باتیں یاد آئیں۔

سروانچی کے فورمین نے انھیں بلایا تھا۔ زیرجیتیا۔ اور کون تھا؟ آٹھ دس دوسرے، بائی۔ مٹی کو روند کر نرم کرنے کے لیے۔ پانی پینے بھی نہیں جانے دیتا تھا۔ حرامزادے، گھر سے پانی پی کر کیوں نہیں آئے؟ سورج ڈوبنے لگا۔ بیل کھیتوں سے نکل گئے۔ پکڑ پکڑ کر لا رہے تھے۔ زیر نے کہا، کیسے رکھیں انھیں اس زمین پر؟ کانٹے ہیں، بہت کانٹے ہیں یہاں۔ کھاتےدار کے مہتا نے سن لیا۔ زیر کو ہل سے جوت دیا بائی۔ زیر تو بالکل سوکھا تھا۔ ہل کا بھارا نہیں چل سکا۔ مہتا نے بھالے سے چھید دیا۔ رکت ہی رکت اُبل رہا تھا۔ زیر نے دو بار پورے کھیت کا چکر لگایا۔ رکت مٹی میں مل گیا سارو۔ لال ہی لال ہو رہا تھا کھیت۔

کندھوں پر پیڑ رکھ کر دبا دیتے تھے۔ دو آدمی دونوں کندھوں سے لٹک جاتے۔ جھولنے لگتے۔ ورلی گر جاتا۔ سب کچھ مان جاتا۔

جانو کو زندہ گاڑ دیا تھا۔ جانو کے بھائی کی عورت پر آنکھ تھی۔ کھاتےدار کے آدمی لینے آئے تھے۔ جانو کوٹھری میں نہیں تھا۔ عورت نے جانے کی مرضی نہ دکھائی۔ بال سے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ شور سے سب واسی گھروں سے نکل آئے۔ آگ کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ چپ چاپ۔ اسے لے گئے۔ ہم تو سر جھکا کر روتے ہوئے اپنے اپنے جھونپڑوں میں آ گئے۔ دوسرے دن اس کا آدمی بولا، اس کی عورت کہاں گئی؟ اس نے کارپھاریوں کو بلایا۔ بستی کے بڈھوں کو۔ کھاتےداروں نے گڑھا کھودا۔ آدمی کو زندہ گاڑا۔ سب کے سامنے۔ جانو بچ گیا۔ جانو اور اس کی بھابی بستی سے بھاگ گئے تھے۔ کھاتےدار کہتا تھا، کسی نے ایک لفظ بھی کہا تو ٹانگ اور بازو کاٹ لیں گے۔ پھر بھی بات نکل گئی۔ انگریز کا زمانہ تھا بائی۔ اسپتال کے ڈاکٹر آئے۔ پولس آئی۔ گڑھا کھود کر ہڈیاں نکالیں۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا، جانور کے ہاڑ ہیں۔ کھاتےدار کو کون کچھ کہتا؟

ورلیوں کو کھیت پر مار۔ معاملت دار اور تلاٹھی ان کے اپنے تھے۔ مہتا سخت گیر۔ کہیں سے لائے تھے مہتا۔ ان کے مہتے ہوتے تھے، اور پٹھان۔ شریف خاں کا نام سن کر ورلی کا پیشاب نکل جاتا تھا۔ ہانک کر تھانے لے جاتے تھے۔ مہینوں بند پڑے رہتے۔ ان کی عورتیں دوسروں سے بچے کے ساتھ ہو جاتیں۔ ان کے بچے مر جاتے۔ بیمار ہو کر اور بھوکے رہ کر۔

کھاتےدار برجور کی زمینیں دھانوری گرام کے پاس تھیں۔ زمینیں کس کی تھیں، کون جانے؟ ورلیوں کی تھیں بائی۔ اکال پڑا تو الٹھ الٹھ آنے ایکڑ خرید لی تھیں کھاتےداروں نے۔ پانچ سیر چاول پر پوری زمین خرید لی تھی بائی۔ کھاتوں میں دیکھ لو۔ پرانے کھاتوں میں سب لکھا ہے۔

برجور کی زمین پر معاملت دار سالوک ٹھہرتا تھا۔ دوسرے وردی والوں کے ساتھ۔ برجور سیٹھ کے گھر ورلیوں کو بلایا گیا۔ تمھارے پاس بندوق ہے؟ انھوں نے پوچھا۔ ورلی بندوق نہیں جانتے تھے۔ ہی فوج میں جو گئی تھی ان کے پاس ہو گی۔ وہ یہاں کہاں تھی؟ وہ تنّھو گھرات کو گھیر کر لے گئے۔ تنھو کو مرغا بنایا۔ اس کی لنگوٹی اتار لی۔ اس کی گانڈ پر مٹی کا تیل ڈال دیا۔ آگ لگا دی بائی۔ تنھو گھرات جانور جیسا رو رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا چاروں طرف۔ ارے بندوق تو میرے دادا، پردادا، سگھڑ نکھڑدادا کے پاس بھی نہیں تھی۔ کہاں سے نکالوں؟ وہ ادھ موا ہو کر گر گیا۔ رات بھر تنھو گھرات وہیں پڑا رہا۔ برجور سیٹھ معاملت دار سے کہہ رہا تھا، ٹھیک مار نہیں دی! اس کی گانڈ میں ڈنڈا ڈال کر ذرا ٹھونکتے، ایک چھوڑ دو بندوقیں نکل پڑتیں۔

سچی بات بتاؤں بائی؟ چھوٹے وردی والے تک منھ چھپا چھپا کر رو رہے تھے۔ جب وہ اس کی ادھ موئی جان کو اس کی جھونپڑی کے سامنے پھینکنے لائے۔ ہے بھگوان! ان لوگوں کو چھما کیسے ملے گی؟

ہے بھگوان!

آشا کے باپ نے، بڈھے ورلی نے پانچ جماعت تک پڑھا تھا۔ کیسے پڑھا تھا؟ یہ ما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ کسی گوداوری مائی کا نام لیتا جاتا تھا۔

گوداوری، جو ما کے علم کے مطابق ایک ندی ہے۔ "کون تھی یہ گوداوری مائی؟"

"میں نے اس کو دیکھا تھا۔" ورلی نے کانکھتے ہوئے کہا۔ اس کی پوپلی بانچھیں کھل گئیں۔ "دیکھا کیا، ہمارے ساتھ رہی تھی رات بھر۔ رات بھر رہی تھی گوداوری مائی... یہیں تو گھومتی پھرتی تھی، سانجھ سویرے، یہ لمبی لاٹھی ٹیکتی۔"

"بڈھی تھی؟" ما نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ وہ تو پہاڑ پر چڑھنے اترنے کے لیے۔"

"آشا ابھی نہیں جنمی تھی۔ ایک سانجھ پڑے اسے بھگوان نے بھیجا۔" ورلی نے اوپر اشارہ کیا۔ "بھگوان نے بھیجا مائی کو۔ گوداوری مائی۔" وہ کوٹھری کی زمین کو بوسے دینے لگا۔

آشا کے باپ کا نام وٹھو تھا۔ کوئی گوداوری مائی برسوں پہلے اس کی جھونپڑی میں آئی تھی۔ اور اسے اب بھی کچھ کچھ یاد تھا۔ اس کے آنے سے اجالا ہو گیا تھا۔

ایک شام!

جنگل کے کنارے کنارے، وہ عورت نوگزی مراٹھا ساڑی لپیٹے، لمبی لاٹھی تھامے گھوم رہی تھی۔ ایک ننھے چرواہے نے اسے رات بتانے کے لیے پہاڑی پر جانے کو کہا تھا۔ لاٹھی کے سہارے وہ ڈھلان پر چڑھتی جگہ پتھریوں میں کوئی جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ تیرہ چودہ سال کے ایک ننگ دھڑنگ لڑکے نے اسے بتایا تھا۔ "میری بستی پاس ہے۔" عورت اس کے گھر رات رہنے کے لیے چل پڑی تھی۔

پہاڑی سے نیچے اترتے اترتے اندھیرا چھا گیا۔

وہاں ایک چھوٹی، آدی واسی بستی تھی۔ چھوٹی چھوٹی، نیچی چھت والی، بانس اور پھُوس کی جھونپڑیوں میں آگیں روشن ہو گئی تھیں۔ وٹھو کی جھونپڑی میں ہلچل مچ گئی۔ بڑا لڑکا کہیں سے کھٹولی لانے بھاگ گیا، چھوٹا لڑکا وٹھو کو بتانے۔ وٹھو گھر پر نہیں تھا۔ لڑکا کھٹولی لے آیا تو بائی نے کہیں بچھائی اور بیٹھ گئی۔ وٹھو جھونپڑی پہنچا تو سلام کرنے کے لیے زمین پر لیٹ گیا۔

"اٹھو اٹھو!" گوداوری مائی نے کہا۔

وٹھو کی عورت اور بچے اسے کیا کھلائیں؟ پریشانی سے وٹھو کی عورت کے پیٹ میں درد

ہونے لگا تھا۔ اندھیرا پڑ گیا۔ اس وقت کہاں سے کچھ ملے گا؟

گوداوری مائی کو پتا چل گیا۔ کیسے پتا چل گیا؟ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا تھا۔ وہ تو آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ "جو بھی گھر میں ہے وہی کھاؤں گی۔"

"تمھیں بھگوان نے بھیجا ہے بائی۔ تم خود بھگوان ہو بائی گوداوری۔" وٹھو کریٹ تتلایا اور رو پڑا۔ یہ چھوٹا سا کنبہ مصیبت میں تھا۔ فصل کا پورا حصّہ کھاتےدار کو بھجوا چکا تھا۔ لیکن اس کو لالچ تھی۔ دو روز پہلے اس کے آدمی تلاتھی کے ساتھ گھر سے چال کا ایک ایک دانہ لے گئے تھے۔ پھر بھی وہ سمجھتے تھے کہ چاول وٹھو نے کہیں چھپا دیے ہیں۔ دھمکی دے کر گئے تھے۔ تین روز میں پورا حصّہ نہ ملا تو گھر کے برتن بھانڈے، چھت کے شہتیر، بانس، عورت کے کپڑے، چاندی کے کڑے، سب کچھ لے جائیں گے۔ ہل کی پھالی اور گھڑے گھڑولیاں تک لے جانے کو کہتے تھے۔ وٹھو کریٹ بستی کے آدی واسی پنچوں کے پاس گیا تھا۔ پنچ کیا کرتے؟ کھاتےدار کا معاملہ!

"چاول کے ساتھ پتّے ابال کر کھلائے مائی کو۔ کھٹّے پتّے۔ بھورے چاول۔ اگل اگل کر کھایا مائی نے۔ کھٹّا چاول کھایا نہیں جا رہا تھا۔ سارا کا سارا ہاتھ جوڑ کر لوٹایا۔ کافی بھوک نہیں لگی تھی مائی کو شاید۔ بچوں کو دینے کو بولی تھی۔ بچوں کے لیے تو املی تھی نا بائی۔ بھورے چاول کا بیج، تھوڑی پیاز کے ساتھ۔ وہ بی املی کھا کھا کر یہ آشا بڑی ہوئی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ نوّے پچانوے برس کے بڈھے وٹھو کریٹ کے بیان میں یہاں الجھاوا تھا۔ بستی کے سارے آدی واسی جمع ہو گئے تھے۔ بہت بڑی آگ جلائی گئی تھی۔ (کیا پجنا؟ ما نے سوچا تھا۔) وٹھو کریٹ کو کھانے پینے کی چیزیں لانے، چرائے جانے، چھینے جانے کی تفصیلات اچھی طرح یاد تھیں۔ اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن کچھ ہوا ضرور تھا۔

ما نے نظر اٹھا کر بھورے آسمان کو دیکھا۔ چاروں طرف سرخ پہاڑ اپنی درازوں کے منھ پھاڑے کھڑے تھے۔ ان کی ڈھلانوں سے یہ مقام اب کسی سرخ پیالے کے تلے کی طرح تھا، جس پر آسمان کا بھورا سرپوش ڈھکا ہو۔ سرخ پیالے کو بدرنگ آسمان نے ڈھانپ دیا تھا۔

دونوں عورتیں لال پتھروں سے ابلتی، لال ہی نظر آتے پانی سے کپڑے دھوتی رہیں۔ کتنا ٹھنڈا پانی! دھرتی کی جانو کوکھ سے نکلتا ہوا۔

"یہ پتالیسور؟" آشا نے کہا۔ تھوڑا غور کرنے پر ما سمجھی۔ پاتال کا ایشور۔ یہ سب .. الگ الگ کیوں ہیں ان کے دلوں میں؟ اس نے غور کرنا چاہا۔ آکاش کا ایشور، اور پاتال کا؟

سرخ مٹی نے تمام کپڑوں کو ایک ہلکے گلابی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ نائلون کے صابن کی بٹّی یہ رنگ اتارنے میں ناکام تھی۔ جیسے مَل مَل کر، مکّیاں مار مار کر وہ کپڑے دھو رہی تھیں .. چھُواچھُو، چھُواچھُو۔ پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر ان کے منھ پر پڑ رہے تھے۔ ما نے یاد کیا .. کوئی پرانا گیت۔

Scanned with CamScanner

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوئے
میں میلی پیا اُجلے ری، مرا کس بدھ ملنا ہوئے

یہ کپڑے بھٹی پر چڑھے بغیر صاف نہیں ہوں گے۔ زنگیایا رنگ ہے، ما نے سوچا۔

تب ہی اس کی نظر اپنے پیروں پر پڑی۔ سرخ کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے اس کے پیر۔ اب جو اس نے اپنے پورے تن پر نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا۔ پہاڑی سے اترتے پھسلتے جو مٹی اس کے تن بدن پر تہہ سا گئی تھی، اب کپڑے دھوتے ہوئے سرخ کیچڑ بن چکی تھی۔ جو جگہ جگہ سوکھ رہی تھی۔ یاخدا! اب وہ کیا کرے۔ اس نے آشا کی طرف دیکھا جو سوکھی ساکھی بیٹھی تھی پتھر کے ایک بڑے چوکور، چبوترے جیسے ٹکڑے پر۔ نہ وہ پھسلی تھی، نہ مٹی میں لوٹی تھی۔ اور اسے کپڑے دھونے بھی اپنے آپ کو شرابور کیے بغیر آتے تھے۔

"دیکھو میں تو بھوتنی ہی گئی۔" ما نے کہا۔

دو شانت آنکھوں نے اس کا جائزہ لیا۔

"آپ نہا لیجیے۔ اسنان کر لیجیے۔"

"مگر یہاں؟"

ما نے گھبراہٹ میں اس پاس نظر دوڑائی۔ ہر طرف مقامی لوگ تھے۔ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچھ انھی کی طرح کپڑے دھو رہی تھیں۔ اور پاس ہی لنگوٹی کسے یہ ڈھیر مرد لوگ۔ کھدائی کر رہے تھے کسی قسم کی۔

آشا نے اس کی بےبسی کو سمجھا۔

"یہاں ایک جگہ اور بھی ہے۔ ہی تھوڑی دور..."

دھوئے ہوئے کپڑوں کو، جو اب پہلے سے دونے بھاری ہو چکے تھے، بالٹیوں میں بھر کر، انھیں اپنے سروں پر لاد کر، وہ اس دوسری جگہ کی طرف چل دیں۔ اسی گھڑی پہاڑوں سے بھدر بھدر بندروں کی طرح کودتے، جینز اور پتلونیں گھٹنوں تک اڑسے، بیسیوں جوان لڑکے پہاڑی سے اترتے پھسلتے آ ہی نازل ہوئے۔ یہ سب سیاح تھے۔ اپنی ولا سے نیچائی میں ما اور اس کے کنبے نے انھیں دیکھا تھا۔ آل انڈیا ٹورسٹ کارپوریشن کے بدحال خیموں میں ٹھہرے ہوئے مراٹھا طالبعلم۔ چیختے اور گاتے ہوئے، کھجاتے ہوئے، منہ پر مہاسوں کی بھرمار۔ ایک سے ایک جوکر لگ رہا تھا۔ کسی نے بدھنا اٹھا رکھا تھا کسی نے بالٹی۔ یہ سب پانی کی تلاش میں آئے تھے۔ ما کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لڑکے کیسے ہو جاتے ہیں جوان ہوتے ہوئے، ما نے ہنسی بھرے افسوس کے ساتھ سوچا۔ اس کا چیکو بھی ایسا ہی ہو جائے گا ایک دن؟ یہ غریب گھروں کے لڑکے تھے۔ پتلی گردنوں میں نرخرے اوپر نیچے ہو رہے تھے سب کے۔ نوجوانی کی حیوانی پگلاہٹ نے غریبی امیری برابر کر دی تھی ان کے لیے۔ اسی بھیڑ میں اسے صاف وہ لڑکا نظر آیا۔ وہی جو اس پر برسا تھا۔ کیچڑ میں لپٹی ما جم کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس لڑکے سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔

آشا کنارے لگی چپ چاپ کھڑی رہی۔ کپڑوں کی جستی بالٹیاں اس نے نیچے رکھ دیں۔

"اس دن... اس دن... تم نے اتنا غصہ کیا۔ میں تو ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ مجھے مراٹھوں سے کیا لینا دینا! مجھے تو تمھارا یہ پردیش اور تم سب لوگ... بہت ہی اچھے لگتے ہو۔"

اس نے انگریزی میں کہا۔

گہرا سانولا مراٹھی، کچھ گھبرا کر، لیکن کچھ خوش ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اتنے سارے ساتھیوں میں ایک اس کے ساتھ ایک عورت باتیں کر رہی ہے۔ اور وہ بھی انگریزی میں۔ اس کے ساتھی اشتیاق سے کھسک کر ان کے گرد حلقہ بنانے لگے۔ لڑکے نے انھیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔

"آپ ادھر کی لگتیں نہیں میڈم؟" اس نے کہا۔ "آپ بمبئی کی نہیں کیا؟" اس نے اپنی جناتی انگریزی میں سوال کیا۔

"میں... میں؟" ما چکرائی۔ پھر اس نے بہت سنبھل کر کہا: "میں تو انڈین ہی نہیں ہوں۔" اور یہ الفاظ اس نے جتنی مشکل سے کہے تھے شاید زندگی میں کوئی الفاظ اس کے منہ میں اس طرح ریت کی پھنکی سی کر نہیں بھرے تھے۔

مراٹھی نے کیچڑ میں لپٹی عورت کو حیرت سے دیکھا۔

"ناٹ انڈین؟ آپ کون ہیں؟"

"پاکستانی۔" ما نے کہا۔ لڑکے کا رنگ فق ہو گیا۔ پسینے چھوٹ گئے لڑکے کے۔ پاکستانی؟ یہاں؟

"سنو سنو۔" ما نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "گھبراؤ نہیں... میں یہاں... ہم یہاں... انڈین حکومت کے علم میں ٹھہرے ہیں۔ پناہ لی ہے ہم نے... ایک طرح کی..."

لڑکے کی حالت اور بھی زار ہو گئی۔ یہ کس چکر میں پھنس رہا تھا وہ؟ یہ سب کیا تھا؟

گز بھر کے فاصلے پر کھڑے دوسرے لڑکوں نے کان کھڑے کر لیے۔ گردنیں شترمرغوں کی طرح لمبی کر کے وہ سننے کی کوشش کرنے لگے۔

ما کا دل ڈوب گیا۔ لیکن وہ آخر ایک پختہ عمر کی عورت تھی۔

"ہم یہاں سے بمبئی جائیں گے۔" اس نے کہا۔ "میں تم سے ملنا چاہتی ہوں..."

لڑکے کی سیاہ آنکھیں اسے پوری توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔

"تمھارا پتا؟ اچھا... تم اپنا پتا شاید دینا نہ چاہو۔ میرا پتا لے لو۔"

لیکن وہاں نہ کاغذ تھا نہ قلم۔ پھر ما نے ایک ایسا کام کیا جس کو سوچ کر بھی وہ حیران ہوتی رہی۔ اس نے مصنوعی ہنسی ہنس کر سرخ [illegible] کا ٹکڑا اٹھایا اور [illegible] مراٹھی لڑکے کی قمیص پر ملتے بمبئی کا پتا لکھ دیا۔

ما کی آنکھیں لڑکے کی مسکراہٹ سے بھی ملیں۔ ما کا دل کٹ گیا۔ سکڑی ہوئی پسلیاں۔

لڑکا بےخوف، کالی آنکھوں سے ما کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا:

"میں شیوسینا کا سپورٹر ہوں۔"

ما حیران رہ گئی۔ پل بھر کو اس کی سانس ٹھٹک گئی۔ ارے! اس نے پہلے کیوں نہ سوچا تھا۔ یہ تو... یہ تو عام سا لڑکا نہیں تھا۔ جس طرح وہ بنا معارف، بازار میں اس دن بھڑ پڑا تھا۔

عام لڑکے ایسا کہاں کرتے ہیں؟ کتنے شرمیلے ہوتے ہیں اس عمر کے لڑکے! لیکن وہ ایک ادھڑوث تھی، اور عورت تھی، اس لیے ایک مذہبی جنونی پارٹی کا رکن ہونے کے انکشاف نے ما پر بس چند سیکنڈ کے لیے اثر کیا۔

"میں آپ کے بارے میں پتا کروں گا۔" اس نے تھوڑی سینے سے چپکا کر پتا دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا؟" ما پھیکی ہنسی ہنسی۔ اس نے دھلے کپڑوں کی بالٹی اٹھالی۔ "کر لینا پتا۔" اس نے لڑکے کے سراپا پر پیچھے ہٹ کر نظر ڈالی؛ دبلا چھریرا، پھرتیلا، سانولا، جس کی چتون سے ذہانت اور بےخوفی ٹپک رہی تھی۔ کیسا تھا یہ؟ سواجی مرہٹہ جیسا؟ گھوڑے کی پیٹھ پر کیسا لگے؟ جیسے دبلے بدن میں پارہ بھرا ہوا! لیکن... اسے خیال آیا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر تو نہیں تھا یہ۔ گھوڑے پر تو رمیش تھا۔ گجراتی سرمایہ دار کا بیٹا۔ یہ تو پیدل تھا۔ پیدل بھکڑ۔ ما دل میں زہر بھری ہنسی ہنسنے لگی۔ شو سینا کا سینکا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟" ما نے جاتے جاتے مڑ کر پوچھا اور "سواجی" سننے کی توقع کی۔

"دھرمانند۔" لڑکے نے کہا۔ پھر اپنے گروہ میں ملنے سے پہلے اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا؛ "گڈبائے، آنٹی۔"

آنٹی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ دور ہوتا گیا... تال کے کنارے تک پہنچ گیا۔ ما نے دور تک فرق واریت کے سدا روشن الاؤ کے اس انسانی ایندھن کو دیکھا۔

دونوں عورتیں اپنا بوجھ ڈھوتی، بے برگ و گیاہ پتھریلی پہاڑی کا موڑ کاٹنے لگیں۔

انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ تھوڑے سے ہی فاصلے پر سرخ، اوبڑکھابڑ دھرتی پر، ما کو کچھ ہرا ہرا نظر آیا۔

"وہ ہے۔" آشا نے اسی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

کائی تھی۔ کسی پرانے بدبودار جوہڑ پر جمی ہوئی کائی۔

دو ڈگ بھر کر وہ اس کے کنارے پہنچ چکی تھیں۔ ما کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ کتنی بھی گدلی ہو، اس پانی سے زیادہ تو گدلی نہ تھی!

"نہاؤں؟ میں؟"

اس نے حسبِ اسباب سے پوچھا۔

آشا نے حسبِ کی بالشتاں زمیں پر رکھ دیں۔ پھرتی سے وہ ایک بالٹی کے کپڑے سرخ چٹانوں پر پھیلانے لگی۔ بالٹی خالی کر کے اس نے کنارے پڑی ایک چھڑی سے پانی پر جمی کائی ہٹائی۔ اس کے نیچے کائی کے ہی رنگ کا سبز پانی تھا۔

ما کے پیر میں اسی گھڑی جیسے کسی نے ایک تیز، لمبی سوئی گھونپ دی۔

چیخ مار کر ما نے پیر جھٹکا۔ وہ دیوانہ وار پیر جھاڑنے لگی۔ اس کی چٹکی میں ایک چیونٹا آ گیا۔ سرخ، بڑا سا چیونٹا!

ما نے گھبرا کر اسے دور پھینکا۔

اس کی پنڈلی کے پاس سوئی کی نوک کے برابر خون کا ذرہ اُبھر آیا تھا۔

"یا اللہ" اس نے کہا۔ "یہ کہاں سے آ گیا؟" اچانک اسے یاد آیا۔ ایک بہت پرانی بات، کبھی بچپن میں اس کی ماں نے کہی تھی اس سے۔ "اللہ تعالیٰ نے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ وہ کیڑے کو پتھر میں رزق دے دیتا ہے۔"

ما نے دور دور نظر دوڑائی اور تقریباً بےخیالی میں سوچا؛ کہاں دے دیتا ہے؟ دور دور رزق کا نام و نشان نہیں۔ یہ کیڑا یہاں کیوں آ گیا؟

اس کی نظروں نے چیونٹے کو ڈھونڈا۔ "خون کھینچ لیا کم بخت نے۔" اس نے چیونٹے کو کوسا۔

آشا خالی بالٹی میں پانی بھر رہی تھی۔ سروقد کھڑے ہو کر اس نے کہا؛

"لو، کرو سنان۔ میں پانی ڈالتی ہوں۔"

ما کپڑے دھونے کا صابن مل مل کر اپنے سر پر کی مٹی اتارتی رہی۔ آشا نے پانی ڈال کر اسے نہلا دیا۔ ما بلکی پھلکی ہو گئی۔ پانی تو آخر پانی تھا، چاہے کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔ سب کچھ دھو کر صاف کر دینے والا۔ ما بالکل تازہ دم ہو گئی۔

"ایک بار..." آشا نے کہا۔ "یہاں نہائی تھی۔ گوداوری مائی۔" وہ ادھ سوکھے کپڑے جھاڑ کر واپس بالٹی میں رکھ رہی تھی۔ "باپ نے بتایا تھا۔"

ما کے دماغ میں ٹی سی کسی گوداوری کی تصویر آئی۔

"لیکن وہ یہاں کہاں؟" ما نے اپنی بالٹی اٹھا کر پوچھا۔ "وہ تو... ادھر، امبر گاؤں کی طرف تھی۔"

"وہاں بھی تھی۔" آشا نے اپنے سے کہا۔

سرخ دراڑوں پر جما جما کر قدم رکھتی وہ اوپر چڑھنے لگی تھیں۔ پہاڑی پر چڑھنا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ما کو اب آشا کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی۔ آشا کی بات پر وہ کچھ ہنس کر سوچ رہی تھی؛ یہ ایک تھی یا کئی عورتیں تھیں؟ شاید ایک سے زیادہ۔ شائد وہ کسی عیسائی مشن کی نرس تھیں۔ ایک سی ساڑیاں باندھے۔ اگر وہ وشنو کرشن کے تخیل کی تخلیق نہ تھی۔

وشنو کرشن! ایک بھیانک خواب کی طرح وہ سب باتیں ما کے ذہن میں گھومیں۔ کس کی سنی تھی وہ! زیرجستہ کی، کہ کسی اور کی۔ ارے باٹی تلاٹھی نے یوں پکڑا۔ اونچا اٹھایا۔ یہ دے مارا۔ دھرتی پر۔ پھر اٹھایا۔ پھر دے مارا۔ دھنیا تیرے باپ کی بندوق کہاں؟ کہاں چھپائی؟ ارے کدھر ہے بندوق؟ ایک بار کہا۔ پھر بولنے جیسی نہیں رہی۔ ترچھا لوہا اس کی... میں گھسیڑنے کو کہہ رہے تھے۔ لڑکی رکت میں نہائی۔ بچی نہیں بعد میں وہ۔ سارا رکت تو وہیں رس گیا۔ مٹی میں۔

نرالی کے گھنے بن اور ورلی!

یہ اکتوبر ۱۹۲۵ کا قصّہ ہے۔

تب ہی اس پاس کہیں ما اور با پیدا ہوئے تھے۔ کہیں بہت دور۔ دور دراز کے علاقے میں۔

گوداوری۔ جو چائے بہت پیتی تھی۔ چائے پیتی تھی مائی گھڑی گھڑی!

بچّوں کی کھل کھلاہٹ۔ کہاں سے لائیں گے چائے؟ ہاں ہاں، ہمیں آتی ہے بنانی۔ پہلے تو کہیں سے پتّی لاؤ۔ پتی آ گئی۔ اب چینی۔۔۔ چینی کہاں؟ گڑ بھی نہیں ہے۔ جاؤ جاؤ۔ گڑ لے کر آؤ۔ بائی گڑ کی چائے پیے گی؟ پی لے گی؟ ہاں ہاں، پی لے گی بھئی۔ خوشی سے۔ ہر طرح کی پی لے گی۔ بس چائے ہونی چاہیے۔ اب رہا دودھ۔ دودھ ورلی کے پاس کہاں؟ کسی ماں کا تھن نچوڑ لو تو دوسری بات ہے۔ کہیں سے دودھ خرید کر لانا پڑے گا۔ ایک لڑکا دوڑتا گیا۔ بات کے ڈونے میں آدھے گھنٹے میں دودھ لایا۔ پتّی اور گڑ پانی میں کھول کھول کر تب تک کالے پڑ چکے تھے۔ مگر دودھ ڈالنے سے اجلے ہو گئے۔ مائی نے ہنس کر چائے پی۔

نہیں وہ ایک ہی تھی۔ کئی تو نہیں ہو سکتیں۔ ایک ہی جیسی چائے کی شوقین۔ ایک بالکل نرالی دیوی۔ چائے کی دیوی! ما نے دل میں سوچا۔ جب ہر چیز کے دیوی دیوتا ہو سکتے ہیں، تو چائے کا کیوں نہیں؟

اچانک ما کو خیال آیا۔ "جو ام کی پوجا کرتے ہیں، وہ گوشت۔۔۔ ام کھاتی نہیں کیا؟" اس نے آشا سے پوچھا۔

"کھاتے کیوں نہیں۔ ام کا پیڑ نہیں کاٹتے۔" آشا نے رسان سے کہا۔

"ہوں؟" ما نے چڑھتے چڑھتے ہنکارا بھرا۔ اسے گائے کا خیال آیا۔ اسے شوسینا کا خیال آ رہا تھا۔ سواجی مرہٹے کا۔ بال گنگادھر تلک کا۔ جنھوں نے دیش کی رکھشا اور گائے کی رکھشا کا نعرہ دیا۔ تلک تک پہنچتے پہنچتے، وہ صرف مرہٹہ تحریک نہ رہ گئی تھی۔ پورے ہندوستان کی آزادی کی تحریک تھی۔ مگر گائے‌خور مسلمان اس تحریک سے بھی غائب! تلک نے ایسا نہ سوچا کیا؟ گائے کا سوال سامنے رکھنے سے مسلمان بددلی ہو جائیں گے؟ ان کا ہندوستان کا تصوّر کچھ اور تھا۔ کانگریس میں .. ما کو خیال آیا .. سب کے خیال الگ الگ تھے۔ نہرو کے کچھ اور، گاندھی کے کچھ اور۔ تلک اور پٹیل کے بالکل جدا۔۔۔ بس چند نکتوں پر متفق ہو کر وہ ایک ہی پارٹی میں تھے۔ اسے اسماعیل میرٹھی یاد آئے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

وہ دل ہی دل میں اپنے بھولے، خیرخواہ ہم وطن پر مسکرائی۔ تاسّف اور پیار سے۔ شاید سوچتے ہوں گے، اس طرح مسلمان بھی گائے سے پیار کرنے لگیں! کم از کم عزّت ہی کرنے لگیں۔ مسلمان گائے کو برا کہاں سمجھتے تھے؟ سب ہندو گائے سے پیار کہاں کرتے تھے؟ کتنے ہی ٹھیلے والوں کو، جن کی سبزی ترکاری میں کھلی چھٹی پھرتی گائیں منھ مارتی تھیں، اس نے قمچیاں مار مار کے گایوں کو بھگاتے دیکھا تھا۔ اور بڑی عمارتوں کے سامنے (وہ یاد کر کے ہنس پڑی)

پھاٹکوں کے سامنے، زمین میں گڑھا کھود کر لوہے کے جال لگائے گئے تھے۔ یہ کاؤ ٹریپر کہلاتے۔ گایوں کے کھر ان میں پھنس جاتے۔ وہ اندر جا کر چمن کا ناس نہ کر سکتیں۔

بات شاید گائے کی نہیں تھی۔ بات تو شاید کچھ اور تھی۔ اس نے سنا تھا، آزادی سے پہلے، بعض جگہوں پر بقرعید کے موقعے پر، گایوں کو خوب سا سجا کر، ہندوؤں کے علاقوں سے جان کر مسلمان مذبح کی سمت ہنکا لے جاتے۔ فساد بھی ضرور ہوتے۔ مگر پروا کس کو تھی؟ لوگ سر سے کفن باندھ کر جاتے تھے۔ کیا گائے کو ذبح کرنے کے شوق میں؟ ما نے افسوس سے سوچنے کی کوشش کی کہ لڑائی اصل میں کس بات پر ہوتی ہو گی۔ "تم ہمارے جذبات مجروح کرتے ہو، ہمارے منھ پر تھپڑ مارتے ہو؟" ہندو سوچتے ہوں گے۔ خواہ مخواہ کی "اڑی" (بقول سندھیوں کے)۔ اگر ایک گائے نہ کاٹیں تو ان کے خدا ان سے ناراض تو نہیں ہو جائیں گے! ارے، اور بہت سے جانور ہیں قربانی کے لیے۔ بکری، بھیڑ، اونٹ!

مسلمان بیٹھے بٹھائے ہندوؤں کے جذبات مجروح کرنا نہیں چاہتے ہوں گے (ما نے قیاس دوڑایا)۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وقت اور پیسا لگا کر دوسروں کے جذبات کو مجروح کرتا پھرے؟ شاید وہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ ہم ہمیں کسی بات کے لیے زبردستی مجبور نہیں کر سکتے۔ اصل میں (ما نے فیصلہ کیا) ہندو اور مسلمان۔۔۔ ایک دوسرے کا اصل مقصد ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے۔ (ما سے مشورہ کر لیتے!) پھر اسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ جیسے کوئی لطیفہ ہو۔ اصل مقصد سمجھ جاتے تب شاید اور بھی لڑتے۔ آخر ایک قوم کا دوسری قوم کی طرف، ایک جاتی کا دوسری جاتی کی طرف، ایک آدمی کا دوسرے آدمی کی طرف، اصل مقصد ہے کیا؟

کہا جاتا کیا؟ ما نے بیبستہ سے سوچا۔ اپنے اندر دوسرے کو مٹا ڈالنا؟ زیر کر لینا؟ شاید ایسی شعوری خواہش نہ ہو یہ۔ لیکن پھر بھی، کبھی کبھی۔۔۔ یوں ہی تو لگتا تھا، جیو کا کوئی لامحسوس آنال کو اپنے ہر پتا نہیں تھا شاید۔ "یا تو نہیں، یا میں نہیں؟" اس منھ زور بہاؤ پر کوئی بندھ تھا کیا؟ تو بھی رہ جاتا اور میں بھی .. جنگ یا اسپیت دونوں ہی قسم کے اتصال میں، ٹکراؤ میں۔

اسے پھر آدی واسیوں کا خیال آیا۔ ناگ پوجا کرتے تھے یہ۔ وہ ناگ کہاں گیا؟ دراوڑی دیوتا، شوجی کے گلے میں جا لپٹا۔ اس طرح وہ اپنی شے (دراوڑوں کے پرانے) دیوتا کو ماتھا ٹیکتے ہوئے اپنے پرانے (دراوڑوں کی شے) ناگ دیوتا کو بھی ماتھا ٹیک لیتے تھے۔ ان کی پوجا آپس میں گھل مل گئی۔ مل کر ایک ہو گئی۔ لیکن کثرت اور ضرب در ضرب کے حسابی عمل سے، وہ ایک ہونے کے ساتھ دو بھی رہیں۔ گلے میں ناگ لپٹائے شوجی کو ماتھا ٹیکنے کے بعد، ادھر ادھر دیکھ کر لوگ چپ چپاتے اپنے پرانے ناگ دیوتا کی، اس کی اصل، اکیلی صورت میں، پوجا بھی کر لیتے۔ اس طرح دیوتاؤں کی بھرمار ہوتی گئی۔ "کوئی شے کبھی ختم ہوتی نہیں" بعد میں بابھنوں نے نتیجہ نکالا۔ "بس روپ بدل لیتی ہے۔" اور روپ بدل کر پہلی جیسی بھی رہ جاتی ہے! ما نے حیرت کی۔ اور بابھنوں نے ایسا مشاہدہ کیا .. کتنی صدیوں پہلے! نہایت محنتی اور ذہین لوگ تھے، ما کے دل نے بےساختہ خراج تحسین پیش کیا۔ یہ بابھن، جو دوسری جاتیوں سے بڑھ کر

Scanned with CamScanner

تو ذہن نہ ہوں گے، لیکن اب ان کا پیشہ ہی سوچنا ٹھہرا تھا، تو اسی میں لگ گئے ہوں گے۔ اور جن کی کسی سنتان کو آگے چل کر، وقت کی گھپ اندھیری کوکھ میں چکراتے ہوئے، صدیوں بعد، کسی تبدیلی سے گزر کر، شاعر مشرق علامہ اقبال بننا تھا اور اپنے پُرشور کلام کے بہاؤ سے پورے برصغیر کے ہم مذہبوں میں -- ایرانیوں، عربوں، افغانوں کی اولادوں، اور آدی واسیوں سے بنے اور باہمن اور کھشتری اور چوڑے چمار، اور ان سے مسلمان بنے کروڑوں لوگوں میں -- ایک نئی روح پھونکنی تھی اور گنگاکنارے، الہ آباد میں مطالبہ' پاکستان پیش کرنا تھا۔

ooo

ولا کی رات کا اندھیرا۔ جامنی اندھیرا۔ موٹے ریشم کا سا، مخمل جیسا۔

اور سواجی تلکی والا نہیں تھا!

ما تھکی ہوئی، چکو سوتا ہوا، ککلی اور بڑکی اپنے اپنے بستروں میں۔ کوئی سپنے دیکھتی ہوئی۔ ما کا دل پُرسکون تھا۔

اور بستر میں ما! اور بستر میں با!

اس نے کہیں پڑھا تھا، ایک عورت کا قصہ، جس نے اپنے آدمی کو بےوفائی سے روکنے کے لیے، رات کو اس کے اور اپنے کپڑوں میں چپکے سے پن لگا دیا تھا۔ سیفٹی پن۔ رات کو جب آدمی اٹھا تو اس کی عورت کا دامن کھنچا۔ وہ بھی جاگ پڑی۔

با کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر اس نے ہمت کی اور سونے کی اداکاری کرنے لگا۔

ما کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کے پاس تو کوئی پن نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو.... شرم کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر پاتی۔ اس کے ذہن میں ہر خیال دھندلا گیا۔ کسی تال کے ساکن، شفاف پانی میں ڈوبنے لگی ما۔ اس کے بال، ابی بیلوں جیسے تیرنے لگے۔ نیچے، اور نیچے۔ پُرسکون پانیوں میں، جہاں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جہاں آرام تھا۔ انتہاء آرام ۔ نیند کے تال میں ڈوبتے ڈوبتے، بےحد ہلکے پانی سے اپنا حیرت انگیز طور پر بھاری پڑا ہاتھ نکال کر ما نے ایک بڑا سا، چمک دار، نقرئی پن، با کے کپڑوں میں لگا دیا۔ ما سو گئی۔ نگ داری کرنے کے بدلے سو گئی ما!

دوسری صبح، کچھ بھی کل رات جیسا نہیں رہا تھا۔

بھیونڈی کے فسادات ختم نہیں ہوئے تھے۔ ایک دن کے وقفے کے بعد اور بھی شدت سے بھڑک اٹھے تھے۔ ایک کے بعد دوسرے قصبے میں وارداتیں ہو رہی تھیں۔

اور وجہ؟

وجہ کیا تھی؟ وجہ تو شاید کچھ بھی نہ ہو۔ بال ٹھاکرے کی تحریک کے شاخسانے۔ شوسینا، جو پچھلے ایک دو برس سے بمبئی کی، مہاراشٹر کی غریب بستیوں میں جنگل کی آگ

کی طرح پھیل گئی تھی۔ یہ ہندو تحریک تھی۔ مگر بال گنگادھر تلک کی کل ہند تحریک نہیں! ایک بار پھر، مراٹھا ہندو تحریک!

بال ٹھاکرے کو تو کوئی سنجیدگی سے لیتا تک نہ تھا۔ کم سے کم دلّی میں ما اور با کے پڑھے لکھے ہندو دوست تو نہیں۔ ایک ناکام کارٹونسٹ، جو بہت عرصے سے ایک اتنا ہی ناکام سیاست داں تھا۔ لیکن تھا مسخرہ، اور پُرلطف بیان دیتا، جس پر سب ایک دو دن ہنس کر بھول بھال جاتے۔

کیا جادو تھا اس کے پیغام میں؟ جس نے اندھیری، غلیظ چالوں سے کھینچ کھینچ کر لڑکے نکال لیے تھے، اس نیم خواندہ سیاسی شعبدہ باز میں؟

عجیب بات یہ تھی کہ ایک ڈیڑھ برس پہلے شوسینا نے بمبئی کی اسلامی جماعتوں کے ساتھ مل کر کچھ تقریبات کی تھیں۔ ہار پھول پہنائے تھے ایک دوسرے کو۔ ان دونوں جماعتوں میں قدر مشترک کانگریس کی مخالفت تھی۔

بال ٹھاکرے اپنے آپ کو سواجی مرہٹہ کا جانشیں سمجھتا تھا۔ شاید تھا بھی۔ وقت کی دھند میں ملفوف تاریخ کے رومانی ہیرو اصل میں کیسے تھے، کون جانتا ہے؟ شاید ہم جیسے ہی تھے۔

لیکن اب کی بار مسئلہ گائے کا نہ تھا۔ گن پتی کے تہوار کا تھا۔

"گن پتی کپّا کوریا!"

ما نے اور اس کے کنبے نے بمبئی میں رنگ برنگے، ہاتھی، گھوڑوں، پالکیوں کے جلوس میں گنیش جی کو جاتے دیکھا تھا۔ گنیش، جنھیں سارے وید منھ زبانی یاد تھے! اور جو اتنے ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹو بھی بہت تھے۔ ایک بار کسی دیوتا نے دعوت کی تو اس کی میز کرسیاں، بستر تک کھا گئے، کیونکہ ان کے اندر سب کچھ سما سکتا تھا۔ تمام حیوانات اور تمام انسانی خوردونوش۔ گنیش جو برصغیر کے قدیم انسانوں کے کوئی دیوتا تھے، اور جنھوں نے ہزاروں برسوں کے طویل اور سدا نروبارہ اختلاط کے عمل میں مار بھگائے جانے سے انکار کر کے دراوڑی دیوی پاربتی کے گھر جنم لے لیا تھا۔ اور یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا تھا۔ پہلے ان کا سر ہاتھی کا نہ تھا۔ پر ایک بار ان کی ماں نہانے بیٹھی تھیں۔ "کسی کو اندر نہ آنے دینا۔" اس نے اپنی سنتان سے کہا۔ تب ہی وہاں شوجی پہنچے۔ لیکن گنیش انھیں کہاں اندر جانے دیتے!

"نہیں، ماں نے منع کیا ہے۔"

وہ شوجی کی قمیص سے لٹک گئے ہوں گے!

اب شوجی کوئی بڑکی تو نہ تھے کہ لنگوروں بھرے جامنوں کے پیڑوں کے نیچے پیر پٹک پٹک کر ٹہلتے! پاربتی جی کے نہا کر، ساری لپیٹ کر، بال سکھاتے باہر آنے کا انتظار کرتے۔ گھما کر انھوں نے جو کلہاڑی کا ہاتھ دیا تو گنیش جی کا سر تن سے جدا ہو کر.... کہاں گیا؟ غرض غائب ہو گیا۔ یا آکاش میں کہیں چلا گیا۔ پاربتی جی باہر نکلیں تو بیٹا سر کے بنا پایا۔ "میرے بیٹے کے دھڑ پر سر لگا۔" انھوں نے شوجی کو جھنجھوڑ ڈالا۔ خون بھرے آنسوؤں کی برسات کر دی۔ شوجی سوچ میں پڑ گئے۔ ٹھوڑی سہلانے لگے۔ اب کیا کریں؟ وہیں سے جھومتا جھامتا ایک

Scanned with CamScanner

سُندر سا ہاتھی آ رہا تھا۔ شوجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اس کا سر کاٹ کر گنیش جی کے دھڑ سے لگا دیا۔ "یہ سنبھالو اپنا پورن بیٹا!" انھوں نے گنیش جی کو ماتا پاربتی کے حوالے کیا، اور خود جاسوسوں کے جھنڈ کی اور چل دیے جہاں لنگور دانت نکالے ہنس رہے تھے۔ منھ چڑا رہے تھے شوجی کا۔ کئی شتابدیوں تک وہ وہاں پیر پٹک پٹک کر ٹہلا کیے۔ عورت جاتی پر لعنتیں بھیجتے۔ اُفوہ! تریاہٹ!

لیکن اس تریاہٹ کی جیت تو ہوتی تھی۔ اور تہذیب کے رحم کی کلبلاہٹ سے گنیش جی کو جنم تو لینا تھا۔ اور اب ان کے تہوار پر خون خرابا!

کون بھلا یہ چاہتا ہو گا؟ کس کی خواہش ہو سکتی تھی کہ مراٹھے غریب غربا کا یہ خوشیاں مناتا، خوشیوں کا شور اٹھاتا جلوس ہنگاموں کی نذر ہو جاتا! ان کے مٹھائیوں کے دونوں میں ڈھول جا پڑے! ان کے رنگ دار برف کے گولوں میں، جنھیں ان کے بچے پچاس پیسے میں خرید کر چوس رہے ہیں اور "گن پتی گپّا کوریا" گا رہے ہیں، خون کے چھینٹے جا پڑیں! اور ان کاغذی محلوں کو عرب ساگر میں تعزیوں کی طرح ٹھنڈا – ہونے دے!

لیکن اصل بات تو یہ نہیں تھی۔ اصل بات کیا تھی؟

کچھ دنوں پہلے، بمبئی کے ایک اردو اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ بال ٹھاکرے نے کسی جلسے میں مسلمانوں کی دلآزاری کے کلمات کہے ہیں۔ اخبار نے لکھا تھا کہ ایسا کسی مراٹھی اخبار میں چھپا ہے۔ اس کے بعد مراٹھی اخبار میں چھپا تھا کہ کسی اردو اخبار میں ہندوؤں کے دیوتاؤں کو برابھلا کہا گیا ہے۔

یہ دونوں گمنام سے، بہت کم تعداد میں چھپنے والے اخبار تھے۔ جنھوں نے دونوں فرقوں کے دلآزار کلمات کی خبریں چھپنے کی خبر شائع کی۔ اصل چھپے ہوئے مواد کو کسی نے دیکھا بھی نہ تھا۔

گن پتی تہوار سے کچھ دن پہلے، اسی باعث، ہندوؤں (مراٹھوں) اور مسلمانوں میں کشیدگی پھیل گئی تھی۔

تہوار کے موقع پر بھیونڈی میں ہندو مراٹھوں نے گن پتی جلوس کا راستا طے کیا۔ انھوں نے جلوس مسلم علاقوں کے بیچوں بیچ سے نکالنے کی ٹھانی۔ دوسرے دن کی تیاری میں انھوں نے راستے پر بھگوا جھنڈے لگانے شروع کر دیے۔ مسلم علاقوں میں، ان کی آن میں یہ جھنڈے اکھاڑ پھینکے گئے۔ ان کی جگہ، جانے کہاں سے نکل کر، سبز جھنڈے لہرانے لگے۔ اس سرپھٹول میں دو تین مراٹھا ہندو لڑکے مارے گئے۔ یا زخمی ہو گئے۔

شوسینا کی تنظیم کے باعث مراٹھا نوجوان اتنے منظم ہو چکے تھے کہ دوسرے دن انھوں نے ایک ہولناک انتقام لیا۔

مہاراشٹر کے قصباتی علاقے کپڑے کی چھوٹی صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ روزگار کی تلاش میں پورے ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر بےروزگاروں کی ٹولیاں بمبئی اور اس کے آس پاس چھوٹے بڑے شہروں میں آتی ہیں۔ اور انجان سرزمین پر، کسی اپنے سے -- اپنی بولی بولنے والے یا اپنے ہم مذہب سے -- دو وقت کی روٹی کی خاطر جڑ جاتی ہیں۔ یوپی، سی پی اور بہار سے

لاکھوں مسلمان بھی یہاں آ بسے ہیں۔ زیادہ تر کپڑے کے کارخانوں میں چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں۔

وہ شاید ایک مسلمان چھوٹے موٹے سرمایہ دار کے کپڑے کے کارخانے کے مزدور تھے جنھیں خود پر حملے کا خطرہ تھا جو اس دن صبح ہی سے وہ مضافات میں اس کی کوٹھی کے پاس، اس کے ہی کھیت میں جا چھپے تھے۔

صبح دس بجتے بجتے، ان سے تعداد میں چوگنا بلوائیوں کا ہجوم، مسلمان کارخانےدار کی کوٹھی کے گرد جمع ہو گیا۔ کارخانےدار کی کوٹھی خالی تھی۔ اپنے خاندان کے ساتھ وہ روپوش ہو چکا تھا۔

مشتعل ہجوم نے دور دور نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دور دور تک کھیت کی ہریالی تھی۔

تب انھوں نے کھیتوں کو آگ لگا دی۔ لپٹوں سے ڈرے مسلمان مزدور بوکھلا کر باہر بھاگے۔ بلوائیوں نے کھیت سے نکلنے والوں کو گھیر کر، ان پر چاقوؤں اور چھریوں سے حملہ کر دیا۔ زخمی، تڑپتے ہوئے شکاروں کو انھوں نے واپس آگ میں جھونک دیا۔ شاید ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ نکل پایا تھا۔

ooo

"پہاڑی وِلا میں سہما ہوا ایک مسلمان کنبہ..."

چیکو، ککلی، بڑکی، ما اور با۔ بڑکی کی خوش طبعی رفوچکر ہو چکی تھی۔ اس کے چاند سے چہرے پر فکر کے بادل چھا گئے تھے۔ اچانک فسادات نے اس پر رمیش کے ہندو ہونے کا مطلب فاش کر دیا تھا۔ اس نے ما کے جلدی میں کہے ہوئے جملوں "پاکستان میں، پاکستان میں -- وہیں ہو گا تمھارا بیاہ" پر پہلی بار سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کی لڑائی اس کے نزدیک اس کی اپنی زندگی کے بےفکر، ندی کے پانی کی طرح کلکلاتے بہاؤ میں ایک احمقانہ رکاوٹ تھی۔ "پاکستان میں لڑکے ہیں؟" اس نے سوچا تھا۔ "بےشمار!" ما نے اسے تسلّی دی تھی، "ایک سے ایک ہینڈسم!" ہمیشہ کی طرح ما کی تسلّیوں کو بڑکی نے شدید شک و شبے کی نظر سے دیکھا تھا۔ مگر اس پر یقین کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ پا کر، خود کو یقین کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ کتابیں کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ "چلو اس بار ما کو پاس ہو کر دکھا دو۔" اس نے بےپروائی سے فیصلہ کیا تھا۔

ککلی کو کچھ مبہم سا اندازہ تھا۔ لڑائی ہو رہی ہے! کس کی، کس سے؟ وہ یہ سب نہیں سمجھ سکتی تھی۔ مگر وہ ما کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے سوٹ کیس میں رکھنے کے لیے کپڑے تہ کرنے لگی ککلی۔

چیکو لڑھک اور رینگ کر احاطے میں جانا چاہتا تھا۔ یہ روزمرّہ کی معمولی سی بات! لیکن

آج پا اور ما اسے اپنی آنکھوں سے ایک پل کے لیے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان کی جان گلے میں اٹک گئی تھی۔ چیکو کو گھسیٹ کر انھوں نے اندر کر لیا۔ وہ سب ایک کمرے میں اکٹھے ہوئے تھے، ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے۔ ما کا ہاتھ بٹانے کے لیے، چھوٹی سی ککلی چیکو سے کھیلنے لگی۔ بدلی ہوئی صورت حال نے ما کے ذہن سے بیتی رات کے نقوش پل بھر میں مٹا دیے تھے۔ پا آشا کے پاس گیا یا نہیں ۔۔ آج کے دن گزری رات کے واقعات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی، اور کسی حیرت ناک شگاف کے ذریعے، جو دور رونما ہونے والے واقعات نے وقت کے تسلسل میں ڈال دیا تھا، کل کی رات کا آج کے دن سے کوئی رشتہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ آشا ان کے لیے ناشتہ لائی۔ ہمیشہ کی طرح پرسکون۔ اس کے لبوں پر اسی طرح ایک روشن مسکان کی پرچھائیں تھی۔ ما مر کر دوبارہ زندہ ہونے پر بھی اس سدا شانت چہرے کو نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اس نے پا پر نظر ڈالی۔ اترے ہوئے چہرے سے، انگلیاں چٹخاتا پا۔ شاید وہ کوئی محیّرالعقول کارنامے انجام نہیں دے پایا تھا۔ شاید کسی بھی دو اجنبیوں میں پہلی بار ہونے والے جسمانی ملاپ کی طرح وہ ایک گھبرایا ہوا منھنی رہا ہو۔ یا شاید ایسا نہ ہوا ہو۔ شاید پا اپنی اتھا خواب گاہ کی کھونٹی سے لنگر چھوڑ گیا ہو۔ صرف بدن رہا ہو پا؟ اس نے آکاش تک اڑان بھری ہو۔ اس کے بدن نے۔ گودھولی کو چھو آیا ہو پا کا بدن آشا کے سنگ۔ گودھولی ۔۔ کہکشاں۔ ویدوں کی پرانی تشریحوں میں یہ گایوں کے گلّوں کی گزرگاہ تھی۔ نقرئی گھنٹیاں ٹنٹناتی، اپنے دودھ بھرے تھنوں سے آدمی کے منھ میں جاں‌بخش امرت ٹپکاتی، جو کسی ستاروں کے جنگل کی اور گئی تھیں۔ بعد کے تشریح کرنے والوں نے رگ وید میں گودھولی کا کچھ اور مطلب بتانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ دراصل یہ الجھاوا ایک لفظ کا غلط مطلب سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ "گو" دراصل روشنی کو کہتے ہیں۔ گودھولی سے مراد یقیناً روشنی کا راستا ہے، نہ کہ گایوں کا راستا۔ بعد کے آنے والے، زیادہ خیال پرست مفسّرین کو شرمندگی ہوتی ہو گی کہ رگ وید کی حسین پرارتھنائیں کسی جانور کے لیے کی گئی ہوں۔ مگر دھرتی پر بستے، مٹی اور پانی اور پیڑوں اور جانوروں سے بندھے کروڑوں ہندوؤں تک ان کی تفسیریں پہنچی بھی نہیں تھیں۔ اور انھوں نے آکاش پر اس روشنی خم دار لکیر کو گایوں کا راستا ہی سمجھا تھا۔

پا بمبئی میں طاہر بھائی کے گھر فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ طاہر بھائی گھر پر نہیں تھے۔ پا نے طیّب بھائی کا نمبر ملایا۔ اتفاق سے طیّب بھائی مل گئے۔ وہ ابھی باہر نکلنے والے تھے۔

"ہم لوگ تو یہاں پھنس گئے ہیں۔ بمبئی آ جائیں؟"

"آ جائیے۔" طیّب بھائی کی دکھی، گجراتی آواز، میلوں سے اڑتی آئی۔ "ہاں... جہاں ہیں وہیں نکلنے کی کوشش کیجیے۔ فسادات تو ہر جگہ ہو رہے ہیں۔ بمبئی میں تو نام پوچھ پوچھ کر چاقو گھونپے جا رہے ہیں۔"

نام پوچھ پوچھ کر؟ ما نے حیرت سے سوچا تھا۔ شکلوں سے نہیں پہچانے جا سکتے ہندو

مسلمان! اسے ایک اڑا مٹا خیال آیا تھا کہ کراچی میں، پٹھان مہاجر فسادات میں، دونوں قومیتوں کو، یا تہذیبی اکائیوں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھیں انھیں پہچاننا بالکل آسان تھا۔ اسے یاد آیا تھا کہ پچھلے مہینے، بوہری کے قصباتی فسادات میں، پاجامے اتار کر بلوائی ہندو مسلمان کی پہچان کرتے تھے۔ اس نے ککلی اور بڑکی کو ہدایت کی: "بمبئی پہنچنے پر کسی کو نام نہ بتانا۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں طیّب بھائی؟"

"بھیونڈی۔ فسادات کے متاثرین کی مدد کرنے۔"

پا اور ما سُن ہو گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا۔ انھیں یاد آیا کہ وہ کون ہیں۔ فسادات کی ناگہانی نے انھیں بالکل بھلا دیا تھا کہ عزم اور ہمت اور استقلال وغیرہ کوئی چیز ہوتے ہیں۔ جیسے بندھے ہوئے اسباب سے کھکھوڑ کر انھوں نے یہ سب ڈھونڈنے کی، سینے سے لگا لینے کی کوشش کی۔

رات پڑے... سبز جگنوؤں کے جھنڈ آکاش سے اترے تھے۔ اس جھلملاتی، حسین، تابناک دیوالی میں۔ جامنوں کے پتّوں کی پراسرار سرسراہٹ تلے، وہ اپنے ٹرانزسٹر ریڈیو پر بڑھتے ہوئے فسادات کی خبریں سنتے رہے تھے۔

اگر کسی ندی کنارے
آسمان اور زمین کی گہرائیوں میں
تم کسی کو پکارو
اور تمھیں کوئی آواز سنائی دے
تو سمجھ لینا
یہ کسی دوسرے انسان ہی کی آواز ہو گی

ما نے نہ جانے کہاں پڑھی ہوئی سطروں کو یاد کیا۔ خوف اور ایک ناقابلِ وضاحت غم نے اس کا کلیجا مسوس دیا۔ اس نے بڑکی پر نظر ڈالی جیسے وہ رات پڑے گھر سے نہیں نکلنے دیتی تھی، جس کے کنوارپن پر سانپ کی طرح پھن کاڑھے بیٹھی تھی ۔۔ جیسے اس کی اپنی ماں بیٹھی تھی، اور اس سے پہلے اس کی ماں ۔۔ اور اس وقت وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اگر... اگر خدا نہ کرے کچھ ہو جاتا ہے تو... تو بس، اس کا مطلب کچھ بھی نہیں۔ یہ سب تو... یہ سب امن کے زمانے کی باتیں ہیں۔

تو سمجھ لینا ۔۔ یہ کسی انسان کی آواز ہے۔

کیسا انسان ونسان؟ یہ ہندو مسلم فسادات تھے۔ اس میں انسان نہیں تھے، ہندو تھے اور مسلمان تھے۔ انسان کی انسانیت کو پکارنے کی کوشش بےسود تھی۔

Scanned with CamScanner

ما نے انسانیت کو نہیں پکارا تھا۔ چشم زدن میں، اپنے خیال پرست ذہن میں کسی جھپاکے سے سما جانے والی حیران کی سوجھ بوجھ نے اسے آدمی کے حماقت خیز خواب کو جگانے، کوئی ڈور انکا کر اس سے لٹک جانے، اور اپنا کنبہ پار لے جانے پر اکسایا تھا۔ جوئے کی ایک اندھی بازی کی طرح اس نے سواجی ٹیکسی والے سے کہا تھا:

"بمبئی لے چلو گے ہمیں؟ ہم ایک فلم ایکٹر کے گھر جائیں گے۔"

سواجی ٹیکسی والا، جو وہیں ترائی میں گھومتا پھرتا تھا، اور اس سے پہلے کبھی ماتھے پر سیندور ملے نہ گھوما تھا، جس نے یہ سیندور شاید فسادات کے اعزاز میں لگایا تھا، اور جو یوں ہی، فسادات کے جوش میں اینڈتا ہوا ٹیکسی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، فلم ایکٹر کا نام سن کر موم ہو گیا تھا۔ ایک جھلملاتا خواب اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔

"بائی، میرے کو ملائے گی؟" اس نے ہنس کر کہا تھا۔

"ہاں... فلم ایکٹر بنو گے تم؟"

سواجی ٹیکسی والا ہنسنے لگا۔ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا ۔۔ اس مسلمان خاندان کو بحفاظت بمبئی تک لے جانے کے لیے، جیسے وہ قتل کرتا یا نہ کرتا (کیوں کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھی)، کم از کم ، دو چار لوگوں کے ساتھ مل کر، انتشار کے اس لمحے میں، لوٹ تو ضرور سکتا تھا۔ لیکن فسادات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ فلم والوں سے ملنے کا موقع بار بار کہاں آتا ہے! اس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ زیرلب ایک مراٹھا گیت گنگنانے لگا تھا۔

طیّب بھائی نے تو انہیں نکے رہنے کو کہا تھا۔ سفر کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ پھر ما اور با کے پیر کیوں کر اکھڑ گئے؟ کیقباد اپنی ولا میں قتل کر دیا گیا تھا۔ کیقباد؟ وہ کیسے؟ وہ تو مسلمان تک نہیں تھا! اور یہ ہندو مسلم فساد تھی۔

"دھوکے میں بائی۔" سواجی ٹیکی والے نے بتایا تھا۔

"دھوکے میں؟" ما کا منھ حیرت سے پھٹا رہ گیا تھا۔ "کیقباد کا نام ہندوؤں جیسا نہیں تھا۔ اس لیے کیا؟ دھوکے میں مارا گیا؟" .

"ہاں، نیچے سے کوئی آیا تھا۔ ادھر کا نہیں تھا بائی۔"

دوسری صبح کیقباد کو اس کے بستر میں خون میں نہایا، اکڑا پڑا دیکھ کر، بات پھیل گئی تھی۔ اس کے بعد کیقباد کی ولا مقامی لوگوں نے ہی لوٹی تھی۔

اب ما اور با کے لیے وہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ جب ایک واردات ہو گئی تھی تو اب بات ختم ہونے والی نہیں، پھیلنے والی تھی۔ پولیس کا دھیان ترائی کے قصبوں میں لگا تھا۔ پولیس تو پہاڑی پر موجود ہی نہیں تھی۔ نابود ہو چکی تھی پہاڑی سے۔ سو جب موت کا خطرہ ہر طرف ہو، تو جان بچانے کی ایک کوشش کیوں نہ کر لی جائے۔

سب سے آخر میں ولا چھوڑنے والی ما تھی۔ آشا کا ہاتھ تھام کر، ہینڈبیگ سے سو پچاس روپے نکال کر، اس کے ہاتھ میں تھما کر، وہ نیچے جانا چاہ رہی تھی۔ — پھر ہونے کو تھی۔ تب

تک کچھ اور خبریں پہنچ رہی تھیں۔ کاشنے کا لنگوٹ کسے ایک قلی عورت ابھی ابھی آشا کے پاس سے گئی تھی۔ گود میں بچہ سنبھالے وہ تھوڑی دیر خاموشی سے باتیں کرتی رہی تھیں۔

کیا کہتی تھی؟" ما نے گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ کسی انجانی بولی میں سرگوشیوں نے اس کے بدترین خوف جگا دیے تھے۔اس کا دل دیوانہ وار دھڑک رہا تھا۔ ذہن میں باربار یہ خیال آتا: یہ ٹیکسی ڈرائیور... ہمیں کہاں لے جائے گا؟

"کیقباد کو..." آشا نے آہستہ سے کہا، "سرلا کے باپ نے مار ڈالا ہے ۔۔ اس کی رکھیل تھی نا، اس کے باپ نے۔ ورلی رات کو پہاڑ پر چڑھا۔ ادھر اُدھر چاقو گھونپے جا رہے تھے۔ بس یہی موقع دیکھا۔"

اس انکشاف کو اپنے خوف زدہ دماغ میں سمونے کی کوشش کرتی ما ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ وہ کیقباد کے قتل میں دھوکے کے عنصر کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کس نے کس کو دھوکا دیا؟ دھوکا تو تھا، شاید دوہرا دھوکا۔ کیقباد مسلمان ہونے کے دھوکے میں نہیں مارا گیا۔ ورلی نے لوگوں کو دھوکا دیا کہ یہ ہندومسلم فساد ہے۔

پھر اس کے ذہن سے الجھاؤ کی پھانس نکل گئی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی ساری قوت گاڑی کے چلنے میں لگا دی۔

ٹیکسی کا دروازہ بھڑاک سے بند کر کے، مشین کو ایک بھاری غرّاہٹ کے ساتھ چلا کر، مراٹھی میں کوئی نعرہ مار کر، پہاڑی ڈرائیور نے گاڑی کو پوری، اندھادھند رفتار سے دوڑا دیا تھا۔

مضبوطی سے بچوں کو تھامے سنبھلی تھی ما۔ قرآن سے آیتیں پڑھتی ہوئی، جیسے ذہن کا کوئی بند توڑ کر اس پر آیتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ کیا اسے واقعی اتنی آیتیں یاد تھیں؟ اتنی زیادہ... شاید ہی کوئی آیت دوہرائی ہو۔ زندگی بھر مطلب کے خبط میں گرفتار رہنے کی وجہ سے اسے ان سب آیتوں کے معنی معلوم تھے۔ لیکن اس وقت وہ معنی سے ماورا تھی۔ بلکہ معنی اس کی یکسوئی میں رکاوٹ تھے۔ وہ نہیں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے! کہ خدا ربّ العالمین ہے، کہ اس نے جمے خون کے لوتھڑے سے انسان کو پیدا کیا، کہ انسان خدا کا راز ہے اور خدا انسان کا راز ہے...

سواجی ٹیکسی والا فلم ایکٹروں کی حسین، جگمگاتی دنیا کے خواب میں مسحور ہو گیا تھا۔ اس کا سراپا ہی جیسے بدل گیا تھا۔ چمکیلے خواب کی سرایت سے اس کا چہرہ جگمگا گیا تھا۔ آنکھوں میں کہیں دور کا منظر اتر آیا تھا۔ ٹیکسی اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ "میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر وہیں ایک جھاڑی کے پیچھے پیشاب کرنے گیا تھا۔ تب ذرا فاصلے سے ما نے اسے دیکھا تھا۔ بھورے آسمان تلے، جنگلی جھاڑی کے پاس رفع حاجت کرتا ہوا آدمی، جس کے گویا عین سر پر ایک خواب کسی بڑی سی طلائی، جگمگاتی بھنبھیری کی طرح گونجار کر رہا تھا اور منڈلا رہا تھا۔

ٹیکسی اس کے کسے کو گود میں بھرے، پہاڑی ڈھلانوں سے چکراتی ہوئی، اندھادھند نیچے اتر رہی تھی۔

ما نے سرخ پہاڑ پر نظر ڈالی۔ جس کی پُرشکوہ درازوں میں اسے تال نظر آیا۔ اسے سرلا کا چہرہ یاد آیا۔ اور پھر اسے یاد آیا۔ وٹھو کربٹ! وٹھو کربٹ کی سنائی ہوئی، گھٹنوں پر محیط داستاں۔ اس کا کانپتا، کانپتا لہجہ...

"ورلیوں نے کھاتےدار کو جنگل میں گھیر لیا تھا۔ نئیں نئیں! مارا پیٹا نہیں تھا۔ بس کپڑے اتارے۔ لنگوٹی پہنائی۔ ایک گٹھا لکڑی اس کے سر پر رکھّی۔ اور بولے: اُدھر جاؤ۔ اب اِدھر آؤ۔ اب اُدھر جاؤ۔ ہا ہا ہا!" وہ ہنستا تھا۔ یاد سے اس کی بجھتی آنکھیں اور بھی دھندلا گئی تھیں۔ "اور بولے: بل میں جوتیں تیرے کو؟ کھاتے دار رو رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ گوداوری مائی ایک دم ناراج ہوئی سی کر... گوداوری مائی ناراج ہوئی۔ ایسا کرنے کا نئیں! بولی۔ ہی ہائی، وہ تھوڑا ہنسی بھی تھی۔

"ورلی اکٹھا ہوا نا بائی، تو کھاتےدار سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ لوٹ کر آیا معاملت دار کے ساتھ۔ پن ہم سب کو تو مالوم تھا۔ ایسا ہی ہونا ہے۔ ورلی ایک کے پیچھے ایک گیا۔ ہزاروں ورلی..."

"ہزاروں؟" ما نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں۔ ہزاروں۔ ایک دم لیف رائٹ لیف رائٹ۔ سینا کے جیسے۔ اور گوداوری مائی نے ایک دم بولا: ڈرنا نہیں۔ ہٹنا نہیں۔ ایکدم سیدھی بات۔ ڈھائی روپیا اور تین روپیا مجوری، اور گھاس کی کٹائی ساڑھےچار روپیا۔ اکھیر کو مانا۔ پن پہلے کہاں! کتنے سو کو تو جیل میں ڈالا تھا۔ کتنے سو کو..."

گوداوری مائی!

گوداوری مائی کوئی دیوی نہیں تھی۔ وٹھو کربٹ کی داستانیں، اس کے کہیں سال، شکست و ریخت کے شکار دماغ کی بنائی انمل بےجوڑ تصویریں نہیں تھیں۔

گوداوری مائی -- گوداوری پارولیکر۔ دراصل گوداوری گوکھلے -- انڈین کمیونسٹ پارٹی کی ایک کارکن تھی۔ جیسا کہ اس پہاڑی سے اتر کر، بمبئی میں، سنجری بازار کے پاس پارٹی آفس کے رکارڈوں میں آپ کو پتا چل سکتا ہے۔ ۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک کے دوران، دو برسوں میں، اس کے کام نے زمیں داروں کی مار کھاتے، بیگار بھرتے، ان کے اور پولیس کے ہاتھوں آئےدن قتل ہوتے آدی واسی ورلی کسانوں کو ایک حیرت انگیز تحریک کی صورت میں منظّم کر دیا تھا۔

پارٹی آفس ریکارڈ۔ گوداوری گوکھلے کی تحریر۔

"یہ نومبر ۱۹۶۲ کی بات ہے، جب میں اور دوسرے ساتھی جیل میں تھے، کہ مجھے کچھ یادداشتیں لکھنے کا خیال آیا۔ ۱۹۶۵ میں، جب مجھے یارےواڑا سنٹرل جیل بھیجا گیا، میں نے کچھ لکھنا شروع کیا ... لوگ سوچیں گے، میں آدی واسیوں میں کیوں گئی تھی۔ دراصل جب ۱۹۳۲ میں مجھے جیل سے رہائی ملی تھی، تب میں نے اور کامریڈ شام راؤ نے مہاراشٹر کے کسانوں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر جب ۱۹۳۵ اور ۱۹۳۶ میں مجھے دوبارہ جیل بھیجا گیا، تھانے ڈسٹرکٹ سے علاقہ بدر کرنے کے بعد..."

آنسوؤں کی ایک موٹی چادر نے ما کی آنکھوں میں یہ تحریر دھندلا دی تھی۔ مسلسل قید و بند کی، علاقہ بدری کی، ورلی کسانوں کے جھونپڑوں میں راتیں گزارنے کی، گھنے جنگلوں کو پیدل پار کرنے کی، پہاڑیوں پر، کھلے آسماں تلے راتیں بتانے کی، عدالتوں میں گھسیٹے لیے جانے کی ایک ششدر کرنے والی، دل چیر دینے والی داستاں۔

۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک۔

گوداوری مائی! ما آنسوؤں کے بیچ ہنسی۔ جیسے جانے کی عادت تھی۔ جو جھونپڑیوں میں پورے دو سال رہی۔ اسے کھلے جنگل جانے کی عادت نہیں پڑ سکی۔ اسے باتھ روم کی تکلیف ہوتی تھی۔

"مگر جیت ورلیوں کی ہوئی۔" آگے لکھا تھا۔ "گھاس کا گٹھا آخرکار، ساڑھے چار روپے میں ہی لیا جانے لگا۔"

پارٹی آفس کے دُھول بھرے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے حنوط شدہ اور مدفون یہ ایک کہانی تھی۔ ایک بھولی بسری داستاں جو اب کسی کو بھی یاد نہیں۔ واقعات کے اس گتھے ہوئے باقی میں، جسے کوئی جُلاہا اپنی کرگھے پر ان گنت سوت کے دھاگوں سے لگاتار بُنے جا رہا ہے، یہ صرف ایک ڈور تھی، جس کا پتا بھی نہیں چل سکتا۔ جو ان گنت رنگوں میں مل کر ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی ہے۔ گوداوری کی یاد البتہ، اس نسل کے بڈھوں کے دلوں میں تھی۔

اس تحریک کو یاد رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کیوں‌کہ یہ ایک کامیاب تحریک تھی۔ یہ اپنا چھوٹا سا مقصد پورا کر کے ختم ہوئی۔ جیسا کہ گوداوری پارولیکر نے لکھا، گھاس کا گٹّھا بہرحال ساڑھےچار روپے میں خریدا جانے لگا تھا۔ چند ہی برسوں میں مہنگائی نے بڑھ کر ساڑھےچار روپے کو ایک فحش مذاق بنا دیا تھا۔ پر اس کا گوداوری کے جیون سے، اس کی کل نقدِحیات سے تعلق نہیں تھا جو اس مراٹھی نے دن اور رات کے چھن چھناتے سکّوں کی طرح ورلیوں پر نچھاور کر دی تھی اور جدید ادب کے تمام نقد اصولوں کو سرمو خاطر میں نہ لا کر، ایک لرزہ خیز، بامقصد زندگی گزاری تھی۔ وہ شاید اب زندہ نہ ہو، اور اس کی شب و روز کی محنت کسی طرح کی ہوئی کائناتی توانائی کے انبار میں کہیں خلا میں چکراتی ہو! کیوں‌کہ فرائیے سے اٹھتی بڑھتی ہوئی ما کو، بمبئی پہنچ کر، ایک بوڑھے فلم ایکٹر سے ایک مکالمہ سن کر بھونچکا ہو جانا تھا کہ "کرم کبھی ناش نہیں ہوتا۔"

ooo

محفوظ مقام پر پہنچ کر، جب ان کی جان میں جان آئی تو غصّے سے ما اور با کا خون

کھولنا شروع ہوا۔ اس قدر اتیاچار؟ گھور ناانصافی! فوراً ایک بیان تیار کر کے وہ اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں سے دستخط کرانے کی مہم میں جٹ گئے۔ (انہیں یہی کام آتا تھا!)

"ہم اس خوں‌ریزی کی مذمت کرتے ہیں۔" بیان کا لب لباب یہ تھا۔

دستخط کرانے کے لیے، ہا اسے فلم اسٹوڈیو لے گیا۔ آرٹ فلموں کا ایک سندھی ہدایت کار اس کا دوست تھا۔

وہ ایک دانشور تھا۔ ایک پُرکشش دانشورانہ داڑھی کا مالک، تقریباً ادھیڑ سندھی، جو ابھی تک جوان ہی نظر آتا تھا۔ وہ ہا سے پہلے مل چکا تھا۔ ہا کے دیہاتی پن پر رشک کر چکا تھا۔ وہ اپنی سرزمین سے اکھڑا ہوا تھا۔ سندھی ہونے کا احساس اس کے لیے تقریباً ایک پوشیدہ احساسِ جرم تھا۔ وہ کامیاب تھا اور ہندوستان کی دانش ور دنیا اسے پُوج رہی تھی۔ لیکن وہ اس احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بمبئی میں، پورے ہندوستان میں، ایک "غیر" ہے۔ وہ حسین سے حسین اور بامعنی فلمیں بناتا تھا۔ آدی واسیوں کا استحصال اس کا موضوع تھا۔ لیکن کہاں تھے وہ لوگ جو اس کے اپنے ہوں؟ سب جانتے تھے کہ وہ سندھی ہے۔ ہا کا دیہاتی پن دیکھ کر وہ اس کے ساتھ کھل گیا تھا۔ اکیلے کسی کونے میں ہا کو گلے لگا کر رویا تھا۔

"ہوں ہوں۔۔۔ میں سندھی ہوں۔"

ہا نے اس کو تسلّی دی، سمجھایا۔

"وہاں تو سب مسلمان ہیں۔"

لیکن آرٹ فلموں کا ہدایت کار کون سا اعتقاد کرنے والا ہندو تھا؟ وہ تو ناستک تھا۔ لادین، دہریہ۔ ہندو ہونا اس کی شخصیت کی صرف ایک منفی، چوٹ کھانے والی جہت تھی، جس کے باعث اس کے خاندان کو اپنی جنم بھومی خواہ مخواہ چھوڑنی پڑی تھی۔ کیا فرق پڑتا اگر وہ سندھ میں ہوتا؟ ان لوگوں میں جن کی بولی، ریت رواج، موسیقی، سب کچھ اس کی اپنی انتڑیوں سے نکلتے ہوئے؟

"فرق پڑتا!" ہا نے اسے سمجھایا تھا۔ "بہت اچھا ہوا تم وہاں سے چلے آئے۔ اگر وہاں ہوتے تو کبھی آرٹ مووی نہ بنا پاتے۔ فلمیں وغیرہ تو وہاں تقریباً ختم ہی ہو گئی ہیں۔"

"وہ کیوں؟" اس نے غور کرنا چاہا۔

ہا کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس وجہ سے فلمیں اس کے وطن سے تقریباً ختم ہی ہو گئیں۔

"اگر میں ہوتا۔۔۔ تب دیکھتے!" سندھی ہدایت کار نے جوش میں آ کر کہا۔

ہا ہنسنے لگا۔ "کیا دیکھتے؟ کچھ بھی نہ ہوتا۔ بھئی وہاں مارشل لا لگا رہتا ہے زیادہ تر۔ اور پھر۔۔۔ تم ہندو ہو یار!"

آرٹ مووی کا ہدایت کار جی مسوستا رہ گیا۔ اس کی زندگی کا المیہ اس کی ذات سے پرے، کہیں اور تھا۔ اور وہ یہ کہ ایک صوبے کی اکثریت مسلمان تھی جس کی وجہ سے وہ

غیرطبقاتی خوں‌ریزی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دل نرم تھا۔ ان کے چہروں پر گمبھیر دکھ اتر آیا۔ مگر وہ خاموش تھے۔ کمرے میں ہر شخص خاموش تھا۔

"آخر اس وقت۔۔۔" ما نے کہا۔ "کوئی بھی ہندو سچ کیوں نہیں بول رہا ہے؟"

جیسے بجلی کا کرنٹ چھو جائے، وہ سب اس طرح چونکے۔ وہ بکّا بکّا رہ گئے۔ برسوں سے کسی نے ان کے منھ پر "ہندو" کا لفظ اس طرح دے نہیں مارا تھا۔ جن حلقوں میں وہ اٹھتے بیٹھتے تھے، وہاں خیالوں کی، نظریات کی باتیں ہوتی تھیں۔ کوئی کسی کے مذہب کا ذکر اس طرح نہیں کرتا تھا۔ ما کے ہاتھ سے بیان کا کاغذ لے کر انھوں نے فوراً دستخط کر دیے۔

"ویسے۔۔۔" ہدایت کار نے تھوڑی کڑواہٹ اور دبائے ہوئے غصّے سے کہا۔ "ہم سب ہندو جاتی میں اتفاق سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ تو شاید آپ جانتی ہوں۔ یہ ایک پیدائش کا حادثہ ہے۔"

"بس تو پیدائش، جو ہمارے بس میں نہیں، ہم پر کچھ ذمے‌داریاں ڈالتی ہے۔ اور انہیں جوں توں نبھانا ہی پڑے گا۔" ما بڑبڑائی۔ یہ اسے کون سی نئی بات بتا رہے ہیں؟ لیکن اس کا کیا علاج کہ ازروئے‌اتفاق یہ ہندو ہیں اور اس کاغذ کو انہی کے دستخطوں کی ضرورت تھی۔

ما کے ذہن میں اس وقت نہیں تھا، مگر بعد میں اسے خیال آیا۔ یہ تو کوئی گیتا کی سطریں تھیں۔ "بس تو اے ارجن! یہ یدھ تو تجھے کرنا ہی ہے۔ تو چاہے یا نہ چاہے۔ اس کے لیے ذمے‌دار ہو یا نہ ہو۔ مگر جو فرض حالات نے تجھ پر ڈالا ہے اسے پورا کرنا ہی تیرا دھرم ہے۔" بےخیالی میں فلم والوں کو گیتا کا اُپدیش دے کر مسلمتی رفوچکر ہوئی۔

السٹریٹڈ ویکلی نے سیاہ سرورق چھاپا اور اس پر سرخ حرفوں میں لکھا: شرم!

ہندوستانی لکھکوں، فنکاروں، دانشوروں نے اس خوں‌ریزی کی مذمت کی تھی۔ ہندوستان کے اخبارات اس بہیمیت کی مذمت سے بھرے پڑے تھے۔ مگر وہ زیادہ تر انگریزی اخبار تھے۔ مسلمان انگریزی اخبار زیادہ تر نہیں پڑھتے تھے۔ شاید پڑھ سکتے بھی نہیں تھے۔ قیاس یہی ہے کہ پڑھے لکھے، روشن خیال ہندو طبقے میں اپنے لیے بےساختہ اٹھنے والی ہمدردی کی لہر سے مسلمان بےخبر ہی رہے ہوں گے۔

رات کو ہا اور ما نے شامل جی کے گھر جانے کی ٹھانی۔ طیّب بھائی نے بمبئی میں انہیں کسی دوسرے ہم فرقہ کے خالی فلیٹ میں جوہو کے پاس ٹھہرا دیا تھا۔ شامل ہندوستانی فلموں کے ایک کیریکٹر ایکٹر تھے۔ لیکن وہ برسوں سے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی تھے۔ تقسیم سے پہلے وہ لمبے عرصے کراچی میں رہے تھے۔

بڑکی اور ککلی اپنے کمرے میں کھسرپھسر کر رہی تھیں۔ کل ہم باہر نکلیں گے۔ دونوں بچیاں پروگرام بنا رہی تھیں۔ ما نے کمرے میں جھانکا۔ ایک منٹ کے لیے وہ دونوں کی ہیئت کذائی دیکھتی رہی۔ بڑکی نے الٹی سیدھی اس کی ساڑھی لپیٹ لی تھی۔ ایک دوپٹے سے ککلی کو لہنگا

rekhta
Scanned with CamScanner

پاکستان میں شامل ہو گیا تھا، اور اسے اپنے کنبے سمیت ہندوستان آنا پڑا۔ اور نہ جانے کتنی نسلوں تک ایک کبھی تذکرہ نہ کی جانے والی، مگر پتھر کی طرح سخت بےوطنی کو اپنے پیٹ میں جھیلنا پڑا۔ اور اس سلسلے میں کوئی کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ ڈیموگرافی نے آرٹ فلموں کے سندھی ہدایت کار اور بےشمار سندھی ہندو شاعروں، کہانی کاروں اور دانش وروں کے ساتھ ہاتھ کر دیا تھا۔ جو اپنا تہذیبی وجود بچانے، یا جس بھی پردیش میں رہ پڑے ہوں ان میں مل جانے کی دو متضاد خواہشوں کی چکّی کے پاٹوں کے بیچ پسے جا رہے تھے۔

سندھی ہدایت کار مارکسی تھا۔ آدی واسیوں کی زندگی پر فلمیں بناتا تھا۔ لیکن عورتوں کے لیے اس کے خیالات اپنی ہی طرح کے تھے۔ اس کی تمام فلموں میں عورتیں کسی نہ کسی چیز کا استعارہ ہوتی تھیں۔ زیادہ تر مردوں کی غیرت کا استعارہ، جسے پامال کر کے بالائی طبقہ محنت کشوں پر ستم ڈھاتا تھا۔ یا پھر، اگر وہ کافی پُرگوشت ہوں، تو چمکتے کاسٹیوم پہنا کر وہ دنیاوی حرص و ہوس کا استعارہ بن سکتی تھیں۔ کچھ بھی ہو، وہ جیز جیز تقریریں نہیں جھاڑتی تھیں۔

ڈائریکٹر نے ما کے بارے میں سنا تھا کہ وہ انٹلکچوئل ٹائپ کی ہے۔ وہ تلخ ہنسی ہنسا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس طرح کی عورتیں، دراصل، کسی جنسی کج روی کے رجحان کو دبا کر، اس کے نعم البدل کے طور پر انٹلکچوئل بن گئی ہیں۔

اس وقت وہ ایڈیٹنگ روم میں، ایک کامنی سی حسین معاون کے ساتھ اپنی نئی فلم کے رَش پرنٹ دیکھ رہا تھا۔

ما پر اس نے ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ اس کے تصوّر کو دھچکا لگا۔ ما ذرا بھی گلیمرس نہ تھی۔ بےڈھنگے کپڑوں میں، اجاڑ صورت لیے ایک عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جب دستخط کرنے کے لیے ما نے کاغذ اس کے سامنے بڑھائے تو اس نے ایک نظر ڈالی۔ پھر کہا:

"اور مسلمانوں نے جھگڑا کیوں کیا؟ اڑتیس برس بعد پہلی بار بچارے مراٹھوں نے گن پتی کا جلوس نکالنا چاہا تھا۔"

آرٹ فلموں کا ہدایت کار نکسل وادیوں کا ہمدرد تھا۔ اس کا دل ان کی تشدّد کی حکمتِ عملی کا ساتھ دیتا تھا۔ شوسینا میں بھی غریب مراٹھے شامل تھے۔ وہ ان کے تشدد کے بارے میں کیا محسوس کرتا تھا؟ یہ وہ صاف صاف نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ تو صاف صاف یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے بہتر چوٹ کھایا ہوا، اپنی جنم بھومی سے بلاقصور مار بھگایا ہوا جی خونی انقلاب کی آرزو کرتا ہے یا صرف تشدّد کے لیے تڑپتا ہے۔

"شاید مسلمانوں نے غلطی کی۔" ما نے دانت بھینچ کر کہا، "لیکن کسی بھی غلطی کی سزا، پیٹھ میں چُھرا گھونپ کر آگ میں جھونکنا نہیں ہوتی۔ یا ہوتی ہے؟ کیا یہ ایک اقلیت کے ساتھ بدترین ظلم نہیں ہوا؟"

ہدایت کار اور اس کی کامنی سی معاون متاثر ہو گئے۔ ہدایت کار شعوری طور پر

سا پہنا دیا تھا۔ دونوں کے ماتھے پر چوڑی چوڑی بندیاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑکی اپنے خیال میں ہندو ہونے کا بہروپ بھر رہی تھی اور حسبِ معمول خوشی سے بےقابو ہوتی جا رہی تھی۔

"تمھارا نام ستا اور میرا نام گیتا۔ کوئی پوچھے تو یہی بتانا ... سمجھیں؟"

"اچھا۔" ککلی نے خوشی سے سر ہلایا۔ اس کے کان چھدے ہوئے نہیں تھے۔ بڑکی نے اپنے لمبے بندے اس کے بالوں میں ہی سے لگا دیے تھے۔ ککلی انھیں جُھلانے کے لیے سر ہلا ہلا کر ہاں اور نا کہہ رہی تھی۔

ما منہ پر ہاتھ کر ہنسنے لگی۔

"ایسے ہوتے ہیں ہندو؟" ما نے ہونٹ کاٹ کر پوچھا۔

بڑکی اور ککلی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بڑکی نے اپنا اور ککلی کا دل بھر کر حلیہ بنایا تھا۔ کاجل کی لکیریں بھر بھر کر انھیں کانوں تک کھینچ دی تھیں۔ ہونٹوں پر لال سرخ لپ اسٹک لگا کر انھیں جوڑا بنا دیا تھا۔

کھی کھی کر کے بڑکی ہنسی۔

"نہیں تو۔ مگر ما! ہم تو بن رہے ہیں نا ... جھوٹ موٹ۔"

ما کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کے دل میں ایک زہریلی آرزو دعا کی طرح لہرائی، مار دے کوئی بلوائی مجھے خدا کرے...۔ راستے بھر وہ ڈر سے کانپتی رہی تھی بلوائی کے چہرے کے خوف سے۔ راستے میں انھوں نے جلے ہوئے مکان دیکھے تھے۔ راستے کے کنارے منہ کے بل الٹی پڑی ہوئی ایک لاش دیکھی تھی۔ اور پھر جیسے ان پر ترس کھا کر سورج ڈوب گیا تھا۔ ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ ان منظروں کو اندھیرے نے چھپا دیا تھا۔ سواجی ٹیکسی والا ابتدائی گیت گنگنا کر رفتہ رفتہ خاموش اور معصوم ہو گیا تھا۔

ما نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے کھنچے ہوئے لہجے میں ہوں ہاں میں جواب دیا۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ اس چھوٹی سی کھٹارا گاڑی میں ما اور اس کا کنبہ ہی تو ایک ہندو کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا؛ وہ خود بھی تو مسلمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بمبئی کا رہنے والا بھی نہیں تھا۔ مسافروں کو ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچاتے ہوئے، راستے میں کسی مسلمان علاقے سے گزرنے کے خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ ٹیکسی ڈرائیوروں کے مخصوص لاابالی پن اور بےجگری کے سے انداز میں پوری رفتار سے گاڑی چلاتے جا رہا تھا۔ صرف شامل جی سے ملتے ہوئے، ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے، وہ جیسے دوبارہ زندہ ہوا تھا، پھر سے پہلے جیسا بنا تھا۔ ایسا نہیں جیسا وہ بلوے والے دن تھا؛ فسادوں سے محفوظ فاصلے پر، فسادوں کی خبریں سن کر بلاسبب انگڑائی لیتا اور اینڈتا ہوا۔ وہ ایسا ہو گیا تھا، جیسا وہ بلووں سے پہلے تھا۔ احاطے کی روشنی میں ما کو اس کی ہوائی، شناسا ہنسی چمکتی ہوئی نظر آئی تھی، جب بہاڑی اسٹیشن پر وہ سواریاں بھرنے کے لیے جھٹ پٹ آوازیں لگاتا تھا۔

ما اور با صرف اس سے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے، رات بڑے شامل جی کے گھر چلے آئے تھے۔ سواجی ٹیکسی والے کو شامل جی سے ملا کر وہ طلب بھائی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے تھے۔ پھر خوف نے اپنا پراسرار وقت پورا کر کے، تھکا مار کے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اچانک ... اب

Scanned with CamScanner

ذرا بھی خوف نہ تھا۔ ما کے دل میں اب ایک حقارت بھری بےفکری سما گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس میں اچانک کوئی آسمانی طاقت بھر گئی ہو۔ اس وقت وہ اپنی اصلی طاقت سے کہیں بڑھ کر کچھ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ اور شاید گردن تڑوا بیٹھتی۔ کیوں‌کہ یہ ایک وہم تھا۔

با اور ما کو شامل جی نے گلے سے لگایا۔

بوڑھے سینے کی گرمی اور شفقت محسوس کر کے ما تھرتھرا گئی۔ اس کی آسمانی طاقت غائب ہو گئی۔ اس نے مشکل سے آنسو ضبط کیے۔

"دیکھیے... یہ کیا ہو رہا ہے؟" ما نے شامل جی کے جھرّیوں بھرے ہاتھ تھام کر کہا۔ پھر وہ غرّائی۔ "اور آپ لوگ... آپ لوگ کچھ بھی نہیں کرتے؟"

بوڑھے شامل جی نے حیرت بھری مسکراہٹ سے منھ پھاڑ دیا۔

"تو کیا کریں ہم؟ ارے بھئی ہم کیا کریں؟"

ان کی آواز میں بڑھاپے کی ہلکی سی لرزش تھی۔ فلموں میں کتنی بھلی لگتی تھی، ما نے حیرت بھری مسکراہٹ سے سوچا۔ مگر یہ تو اصلی شامل تھے، اصلی شامل جی! بالکل ویسے جیسے فلموں میں نظر آتے ہیں۔ شامل جی کو اداکاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر اسے فسادات یاد آئے۔ اس کا دل پھر غم اور غصے سے تڑپا۔

"اب یہاں نام پوچھ پوچھ کر چھرے گھونپے جا رہے ہیں۔"

"تو؟ تم سمجھتی ہو مجھے کوئی چھرا نہیں گھونپ سکتا؟ مجھے تو مسلمان بھی مار سکتے ہیں اور ہندو بھی۔ فرقہ پرست لوگ سیکولر آدمی کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔"

ما یہ بات جانتی تھی۔ مگر اس کے سینے میں دل کسی پتھر کھائے پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

"دیکھو..." شامل جی نے کہا۔ "اب ہمارا راج تو ہے نہیں۔ ہمارا راج ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ جہاں کمیونسٹ حکومتیں ہیں، وہاں کبھی سنا بلوہ فساد ہوتا؟ کیرالا ہے، بنگال ہے، وہاں کبھی سنا؟"

ما ڈبڈبائی آنکھوں سے شامل جی کا منھ تکتی رہی۔ یہ سچ تھا۔ نہ مغربی بنگال اور نہ کیرالا میں، ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا تھا وہاں۔

شامل جی نے اسے اپنے بڈھے سینے سے بھینچ لیا۔ "جب انقلاب آ جائے گا نا... تب نہیں ہو گا ایسا۔ مجھے پورا یقین ہے۔"

جب انقلاب آ جائے گا!

ما جھٹکے سے شامل جی سے علیحدہ ہو گئی۔

"مگر انقلاب نہیں آ رہا ہے شامل جی؟" اس نے بےبس غصے سے کہا۔ اچانک وہ شامل جی

پر اس طرح برسنے پر خاصی شرمندہ ہوئی۔ لیکن وہ دہاڑیں مار مار کر رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسی منصف کی طرح کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ..."

"کیا؟"

"کہ بنگال اور کیرالا میں بھی..." اتنا کہہ کر بات اس کے ذہن میں پھر الجھ گئی۔

"یہ تو سچ ہے" ما نے مانا۔ "کہ بنگال اور کیرالا میں فساد نہیں ہوتے۔ کمیونسٹ حکومتیں اس میں حصےدار نہیں ہوتیں۔ لیکن... یہ اتفاق ہے۔"

"اتفاق؟"

"نہیں... کمیونسٹوں کا فساد نہ کروانا اتفاق نہیں۔ لیکن اتفاق یہ ہے کہ بنگال اور کیرالا میں کمیونسٹ حکومتیں ہیں۔ میرا مطلب ہے اصل میں تو یہ شمالی ہندوستان کے غلبے کے خلاف... ایک قوم پرست تحریک ہے بنگال میں اور کیرالا میں۔ یوپی کی لیڈرشپ کے پیچھے نہیں چلنا چاہتے یہ لوگ..." اس نے پریشانی میں وہ بات کہہ دی جو نہ جانے کب سے اس کے دل میں آ چکی تھی۔ جیسے وہ کھل کر خود بھی سمجھ نہ کر رہی تھی۔

"نہیں نہیں نہیں" شامل جی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کیرالا میں تعلیم بہت زیادہ ہے۔"

"تعلیم" ما چلائی۔ "تعلیم سے فرقہ پرستی کہاں جاتی ہے؟ آپ نے فرقہ پرست موضوعات پر ڈاکٹریٹ کی تھیسس نہیں دیکھیں؟"

اسے [illegible] کی ایک [illegible] کا خیال آیا "اکبر کے دور میں ہندوؤں کی اصلی [illegible]" [illegible] ڈاکٹریٹ کے لیے لکھی تھی۔

"بات یہ [illegible]... [illegible] اور خود تو کہنے سنا۔ جیسے یہ اس کی جانی پہچانی آواز نہیں تھی۔ [illegible] جا رہی ہے۔"

اس وقت [illegible] بہت کر رونا تھا۔ ایسی بات سن کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے [illegible] رہی ہے۔

"بات یہ ہے کہ... [illegible] نہیں ہے، شامل جی" ما نے آنسو پی کر کہا۔ "یہ تو انیوہ کی بڑی قدیم [illegible] ہیں۔ [illegible] رہتی کی۔ جو نظریاتی روپ دھارن کر لیتی ہیں۔"

"کیا؟ تم [illegible] کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو؟"

"[illegible]" ما نے کہا۔ "مگر نظریاتی... نہیں۔"

"بات یہ ہے کہ..." ما نے سوچ سوچ کر بات منھ سے نکالی۔ "لمبے دورانیے میں جو آپ دیکھیں تو... [illegible] مزدور [illegible] کے خلاف... دوسرے مزدوروں کے ساتھ اتحاد کر لیں، یعنی اگر [illegible] دو فرقے رہتے ہوں تو، ہر ایک لمبے دورانیے میں... [illegible] مزدور بھی اگر شامل ہو جائیں... تو پھر وہ دونوں دیر تک ساتھ جائیں گے نہیں۔"

"ٹھیک ہے! ٹھیک ہے" شامل جی نے [illegible] سے کہا۔ "وہ تو سب جانتے ہیں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ مذہب افیون ہے معاشرے کے لیے..."

"اس کا تعلق مذہب سے کہاں ہے، شامل جی؟" ما بےساختہ چلائی۔

Scanned with CamScanner

کس چیز سے تعلق تھا اس کا؟ یہ بات خود اس کے ذہن میں صاف نہیں تھی۔ دماغ کے کسی اندھیرے کونے سے، جیسے خون اور حرام مغز کے ذروں سے کھینچ کھینچ کر، نکال کر، اس نے کہنا چاہا "لاتعلق سے۔ اس چیز سے جو سمجھ کے الٹ ہے۔ جو انتڑیوں میں ہے۔ خون میں۔ گوشت میں۔ جو بڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے۔ جو مرتا ہے۔ مرنے سے ڈرتا ہے۔ جو اندھا ہے۔ اندھا اور گونگا بہرا۔۔۔ مذہب تو سمجھ ہے۔ مذہب سے آدمی کا رشتہ ہے کتنا؟ شاید ایک فی صد بھی نہیں! جس نے آدمی کی کھال بھی نہیں کھرچی۔ اسلام نے نادر شاہ کو مجبور نہ کیا کہ دلّی میں کھوپڑیوں کے مینار نہ چنے۔ اور بدھ مت نے جاپانیوں کو یہ سکھایا کہ سونے کی انگوٹھی کے لیے جنگی قیدیوں کی انگلیاں نہ کاٹ لیں۔ اور عیسائیت نے امریکیوں کو مائی لائی میں نہ روکا کہ ننگی ویت نامی عورتوں کو ایک سنگ جوتے پر مجبور نہ کریں جب کہ وہ درختوں سے بندھے دشمنوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کررہے ہوں۔۔۔ مذہب ہو۔۔ یا نظریہ۔۔ سو تو سمجھ ہے شامل جی۔ شاید روح ہوتی ہو گی۔۔۔"

مبہوت سے کھڑے شامل جی اس کی بات سنتے رہے تھے، پھر وہ ایک لمبی، تھرتھراتی سانس لے کر بیٹھ گئے۔

"تم اتنی سائنس کرتی ہو۔۔۔" انھوں نے کہا۔ "آدمی ہندو ہے، مگر بنگالی بھی تو ہے۔ وہ مسلمان ہے، مگر تمل بھی تو ہے۔ فلاں ہے، مگر وہ بھی تو ہے۔ سکھ بھی۔۔۔ فی الحال، پہاڑ میں جانے کی ہزاروں سال پرانے جھگڑوں میں پڑ کر۔ ایک بات ہو سکتی ہوتی ہے تمھارے دماغ سے، یعنی آدمی آدمی ہے، مگر سرحد دار بھی تو ہے۔ ہوتی ہے ایک جبر طبقاتی کردار بھی۔ کون کراتا ہے یعنی یہ فساد؟ جانتی ہو؟ یہ بڑی بڑی ڈویلپرز۔۔۔ کنسٹرکشن کمپنی والے۔ جانتی ہو کیوں؟ یہ جھونپڑپٹیاں جو ہیں سالوں نہیں خالی کرتے ہیں۔ ان پر کئی منزلہ عمارتیں بنانے کے لیے۔ غریب مراٹھیوں کو پیسے دے دلا کر، پھر بلا کر، شروع ہیں خون خرابہ۔ سرکاری افسروں کو، سیاسی لیڈروں کو، سب کو پیسہ کھلاتے ہیں۔ اور سب کھاتے ہیں پیسہ۔۔۔" پھر وہ تھم کر بولے:

"اس سے پہلے بھی ہوئے ہیں فساد۔ پہلے تاملوں سے ہوئے۔ وہ بھی مزدور سارے۔۔ بےچارے غریب۔۔ آ گئے یہاں۔ پھر روزگار جو ملتا ہے، اس نے آ گئے۔ مال گودی ہے یہاں، بڑا پورٹ ہے۔ جہاں پورٹ ہو گا، لوگ آ جائیں گے ادھر ادھر سے۔ کنگنے میں دیکھو۔ کہاں کہاں سے آجاتے ہیں لوگ۔ پھر گھر بھی وہیں جاتے ہیں رات کو۔ دن میں کنگنے کی آبادی دگنی ہوجاتی ہے۔"

ما نے تاملوں کے فسادات کو سوچنے کی کوشش کی۔۔۔ بس ایک بار ہوئے تھے۔۔ اس کے دماغ میں اب۔۔ اور ہندو مسلم دنگے۔ ہر روز، ہر مہینے!

"یہاں پراپرٹی ڈویلپرز۔۔۔ اور دوسری جگہ کوئی اور وجہ ہو جاتی ہے۔ کہیں کی حکومت گرانی ہو تو ہندو مسلم فساد کرا دیتے ہیں۔ کہیں کانگریس کی مخالفت پیدا کرنی ہو، یا کہیں حمایت پیدا کرنی ہو، تب ہندو مسلم فساد کرا دیتے ہیں۔ کسی کو مندر کے نام پر پیسے اکٹھے کرنے ہوں، تب ہندو مسلم۔۔۔ ہم کے بکرے ہیں مسلمان؟"

شامل جی کا منہ اتر گیا۔ ہوش سنبھال کر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے

اپنے دل میں مذہبی نفرت نہ تھی۔ وہ مذہبی لڑائیوں کو سمجھنے سے قاصر تھے کیا؟ کیا انھیں پتا نہیں چلتا کہ۔۔۔ کہ کیسا لگتا ہے؟ ما نے عاجز آ کر سوچا۔ پھر اسے یاد آیا۔ پتا کیسے نہیں لگتا ہو گا! شامل جی خود سینتالیس کے فسادات میں کراچی سے آئے تھے۔ اسے خیال آیا کہ مسلمانوں نے بھی بہت کچھ کیا۔ اسے خیال آیا کہ کافی عرصے تک، مشرقی پاکستان میں، بنگالی مسلمانوں نے ہندو مسلم فسادات جاری رکھے۔ بنگالی ہندوؤں کو مار بھگانے، ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لینے کے لیے۔۔۔ اس کے اپنے والے حصے میں، مغربی پاکستان میں نہیں ہوتے ہندو مسلم فساد۔ لیکن وہاں اب ہندو ہیں ہی کتنے؟ دیکھنے کو بھی نہیں ملتے۔ سندھ میں ہیں تھوڑے بہت، پڑے ہوئے کہیں کونے کھدرے میں۔ اور یہاں۔۔۔ یہاں ہیں مسلمان۔۔۔ کروڑوں ہیں۔ دور دور تک پھیلے ہوئے، عجیب طرح سے۔ گاؤں گاؤں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں مشکل سے ہو گا جہاں دوچار گھر نہ ہوں مسلمانوں کے۔

کتنے ہیں مسلمان یہاں؟ وہ سوچ رہی تھی۔ بارہ کروڑ، کوئی کہتا ہے پندرہ کروڑ۔ پھر بھی کم ہیں۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اسے گوسنکر کی بات یاد آئی۔ یہ آدی واسی۔ آدی واسی بھی ہندو ہی بنیں گے؟ اب آر ویشو ہندو پریشد ہے؟ کوئی ہندو مراٹھا بن جائے گا، کوئی ہندو تامل بن جائے گا۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ اور بڑھ جائیں گے ہندو؟ اس کا بس چلتا تو کسی جادو سے ایک ایک مسلمان کے ہزار ہزار بچے پیدا کر دیتی۔ آناً فاناً مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر کر دیتی۔۔۔ پھر دیکھتی، کیسے کرتے ہیں یہ خون ریزی!

"کیا سوچ رہی ہو؟" شامل جی نے پیار سے پوچھا۔ ما نے بےبسی سے ان کا منہ تکا۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ شرم کے مارے وہ شامل جی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ وہ اصل میں کیا سوچ رہی تھی۔ آخر کیوں؟ دل کی کون سی تہہ اس کے خیالوں کو گھٹیا سمجھ رہی تھی؟ اس نے کوشش سے جھجھک مٹا کر، بےخوفی سے بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"سوچ رہی تھی کہ مسلمان کتنے کروڑ ہیں یہاں۔۔۔ برابر برابر ہوتے ہندو مسلمان تو اچھا رہتا۔"

"کیوں؟" شامل ہنسے۔ "تب خوب فساد رہتا؟ برابر برابر کا؟"

ما گھبراتی ہوئی پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ "نہیں، تب شاید نہ ہوتے فسادات۔"

شامل جی اداسی سے ہنسنے لگے۔

"یہ گنتی مت کرو۔" انھوں نے کہا۔ "گنتی سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے گنتی سے؟ جو تم سمجھ رہی ہو اس کا الٹ۔ دیکھو۔۔۔" بوڑھے شامل جی نے اسے دھیان دلایا۔ "جہاں مسلمان کم ہیں، بالکل کم، وہاں نہیں ہوتے فساد۔ تامل ناڈ میں نہیں۔ کرناٹک میں نہیں۔ جہاں زیادہ ہیں، برابر تک پہنچ رہے ہیں، وہاں بڑے زور سے ہوتے ہیں۔ ہے نا؟"

شامل جی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ما گڑبڑا گئی۔ اسے اپنا بچکانہ حساب کتاب بےسود لگا۔ پھر وہ بڑبڑائی:

"کچھ بھی ہو شامل جی، ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ شدید عدم تحفظ کا عالم ہے۔"

Scanned with CamScanner

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ چیزوں کو معروضی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کرو۔ تم تو بالکل ہلی ہوئی ہو جذبات سے اس وقت۔" شامل جی نے کچھ تاسف سے کہا۔

ما سچ مچ ہل گئی تھی۔ انسان ہی تو تھی وہ۔ کوئی فرشتہ تو نہیں تھی۔ آخر اس نے نگاہیں اٹھا کر کہا:

"معروضی کیا مطلب؟ مسلمان مارے جاتے ہیں۔ قتل ہونے والوں سے آپ توقع کرتے ہیں کہ سمجھ داری سے صورت حال پر غور فرمائیں گے! قتل ہونے والا سمجھ داری سے نہیں سوچ سکتا۔"

"ہاں۔" شامل ہنسے۔ "قتل کرنے والا بھی سمجھ داری سے نہیں سوچ سکتا..." لیکن شامل جی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات ان کے لیے بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہ تھی۔ وہ ایک نظریاتی آدمی تھے۔ پرانے کمیونسٹ۔ ساری فلمی مصروفیات کے باوجود پابندی سے پارٹی میٹنگ میں شامل ہوتے تھے۔ وہ ایک سنجیدہ انسان تھے۔ پرخلوص اور گرم جوش۔ ما کی سراسر غیرکمیونسٹ باتوں نے انہیں اندر سے جھنجھوڑ سا دیا تھا۔

شامل جی کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"یہ... مسلمان... یہ مسلمان..." شامل جی نے ٹہلتے ٹہلتے کہا۔ شامل جی کہاں کے رہنے والے تھے؟ کیسی عجیب و غریب اتفاق سے وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ ان کی آنکھیں ہلکی بھوری تھیں۔ ان کے باپ دادا فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ شین قاف درست ہونے کی وجہ سے انہیں ہندوستانی فلموں میں مسلمان کا رول دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ اکثر فلموں میں نوکر کے طور پر ایک نیک مسلمان بوڑھے کا کردار دکھایا جاتا ہے۔

"کیا کریں مسلمان؟" ما بڑبڑائی۔

"پڑھیں... لکھیں۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ پھر انہیں کچھ خیال آیا۔

"انگریزی پڑھیں۔ انگریزی۔ چھوڑیں یہ مدرسے ودرسے کا کلچر۔ اردو مدرسے... ہنہ۔" انہوں نے منہ پچکایا۔ "آگ لگائیں اسے۔ بس انگریزی پڑھیں۔ کمپیوٹر۔" شامل جی کو سوجھا۔ "کمپیوٹر سیکھیں۔ میں تو کہتا ہوں..." انہوں نے اپنی ہلکی سی لرزش زدہ آواز میں کہا۔ "ہندوستان میں جتنے کھاتے پیتے مسلمان ہیں... جگہ جگہ۔ قصبے قصبے۔ شہر شہر... مسلم انگلش اسکول بنائیں۔ بس لگا دیں اس کام میں اپنے آپ کو۔ یہی حل ہے اس مسئلے کا۔"

بنا کسی وضاحت کے شامل جی اپنی بات کہتے چلے جا رہے تھے۔ آخر اس سے فائدہ کیا ہو گا؟ کیا فسادات رک جائیں گے؟ ما کو انگریزی پڑھنے کا اور کمپیوٹر سیکھنے کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور نہ شامل جی کوئی تعلق بتا رہے تھے۔ آخر کیوں پڑھیں انگریزی؟ اس کے بدلے... اس کے بدلے ہتھیار کیوں نہ جمع کریں؟

مگر شامل جی ایک لمبی تقریر میں مصروف تھے۔ اور چھت کی طرف انگلی اٹھا کر تقریباً چھت سے لگے پنکھوں سے مخاطب تھے۔ آخر ما سے نہ رہا گیا۔ اس نے شامل جی کا بازو ہلا کر کہا: "لیکن کیا اس سے فسادات رک جائیں گے؟"

شامل جی اچانک رک گئے۔ شاید انہوں نے اپنی بے ربط تقریر پر خود غور کیا۔ بات تو

فسادات کی ہو رہی تھی۔

"فسادات... تو نہیں رکیں گے۔" شامل جی نے کاغذ کی طرح کوری آواز میں کہا: "لیکن..."

"لیکن کیا؟" ما نے بیتابی سے پوچھا۔

"لیکن..." شامل جی نے نہ جانے کس یقین سے کہا۔ "ہندوستان میں مسلمانوں کو آج... ایک نئے سرسید کی ضرورت ہے۔"

ما کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "سرسید کی؟" اس نے نہایت حیرت زدہ ہو کر یاد کیا کہ واقعی سرسید... سرسید نے کہا تھا کہ انگریزی پڑھو... انگریزی... انگریزی تعلیم... یہ بات کبھی اسکول میں پڑھی تھی اور اب کب کی بھول چکی تھی۔

"مگر اس وقت تو... اس وقت تو انگریز تھے یہاں شامل جی۔ اب تو شاید... ہندی پڑھنی چاہیے۔" ما نے بلا سوچے سمجھے کہا۔

"ارے نہیں۔" شامل جی جھنجھلائے۔ "جھوٹ بول رہے ہیں سب... کم بخت۔ یہ خود کوئی ہندی وندی نہیں پڑھ رہے۔ انگریزی پڑھ رہے ہیں سب۔ اور کمپیوٹر سیکھ رہے ہیں۔" پھر انہوں نے سکون سے کہا۔ "سب پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پچاس ساٹھ برس میں... رل گھل کر... ٹھیک ہو جائے گا۔"

ما کے ذہن میں کئی خیال اکٹھے آ رہے تھے۔ سرسید کے خیال نے اس کی منجمد یادداشت کو چونکا دیا تھا۔ اور دوسرا خیال اسے یہ آ رہا تھا... جس نے اسے تھوڑا سا محظوظ اور کافی حیران کیا تھا... کہ شامل جی بالکل مسلمان لگ رہے تھے۔ فلموں میں مسلمانوں کا کردار ادا کرتے کرتے بالکل مسلمان ہو گئے تھے؟

اور تیسرا خیال... چونکنے والا۔ آنکھوں میں پانی لے آنے والا خیال۔ تو شامل جی جانتے ہیں، خوب جانتے ہیں، کہ انقلاب وغیرہ نہیں آئے گا۔ یونہی، اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں اپنے آپ کو... اور سب بھائی... سب بھائی بھی جانتے ہیں کیا؟ کیوں اپنے فرقے کی اصلاح کرنے کے پیچھے لگے رہتے ہیں؟ جانتے ہیں کہ رہے گا تو یہی فرقہ۔ اس کی اصلاح ضروری ہے۔ انقلاب... انقلاب شاید نہیں آئے گا!

"اور دوسری بات یہ..." شامل جی ٹہلتے ٹہلتے تھم کر بلند آواز سے کہہ رہے تھے، "کہ کرم کبھی ضائع نہیں ہوتا۔" شامل جی کے اندر شاید اس گھڑی، جب وہ محتاط نہ تھے، ان کی نانی اور پرنانی اور دادی اور پردادی نے مل کر کہا تھا۔

ما بھونچک رہ گئی۔

پھر دل کے کسی کونے سے جھٹ اس کی آنکھ میں پانی آ گیا۔

"ہندو ہیں شامل جی؟" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اور ایک انجانی تعظیم سے خم ہو گیا۔

"رواداری سے کام لیں جیسے۔ بھہہہہہہ... رواداری..." دھیرے دھیرے شامل جی کچھ کہتے جا رہے تھے۔ جیسے اپنے آپ سے۔

ما نے سوچتے ہوئے کہا: "اب تو یہ بتا تصور بھی نکلا ہے کہ کھچڑی کی دیگ..."

"کھچڑی؟"

Scanned with CamScanner

ما شرمندہ ہو گئی۔ پھر اس نے کچھ ہنس کر کہا "میں... ایک اخبار میں مضمون تھا کہ ہم شاید کھچڑی کی دیگ نہیں ہیں..."

"پھر کیا ہیں ہم؟"

"سلاد کا پیالا ہیں" ما ہنسی۔ "یعنی سب کے ذائقے الگ الگ۔"

شامل جی کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ دیر تک ہنستے رہے شامل جی۔ ان کے گلے میں پھندا لگ گیا۔ انھوں نے ایک گلاس پانی پیا اور کہا:

"آلو کے پٹھے ہیں ہم اصل میں تو..." پھر انھوں نے کہا: "کھچڑی کی دیگ میں اوندھایا سلاد کا پیالا۔ جو کسی سے نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔"

ما خاموش ہو گئی۔ اسے پھر سرسید کا خیال آ رہا تھا۔ گھنی سفید داڑھی... اسکول کی کتابوں کے صفحوں سے نکل کر ان کی تصویر اس کی آنکھوں میں سما رہی تھی۔ اور یادیں... بھولی بھالی تر جمہ ہو سکتی تھی۔ انگریزی تعلیم۔ انگریزی تعلیم۔ مسلمانو! انگریزی تعلیم حاصل کرو... تحریک ذہب ہو گئی۔ مسلمانوں نے... کچھ مسلمانوں نے... پڑھا لکھا۔ اور پھر؟ ما کے دماغ میں ایک خیال چمکا۔ پھر انھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ پاکستان کا مطالبہ! ہندوستان کو تقسیم کرنے کا! ہندو اور مسلمانوں نے پڑھ لکھ کر، ایک دوسرے کی گلے میں بانہیں ڈال کر پیار کا گیت نہیں گایا۔ پڑھنے لکھنے کے بعد ایک دوسرے پر لعنت بھیجی۔ بتا دیا۔ یہ لخ لعنت ٹھیک تھی! ما کے ذہن میں سندھی لعنت کا طریقہ گھوما۔ اور ایک دوسرے پر تھوک کے الگ ہو گئی۔

سب ہی لوگ دن رات، ہر گھڑی، کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونے کی فکر میں گرفتار۔ سندھی، بنگالی۔ اور انھیں بالکل اندازہ نہیں (ما دل میں قہ قہہ کر کے ہنسی) کہ الگ ہو کر پھر وہ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہی رہ جاتے ہیں۔ جوں کے توں رہ جاتے ہیں حالات اس ہندوستان میں تو۔ کیونکہ یہ ایک جادو ہے (اس نے سوچا) جیسے برہمن کانوں میں بابھنوں نے بتوں میں مچھر مارتے ہوئے کھوجا۔

"چیزیں بدلتی ہیں" انھوں نے کہا ہو گا۔ اور پھر اکتا کر، جماہی لے کر اضافہ کیا ہو گا: "اور پھر جُوں کی تُوں بھی رہ جاتی ہیں۔"

کیوں نہیں؟

"کیونکہ... چیزیں اور کائنات کے مظاہر ہی تو بھگوان ہیں۔ اب بھگوان کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔ چاہے ایک سے دو ہو جائیں، دو سے ہزار، اور پھر بھی ایک کا ایک ہی رہے۔"

ظاہر ہے۔ اس جواز کا رد تو ناممکن تھا۔

شامل جی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

"کھانا نہیں کھاؤ گی؟" انھوں نے کہا۔ "کہ اور کوئی بات رہ گئی ہے؟"

ما نے حیرت سے انھیں دیکھا۔

"اور کوئی عالمی مسئلہ جسے ہم حل کر سکتے ہوں اس سمے؟"

ما کھسیانی ہو گئی۔ بری طرح شرمندہ۔ اپنے مچھر سے بھی کم حیثیت، پھنگے جیسا ہونے

کے انکشاف پر، اپنی بیہودہ بڑک بازیوں پر... شامل جی نے ان کے لیے کھانا بنوایا تھا اور وہ اسے کب سے ٹھنڈا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے منھ پر آئے "کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟" کے قابلِ رحم، لجلجے سوال کو دل میں واپس پھینک دیا۔

فسادات کی مُردہ رات ان کے اوپر سے گھسٹتی ہوئی گزر رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ کرتے رہیں گے۔

اس نے سوچا:

آدمی آدمی کو کب قتل کرتا ہے؟

غصّے میں؟ ہاں۔

لالچ میں؟ ہاں۔

خوف میں؟ ہاں۔

اور ویسے؟

اور ویسے... اس کی مرضی!

اور کب محبت کرتا ہے آدمی، آدمی سے؟

اس کے تھکے دماغ میں ایک رقص سا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی پہاڑی پر الاؤ جلا کر ڈھیر سے آدی واسی اس کے گرد ناچ رہے ہوں۔ اور اوپر گھنگھور سیاہ گھٹاؤں میں بجلی چمک رہی ہو، بادل گرج رہے ہوں۔

اس سوال پر جیسے پہاڑوں میں زور سے دھماکا ہوا ہو۔ دور تک تالیاں سی بجتی ہوئیں۔

"آدمی، آدمی سے محبت نہیں کرتا؟"

خدا نے سختی سے کہا ہو۔

غلط... ما نے سوچا۔ وہ اب کھانا کھانے جا رہی تھی۔ شامل جی کی بانہہ میں بانہہ ڈالے۔ وہ شامل جی سے محبت کر رہی تھی۔ اور دراں حالیکہ اس بات کا ٹھوس ثبوت، چھوا جانے والا، موجود نہ تھا۔ پرنتو یہ بات اس میز، اس کرسی، اس پلیٹ اور چاول دال جتنی حقیقی تھی۔

ما نے پلیٹ میں دال چاول ڈالے۔

اور آدمی میں سمجھ کب آتی ہے؟

کیا پیٹ میں روٹی پڑنے سے؟

ہاں، ایک طرح کی۔

کیا بھوکے رہنے سے؟

ہاں، ایک دوسری طرح کی۔

اور دونوں صورتوں میں...

ایک تیسری طرح کی سمجھ خبط ہو جاتی ہے۔

دیوتاؤں نے گرج چمک میں کوئی سریلا قہقہہ لگایا اور ناچتے رہے۔

"تم جیت نہیں سکتیں" انھوں نے کہا۔

"اور آدی واسی۔ یہ آدی واسی، جہاں تہاں بکھرے ہوئے، ہندوستان میں، اناج بیجتے، اور کاشت بھی کرتے۔ کسی نوبل سےویج۔ کسی شاندار نئی دیوتا کا جیون نہیں بتاتے تھے۔" کوسمبی نے کہا (اپنی کتاب میں) "ان کے قبیلوں کا سردار ہوتا تھا۔ پنچ ہوتے تھے۔ ہر پنچ سرداروں کے خلاف مشکل ہی سے جاتے ہوں گے۔ یہ شاید اپنے دیوتاؤں پر انسانی قربانیاں بھی کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے جنگیں کرتے تھے۔

"یہ ایسا سانچا ہے منش کے جیون کا، کئی کالوں سے گزرتا ہوا، جس کی ایک پرت بالکل دوسری ہی پرت جیسی ہے۔

"اور ان کا کچھ بھی سانجھا نہیں تھا۔ سب کے دیوی دیوتا الگ۔ اور بولیاں..."

ہاں بولیاں؟

"وہ..." کتاب نے قہقہہ لگایا۔ "چودہ کوس پر سب کی الگ الگ بولیاں تھیں۔ اور ہیں۔" ما بھی خوب ہنسی۔

اتحاد کی، ماشا اللہ سے، کسی قسم کی، کوئی گنجائش چھوڑی نہیں گئی... یہاں، یعنی کہ اس برصغیر میں۔

کھانے کے بعد شامل جی نے انہیں خود کافی بنا کر پلائی۔ ان کی جھک سپید بالوں والی، دبلی پتلی، پٹھان پتنی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھیں۔

"ہندوستان کی موجودہ، کثیرالتصادم صورتِ حال، اگر باریکی سے دیکھا جائے تو، قبل از تاریخ ہندوستان ہی کا ایک عکس ہے۔" کتاب نے کہا، "دھرتی کے اِس ٹکڑے پر جیون بتانے والے آدی واسیوں کی صورتِ حال کا۔"

"مارو سالوں کو!" ما نے جیسے کسی نشے میں کہا۔

"اب دو بجے کہاں جاؤ گے؟ یہیں سو جاؤ۔"

"نہیں، بچّے اکیلے ہیں شامل جی۔"

فسادات کی پُرخطر رات میں، شامل جی انہیں اپنی گاڑی میں خود ڈرائیو کر کے ان کے فلیٹ کی طرف لے چلے۔ ان کا ڈرائیور فسادوں سے گھرے کسی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ چار دن سے نہیں آیا تھا۔

راستے میں شامل جی ان سے باتیں کرتے رہے۔ پیار بھری باتیں۔

"تم لوگ ضرور کامیاب ہو گے۔ کوئی کچھ بھی کہے۔"

(ہندوستان میں کچھ لوگ ان سے کہتے: جمہوریت؟ پاکستان میں؟ کسی دوسرے مسلم ملک میں بھی آئی ہے جمہوریت؟)

"وہ لوگ بہت عظیم ہیں،" شامل جی کہہ رہے تھے، "جب میں کراچی میں ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کے مزدوروں میں کام کرتا تھا..."

(لوگ بتاتے، ہر پارٹی میٹنگ میں شامل جی اپنی بات اسی جملے سے شروع کرتے تھے۔ "جب میں ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری میں...")

"اور میں تو کہتا ہوں..." شامل جی نے کہا، "یہاں، ہندوستان میں، آئے یا نہ آئے... لیکن وہاں، پاکستان میں انقلاب ضرور آئے گا... وہ لوگ... دوسری طرح کے ہیں وہ لوگ... مجھے ان سے پوری امید ہے۔"

شامل جی نے اپنا بوڑھا، اشتمال اور یقین اور امید کی پوپلی مسکراہٹ سے روشن، چہرہ پچھلی سیٹ میں بیٹھی اپنی مہمانوں کی طرف موڑ کر کہا۔

انہیں فلیٹ پر چھوڑ کر، اندھیرے میں وہ اکیلے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

OOO

"تم نے کیوں اسے پتا دے دیا؟" ما نے تلملا کر کہا تھا۔ "سچے فساد ہو رہے ہیں۔ یہ شوسینا کا لڑکا..."

ما نے دھرماتما کو کیوں بمبئی کا پتہ دے دیا تھا؟ ما کو خود ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ بس دے دیا تھا۔ شاید اس کی کئی وجوہات ہوں۔ ایک تو لڑکے کی بےخوفی پر، بازار میں، بغیر تعارف اس سے بھڑ جانے پر، ما کا دل اس لڑکے کی طرف کھنچ گیا تھا۔ اس کی بدحالی اور قومی جوش کے تضاد نے ما کا دل کاٹ سا دیا تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی وجہ ہو سکتی تھی۔ خوف۔

ما خوف سے اپنے اندر سمٹ رہا تھا۔ وہ سوچتا: ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ کسی ہندو سے بات کرنا اس وقت ٹھیک نہیں۔

ما خوف سے پھیل رہی تھی۔ کہا جا سکتا ہے وہ خوف سے لڑ رہی تھی۔ وہ سوچتی: ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ اس وقت کسی ہندو سے فوراً بات کرنی چاہیے۔ اپنا آپ چھپا کر رکھنے سے اکیلا پن، کانپ رہا ہے۔

لیکن دھرماتما نے تو سچ مچ اسے فون کیا۔ بمبئی کے ایک اخبار میں اس نے ان کے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھ لی تھی۔ اس طرح وہ اس کی نظر میں معتبر بن گئے تھے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس نے ان کے فلیٹ پر آ گیا دھرماتما۔ دو تین بار فسادات کی لہر، عرب ساگر کی لہروں جیسی اس مہانگر سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی۔ بمبئی معمول پر آ گیا تھا۔ کوئی اپنا سر پیٹ پیٹ کر سوچ سکتا تھا۔ یا خدا! کیا یہی لوگ آپس میں لڑ رہے تھے؟ اگر انہیں ایک دوسرے سے اتنی نفرت ہے تو اب کیوں نہیں لڑ رہے؟

شاید دوسرے راؤنڈ کی تیاری کر رہے ہوں!

لیکن یہ ایسی چیزیں نہ تھیں جن کو کسی آخری فیصلہ کی جنگ کے بارے میں سوچا جا سکتا۔

rekhta
Scanned with CamScanner

"میڈم... آپ تو یہاں کی بس بھی نہیں۔ میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ اپنی چالی میں۔ دس از دی ریوولوشن۔"

دھرمانند جزوقتی طالب علم تھا۔ کسی شام کے کالج میں پڑھتا تھا۔ دن میں تو وہ ایک ریستوران میں اسسٹنٹ منیجر کا کام کرتا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا، گھر کے دھلے، گھر میں استری کیے سفید پتلون قمیص میں۔ اس کے ماڈرن حلیے سے، جلدی میں ماتھے پر ملا سیندور لگا نہیں کھاتا تھا۔

ما اور با اس کے ساتھ ایک "معاشی مہم" پر نکلے۔ دھرمانند نے اپنے دل میں انہیں غیرملکی جان کر مقامی مسلمانوں سے الگ کر لیا تھا۔ غیرملکیوں کے لیے تو اس کے دل میں بےحد جوش و خروش تھا۔ جیسا کہ اس پورے برصغیر میں ہوتا ہے۔

اس کی چالی دادر کے پاس تھی۔ جہاں وہ ٹاٹا کی صاف ستھری بس میں پہنچے۔

دھرمانند کی چالی، بمبئی کی مخصوص، کھولیوں پر مشتمل، پرپیچ راہداری تھی۔ دن کے دس بجے کھولیوں پر صرف عورتیں تھیں۔ کوئی بچہ، ہنکوڑے میں جھولتا ہوا، اپنی کھولی میں رویا۔

"یہ باتھ روم ہے۔ یہ ڈسٹ بن۔ ہم نے رکھوایا ہے۔"

دھرمانند اسے خوشی سے دکھا رہا تھا۔ "اور یہ کپڑے دھونے کی جگہ..."

"یہ سب تو... بہت اچھا کام ہے" ما کا دل ان کے لیے پگھل گیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ فاصلے اور لاعلمی میں ہر چیز کیسی نظر آتی ہے!

"کیا بمبئی میں ایسی بہت سی چالیاں ہیں؟" با نے پوچھا۔

"بمبئی نہیں۔ موم بائی" لڑکے نے سختی سے کہا۔

ما اور با حیران ہو گئے۔

"موم بائی۔ موم بائی... یہی اصلی نام ہے۔" لڑکے نے انہیں سمجھایا۔ "دس از مراٹھالینڈ۔ دس از مراٹھا سِٹی۔"

ما اور با نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی سمجھ میں خاک نہ آ رہا تھا۔ بمبئی ان کے ذہنوں میں۔ موم بائی نہیں ہو سکتی تھی۔ بمبئی تو... بمبئی تھی!

ایک دھچکے سے ما نے محسوس کیا، یہ لڑکے... تاریخ کے ایک حصّے کو .. کوئی سو ڈیڑھ سو برس کو .. معدوم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے دوران بمبئی موم بائی نہیں رہی تھی، کچھ اور بن گئی تھی... بمبئی بن گئی تھی۔

شاید آنے والے وقت کو تو کسی طرح روکا، یا بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن آدمی کی یہ کیسی آرزو ہے؟ شاید سب سے طاقت ور سب سے لاحاصل آرزو۔ ماضی کو مٹا دینے کی۔

"تم مسلمانوں سے... کیوں نفرت کرتے ہو؟" ما نے دھرمانند سے پوچھا۔ وہ ایک ریستوراں

میں چائے پی رہے تھے۔ دھرمانند انہیں اپنے شاکاہاری ریستوراں میں نہیں لے گیا تھا جہاں اسے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہونا پڑتا۔

"ناٹ ایٹ آل میڈم" دھرمانند نے مستعدی سے کہا۔ "لیکن ہم چاہتے ہیں وہ ہم میں گھل مل جائیں۔ دے شوڈ فیل مراٹھا... ہمیں ان کی پرستش پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر جیسا کہ شری بال ٹھاکرے نے کہا ہے... وہ ہمارے تہواروں میں شامل ہوں... ہم ان کے تہواروں میں شامل ہوں گے۔"

"مگر اس کا یہ طریقہ تو نہیں ہے" کہتے کہتے ما نے زبان روک لی۔ کیا کہنا کوئی اس بچّے سے؟ پھر اسے ایک دلچسپ سا خیال آیا۔

"تم جانتے ہو مسلمانوں کی پرستش کیا ہوتی ہے؟"

"یس میڈم... میرے کالج میں ہی پڑھتے ہیں مسلمان لڑکے۔"

"دوست ہیں تمہارے؟"

"نہیں..." اس نے جھجھک کر کہا۔ پھر پریشان ہو کر بولا، "وہ لوگ دوسری طرح کے ہیں۔ وہ ہم سے دوستی کرنا ہی نہیں چاہتے۔"

"تم کرنا چاہتے ہو؟"

دھرمانند حیران ہو گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ میز کو انگلیوں سے بجانے لگا۔

"تو... ان کی پرستش کے بارے میں تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے دیکھی ہے" دھرمانند نے فوراً کہا۔

"دیکھی ہے؟" ما نے حیرت سے کہا۔ اس کے ذہن میں "سمجھنے" کا خیال تھا۔ ایک لمحے میں اس پر جیسے کوئی انکشاف سا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی تو ہیں لوگ... بس دیکھتے ہیں!

دھرمانند کہہ رہا تھا:

"وہ کسی بلڈنگ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے ہیں، جو عرب دیش میں ہے۔ ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہیں۔ کانوں کو چھوتے ہیں۔ پھر آدھے جھک جاتے ہیں۔ پھر کھڑے ہوتے ہیں۔ کانوں کو چھوتے ہیں۔ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ماتھا ٹیکتے ہیں گراؤنڈ پر۔ لیکن ہماری طرح نہیں... ان کی بیک سائیڈ کافی اونچی ہو جاتی ہے" دھرمانند کچھ شرما کر، ہنس کر کہا۔

دادر کے ایک سستے، شاکاہاری ریستوراں میں بیٹھے، پلاسٹک کی میز پر اپنے سامنے چائے کی پیالیاں رکھے، ایک سناٹے میں آنکھیں پھاڑے، با اور ما نے ایک سترہ اٹھارہ سال کے مراٹھے سانولے لڑکے سے، جس کا نرخرہ بات کرنے سے اوپر نیچے ہو رہا تھا، اور جو اتنا کم عمر تھا، کہ اس کا دل زیادہ میلا، کینہ بھرا نہیں ہو سکتا تھا، یہ سنا کہ مسلمان اسے کیسے نظر آتے ہیں۔

دھرمانند تجسس سے پوچھ رہا تھا:

"کانوں کو کیوں چھوتے ہیں باربار میڈم؟"

rekhta

Scanned with CamScanner

با اور ما سناٹے سے نکلے۔ جیسے وہ صدیوں سے چپ بیٹھے تھے، جیسے ان کے منھ میں ریت بھر گئی تھی۔ اور بڑبڑا کر کچھ اٹیں بائیں کہا، "پتا نہیں،" وہ بڑبڑائے۔ اور پھر دھرمانند سے رخصت ہو کر، سرپٹ اپنے فلیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔

اس رات، سونے سے پہلے، بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے، ما نے کہا،

"نئی نسل مسلمانوں کی تہذیبی اقدار سے افسوس ناک حد تک لاعلم ہے۔"

با سونا چاہتا تھا۔

"روحانی اقدار کا کچھ مظاہرہ بھی نہیں ہو رہا ہے؟" اس نے مکھی سی اڑائی۔

"اور ان کی طرف سے ہو رہا ہے مظاہرہ؟" ما تلملائی۔ وہ کہنی کے کنارے تقریباً بیٹھ گئی۔ "یہ جو کرشن جی کے کھلے منھ میں بجلی سے گلوب گھماتے ہوئے جلوس نکالتے ہیں؟ بھئی کہا تھا کسی نے کہ کرشن کے دہن میں تو کُل کائنات ہے... تو یہ سمجھا ہے اس کا مطلب؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ..." با اونگھتے ہوئے بولا، "کہ روحانی اقدار کا مظاہرہ..." اس نے سوتے ہوئے کہا، "شاید ہو نہیں سکتا۔"

ما دیر تک جاگتی رہی۔ سُن سی لیٹی تھی، با کی کہی ہوئی بات پر بےبسی سے حیران۔ واقعی... اس نے اندھیرے میں سوچا... اسے اپنی استانی جی کا خیال آیا، جن کے لیے اس کی ماں کہتی تھیں، "خدا جنّت نصیب کرے۔" جنّت... جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور موتیوں کے محل ہیں...

ما سوچتی سوچتی سو گئی۔

صدی کے آخر میں، بعد کے آنے والے مفسّرین یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے تھے کہ جنّت دراصل خلا میں تنے ہوئے کھاد اور مٹّی کے کسی باغ کا نام نہیں تھا، اور نہ وہاں کھجور کے درخت تھے، بلکہ یہ روحانی مسرت اور طمانیت کا ایک حسین استعارہ تھا جو نیک انسان کی روح کو محسوس ہو سکتی تھی۔ شاید ان زیادہ خیال پرست مفسّرین کو شرمندگی ہوتی ہو کہ ان کے منزّہ مذہب سے خلا میں تنے ہوئے ایک باغ کا تصور منسوب کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تفسیریں اس گول، خلا میں چکراتی دھرتی پر جہاں تہاں بستے کروڑوں مسلمانوں تک پہنچ بھی نہ سکیں گی اور وہ ہمیشہ یونہی اپنی سیاہ آنکھوں سے ستاروں اور چاند سے جگمگاتے بےکراں خلاؤں کو تکتے اسی جنّت پر یقین کرتے رہیں گے جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور جہاں بال سے بھی باریک ایک پُل پر سے ایک بکرے کی پیٹھ پر بیٹھ کر گزرا جا سکتا ہے جس کی وہ ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقعے پر قربانی دیتے ہیں۔

طیّب بھائی دکھی اور اداس بیٹھے تھے۔ وہ بھیونڈی اور مالیگاؤں کا دورہ کر کے آئے تھے۔ حکومت یا کسی سرکاری ادارے نے ان کی ذرا مدد نہ کی تھی۔ حالانکہ کاغذی کارروائیوں میں

فرقہ واریت کی آگ بجھانے والی تنظیموں اور افراد کی مدد کی سرخیاں، منصوبے اور دعوے، اور سرکاری دفتروں میں اس کھاتے میں خرچ ہونے والی رقومات کی فائلوں کا انبار موجود تھا۔ طیّب بھائی اپنے ہی مراٹھا ہندو دوستوں کی مدد سے یہ دورہ کر سکے تھے جو ان علاقوں میں صلح صفائی اور حالات کو معمول پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"افسوس ناک صورت حال ہے اف تک..." طیّب بھائی نے گہرے دکھ سے کہا۔ "بےاعتباری تو اتنی ہے کہ کچھ پوچھیے نہیں۔ ایک گاؤں کے تمام مسلمان ایک مسجد میں اور سارے ہندو ایک مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔"

"آپ گئے تھے وہاں؟ مسجدوں اور مندروں میں؟"

"ہاں، ہم سب گئے تھے۔" پھر وہ کچھ یاد کر کے مسکرائے۔ "مسلمان مارے ڈر کے ساری رات نعرے بلند کرتے رہے۔"

"کیسے نعرے؟"

"نہیں، کچھ اور نہیں۔ نعرۂ تکبیر۔"

"اچھا۔"

"اور ہندوؤں نے کہا... مسجد سے بلند ہوتے نعروں سے ان میں ہراس پھیل رہا تھا۔ مارے ڈر کے انھوں نے بھی نعرے لگائے رات بھر۔"

شوسینا میونسپل الیکشن حال ہی میں جیتی تھی۔ بائیس تئیس برس کے لڑکوں کی فوج جب مسلمانوں، دلتوں، گجراتیوں سے یہ لڑتی ہوئی تب، زمانۂ امن میں، "صفائی" کا کام کروائی۔ انھوں نے کئی چالیوں میں لیٹرینیں بنوائیں، اور کپڑے دھونے کی جگہیں۔ گلیوں میں ڈسٹ بن رکھوا دیے تھے انھوں نے۔ چالیوں میں اپنے ممبروں کی کمیٹیاں بنا دی تھیں۔ ایک ایک چالی میں کئی کئی، بندرہ بیک کمیٹیاں بن گئی تھیں۔

وہ کچھ دن صفائی وغیرہ کرتے رہے۔ پھر بور ہو کر چھوڑچھاڑ دیا۔ بمبئی میں ان کی تنظیم اتنی وسیع نہ تھی کہ وہ نہ کام شہر بھر کی بمبئی پر کر سکتے۔ ہاں لوگ، سارے مراٹھے، تقریباً سارے ہی، ان کے ساتھ تھے۔ اور ووٹ بینک انھی کا تھا۔

یہ تحریک جو غریب مراٹھوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی، ایک سنہرے خواب میں لپٹی تھی۔ مراٹھا قومیت کی تجدید کا خواب۔ جس کی طلائی دھند میں، سواجی مرہٹہ ایک سفید گھوڑے پر سوار، دو پھل والی تلوار بلند کیے، دور کہیں بادلوں میں پرچم لہرا رہا تھا۔ ان کے دلوں میں کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ ناانصافیاں ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ باہر سے آنے والے، غیرہندو، غیرمراٹھے، امیر ہو گئے تھے، جو امیر نہ تھے، کم از کم کھاتے پیتے تھے۔ ان گنت فیکٹریوں اور کارخانوں... کہ بیروزگار مراٹھے یہاں ملازمت نہیں پا سکیں گے؟ یہ سب کچھ ان کا نہیں ہو جانے گا؟ جو ان کی اپنی سرزمین پر بنا ہے؟ اور انھیں کوئی یہ یاد دلانے والا نہیں تھا کہ یہ بھرپور، صنعتوں سے دھڑکتا ہوا، مہانگر بمبئی، سو ڈیڑھ سو برس

Scanned with CamScanner

میں، روزگار کی تلاش میں باہر سے آنے والوں ہی نے بنایا تھا۔ معیشت کی اندھی اور بہری قوتوں نے، جو افسوس نہ مراٹھا تھیں اور نہ ہندو۔

شوسینا صوبائی انتخابات بھی جیت گئی تھی۔ لیکن کسی جادو کی چھڑی کو جنبش دے کر لاکھوں مراٹھا نوجوانوں کو روزگار تو نہیں دے سکتی تھی۔ پھر اب شوسینا کیا کرے؟ کیا تبدیلی لائے؟ آخر لیڈروں کی سمجھ میں آیا کہ بمبئی کی مراٹھیت بحال کرنے کے لیے بمبئی کو موم بائی کہنا چاہیے، جو کہ اس کا قدیم نام ہے۔ انھوں نے مہاراشٹر پارلیمنٹ میں یہ قانون بھی منظور کرا لیا۔ کچھ دنوں تک مراٹھا نوجوان بمبئی کے گلی کوچوں میں جوش بھرے نعرے لگاتے گھومے:

"بمبئی نہیں، موم بائی"

راجیو گاندھی جب بمبئی آئے تو پرچموں میں تحریر کیا گیا:

"ہم آپ کا خیرمقدم کرتے ہیں، بمبئی میں نہیں، موم بائی میں۔"

لیکن کچھ دن بعد، حدت پھر جوں کی توں ہو گئی۔ جو لوگ، اندرون مراٹھالینڈ، بمبئی کو موم بائی کہتے تھے وہ موم بائی ہی کہتے رہے۔ اور جو بمبئی کہتے تھے وہ بمبئی ہی کہتے رہے۔

آخر حکومت نے قانون کو سختی سے رائج کرنے کے لیے محکمۂ ڈاک کو استعمال کرنے کی ٹھانی۔ لہٰذا یہ نوٹیفکیشن نکالا گیا کہ آئندہ صرف وہی ڈاک پہنچائی جائے گی جس پر موم بائی لکھا ہو، بمبئی نہ لکھا ہو۔

اس حکم سے بمبئی کا ڈاک کا نظام بری طرح درہم برہم ہو گیا۔ ایشیا کا یہ گرانڈیل تجارتی اور صنعتی مرکز ہر روز ہزاروں کی تعداد میں بیرون ملک سے خطوط اور پارسل اور تار وصول کرتا ہے۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی دو دن میں یہ حکم واپس لے لیا گیا۔ اس کی جگہ یہ نسبتاً نرم حکم نکالا گیا کہ خیر انگریزی میں بمبئی چلنے دیا جائے، لیکن ہندی میں موم بائی ہی قابل قبول سمجھا جائے گا۔

لیکن یہ قانون نافذ نہ ہو سکا۔ مہاراشٹر کی حکومت کسی دوسرے صوبے پر اپنا قانون نافذ کرنے کی مجاز نہ تھی۔ وہ کسی دوسرے صوبے، مثلاً اتر پردیش یا راجستھان میں رہنے والے کسی شہری کو بمبئی کو موم بائی کہنے یا لکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اور دوسرے کسی راشٹر نے، مہاراشٹر حکومت کے اس قانون میں ذرہ برابر دلچسپی یا ہمدردی کا چنداں اظہار نہیں کیا۔

("بیشتر" غالباً انھوں نے کہا۔)

بال ٹھاکرے کی تحریک اور فسادات کا کل حاصل جمع ضرب صرف یہی نکل سکا۔

مگر اس تحریک میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ سنہرے خواب کے سنگ اصلاحی امنگ، جیسے نوجوان مراٹھوں نے حقیقت کا روپ دینے کی جی جان سے کوشش کی تھی۔ انھوں نے جات پات کی سخت درجہ بندی ختم کرنے کی کوشش کی اور امبیڈکر کو اپنا ہیرو مانا اور پارٹی کے دفاتر میں ان کی تصویریں آویزاں کر دیں۔ امبیڈکر ... کانگریس کے بنیادی کارکن، ہندوستان کا

آئین تحریر کرنے والے مراٹھا اچھوت...

شوسینا کے جوانوں نے چھوت چھات کی تقسیم ختم کرنے کی کوشش کی۔ سورن جاتی کے ہندو مراٹھوں نے ہاتھ میں جھاڑو اٹھائی اور گلی گلی خود جھاڑو دی۔ لیکن پوری جان لڑا کر بھی وہ خود کو لیٹرین صاف کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ فضلہ اٹھانے کا کام انہیں بھنگیوں ہی کو سونپنا پڑا جنھیں ہندوستان کے بڑے شہروں میں اب سرکاری طور پر "ہری جن" کہا جاتا ہے۔ جانے کس رومانی لہر میں، گاندھی جی نے انہیں یہ نام دیا تھا۔

امبیڈکر ہری جن نہیں رہے تھے۔ ہندوستان کے آئین میں اپنے قلم سے، ایک کمرے کی تنہائی میں، معمولی میز کرسی پر بیٹھ کر یہ لکھ کر: "اور اس دیش میں اب نہیں ہو گی کوئی چھوت چھات شودروں کی طرف۔" امبیڈکر نے ہندومت چھوڑ دی تھی۔ وہ بدھسٹ ہو گئے تھے۔ جیسے ان کے دل سے کوئی آہ نکلی تھی آدمی کی نیک خواہشوں کی اٹل ناکامی پر۔ جیسے اس کا لاشعور جانتا ہے۔

شوسینا نے شودروں کو مراٹھا قوم میں باعزت جگہ دینے کی پوری کوشش کی تھی (جیسی سواجی مرہٹہ کے زمانے میں ہوئی)۔ مراٹھوں میں سوراج سے قبل کے زمانے میں بھی سواجی مرہٹے کی یہ تحریک بہت مقبول ہوئی تھی۔ لیکن اس کا ایک عجیب و غریب، ناقابلِ وضاحت شاخسانہ، اس تحریک کے فوراً بعد ہزاروں مراٹھا شودروں کا ہندومت چھوڑ کر بدھ مت اختیار کر لینا بھی تھا۔ ہندومت میں باعزت مقام دینے کی کوشش پر انھوں نے ہندومت چھوڑ دیا۔

"مگر یہ تو حیرت انگیز بات ہے۔" ما نے سنجری بازار کے پاس مسٹر گوینکر سے کہا تھا۔ "بھکتی تحریک مہاراشٹر سے شروع ہوئی! میں نے زندگی بھر سمجھا کہ وہ تو کبیرداس سے..."

"ہوئی تھی... مہاراشٹر سے۔ مگر یورپ کے بھتیے مانیں بھی تو! نہیں مانتے۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کرونولوجی کو تو ظاہر ہے، جھٹلا نہیں سکتے۔"

"تب پھر؟"

"بس یہی موقف ہے کہ مہاراشٹر میں چلی ہو گی بھکتی تحریک۔ لیکن ہندی بیلٹ والی تحریک کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بھارتی اپنی الگ چلی تھی۔ اپنی ہی وجوہات سے۔ باضابطہ کتابیں ہیں اس موضوع پر۔" مسٹر گوینکر نے کھکھوڑ کر کتابیں اس کے سامنے ڈال دیں۔ ایک کتاب کھول کر صفحے پر پنسل سے سرخ نشان لگایا۔ ما نے شری ٹکڑے پر نظر ڈالی۔

"اب گو کہ یہ کہا جاتا ہے کہ مہاراشٹر میں... مگر چونکہ... چنانچہ... گویا کہ... حالانکہ... بس تو ثابت ہوا... بھارتی اپنی الگ تحریک تھی۔ جس کا بھی پیغام تھا... محبت... لیکن بالکل الگ تحریک... اس کا کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا؟"

ما قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ پیغام محبت پر شدید اختلافات! ما نے سوچا۔

Scanned with CamScanner

ooo

بمبئی میں کہاں کہاں سے خلقت امڈی آتی ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے! اور وہ سب ایک بار شاید جُوہُو کے ساحل پر بھی آتے ہوں۔

ریت پر بچے رنگیں بڑی بڑی گیندوں سے کھیل رہے تھے۔ نرم ریت میں دھنسی رنگ برنگی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ ساحل پر تیرنے والے ٹائر پڑے تھے۔ تفریح کے لیے آئے لڑکے اور لڑکیاں ٹائروں کو لڑھکاتے لہروں کی طرف دوڑ جاتے اور ان پر بیٹھ کر لہروں پر ڈولنے لگتے۔ لہروں کو دیکھ کر ننھی ککلی چڑیا کی طرح چہچہانے لگی تھی۔

بادلوں بھرے آسماں تلے بس سے اتر کر، نرم ریت پر بیٹھنے کا کوئی مناسب ٹھکانا بناتے بناتے ما کا پورا کنبہ تتربتر ہو چکا تھا۔

رانوں سے اونچی اسکرٹیں پہنے دو بمبیاً لڑکیوں کو بھیل پوری کے خوانچے کی طرف جاتے دیکھ کر با، بچوں کے لیے بھیل پوری لانے کا اعلان کر کے، کسی جواب کا انتظار کیے بغیر، دور، بہت دور جا چکا تھا۔ اب وہ پام کے پیڑوں کے مورپنکھوں جیسی ہری، سلوٹ دار چادر پر ایک چھوٹا سا نقطہ تھا۔

کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی، نازک سی پھول گاڑی، جس میں دو خوبصورت ٹٹو جُتے ہوئے تھے، اسے دیکھ کر بڑکی نے خوشی سے چیخ ماری تھی۔

"پھولوں کی گاڑی، ما! وہ... وہ... وہ دیکھو... نیتو سنگھ اسی میں تو بیٹھی تھی، فلاں فلم میں... آپ نے نہیں دیکھی؟ کومل کپور کے ساتھ؟ جب وہ گانا گایا تھا انھوں نے؟"

بندریا کی طرح چیز چیز کرتی، اشتیاق سے بیتاب، کومل کپور اور نیتو سنگھ کا گانا گاتی بڑکی پھول گاڑی میں سواری لینے دوڑ پڑی تھی۔

ریت پر رینگ رینگ کر چیکو نیکر میں پیشاب کر کے رویا تھا اور پھر دونوں مٹھیاں بھر بھر کے پیشاب میں بھری ریت کھا چکا تھا۔

اور ککلی...

ما نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ ککلی کہیں نہیں تھی۔

ما کے سینے سے ہوائی سی نکلی۔

"ککلی کہاں... کہاں گئی ککلی؟"

وہ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی، چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور ککلی اسے کہیں نہیں دکھ رہی تھی۔

تب ہی دور... بہت دور لہروں کے سپید جھک جھاگ پر ککلی کا لال اور نیلا ربن، شفّاف نیلی ہوا میں لہراتا دکھائی پڑا۔ ککلی کا ربن!

ریت کھاتے چیکو کو ریت پر پھینک کر، کھانے کے سامان اور باسکٹ گرا کر، دوپٹا جھٹک کر، ہوا میں اڑا کر، ما بےتحاشا لہراتے ربن کی سمت بھاگی۔ دونوں بازو پرندوں کی طرح

پیچھے کیے ما پوری طاقت سے دوڑ رہی تھی، ہوا کے زنّاٹے کو چیرتی... بنا کسی سے پوچھے ککلی دوڑ گئی تھی اور کنارے پر پڑے تیرنے والے ٹائروں میں سے کسی ایک کو دوڑاتی لہروں تک جا پہنچی تھی۔ دوسروں کی دیکھادیکھی، اپنے سے بہت بڑی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی نقل میں، ٹائر پر بیٹھ کر لہروں میں اتر گئی تھی۔

دو تین سانسوں میں ما پانی کے اندر تھی۔ شڑپ شڑاپ۔ ما نے پانی میں دوڑ لگائی۔

پہلے گھٹنوں تک، پھر کمر تک، پھر اس کے سینے تک آیا پانی۔ جیسے کئی ہزار ٹن ریت کی بوریاں۔ پانی اتنا بھاری ہوتا ہے؟ یہ تو ما کو خبر ہی نہ تھی۔ اس کے کپڑے شرابور ہو کر کئی ٹن وزنی ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں اور منھ میں نمکیلا پانی چھپاک چھپاک پڑ رہا تھا۔

"کک... لی...؟" اس نے پھیپڑوں میں ساری ہوا بھر کر آواز لگائی۔ مگر ہوا نے اس کی آواز کو بکھیر دیا۔ ایک لہر نے اس کے منھ پر زوردار تھپیڑا مارا۔ ما کے گھٹنے مڑ گئے۔

ایک بانہہ کے فاصلے پر ککلی کا ٹائر ہچکولے لے رہا تھا۔ منوں وزنی پانی کو چیر کر ما نے دونوں بانہیں اٹھائیں کہ ککلی کو جھپٹ لیں۔

پانی کے شور کے اوپر، ہوا میں، اوپر ہی اوپر اٹھتی کئی آوازوں نے اسے روکا۔

"نہیں بائی... نہیں... بچّی کو ٹائر سے اتارو نہیں۔"

ما نے دونوں بانہیں ٹائر کے حلقے میں ڈال دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بیسیوں لوگ اس کے پیچھے پیچھے پانی میں دوڑتے، تیرتے چلے آ رہے تھے۔ ما کو بدحواسی سے چیختا اور دوڑتا دیکھ کر آس پاس کھڑے لوگ، تفریح کے لیے آئے ہوئے سیاح اور خوانچے والے اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے تھے۔ کئی بانہوں نے ٹائر کو سہارا دے دیا۔ آہستہ آہستہ ٹائر کو ٹھیلتے وہ اسے کنارے کی طرف لا رہے تھے۔

اتنے گہرے پانی میں ما ککلی کو ٹائر سے اتار لیتی تب تو شاید وہ دونوں توازن نہ رکھ پاتیں۔

ککلی بسورنا بھول کر، چھپ چھپ پانی میں ٹانگیں چلا رہی تھی۔ چڑیا کی جیسی چہچہا رہی تھی، ٹائر پر جمی۔ کسی جل بالکا سی... اس کی شیدپائی، اس کی ہیڈماسٹرپانی... کتنے ہی سانولے، چھریرے بدن جس کی جل گاڑی کھینچ رہے تھے۔ ان کے نیلے پیلے لال لنگوٹ اور جانگیے، سرمئی لہروں میں ابھر اور ڈوب رہے تھے۔

نمکیلے پانی میں بھیگی، ننگے بدنوں کے اس ریلے میں پھسلتی آ رہی تھی ما۔ کچھ خود چلتی اور کچھ دھکیلی جاتی ہوئی۔ آوازوں کے شور میں۔ سمندر کی اور ہنسی کی ملی جلی آوازوں میں، ما کے ذہن میں آہستہ آہستہ یہ بات آئی، جیسے ہولے ہولے پانی کی تہہ میں ریت بیٹھتی ہو۔

ککلی نے جو اب تک اسے کبھی نہیں ستایا تھا، کبھی کسی پریشانی میں نہ ڈالا تھا، تو اس لیے۔ ککلی نے ابھی تک سمندر دیکھا ہی نہ تھا! اور اب...

ooo

"اب میری باری ہے؟"
ما نے کہا۔

ککلی اور چیکو اور چولھے پر چڑھی ہانڈی کو بڑکی کے حوالے کر کے آج وہ سمندر کے کنارے خود گھومنے آئی تھی۔ بڑکی نے رات اس کے منھ پر کریم ملی تھی۔ صبح کو چہرہ نرم اور تازہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا تھا، اور وہ اسے ٹھیک نظر آیا تھا۔ فکروں کا بوجھ اتار کر، فکروں کی ایک پوٹلی باندھ کر، جیسے گھر پر چھوڑ کر، ما نے اپنے حصّے کا ایک دن وصول کیا تھا۔

ساری دنیا، اور تقریباً اپنے‌آپ، سے چھپا کر اس نے اپنے لیے ایک شوخ بھڑک دار ڈریس خریدا تھا، جو اس نے شرم کے مارے اپنے بیگ میں چھپا رکھا تھا۔

با پوری دلجمعی سے اسے جوہو لے چلا۔ جوہو پر، نہانے کی زنانہ کیبن میں جا کر ما نے کپڑے بدلے۔ باہر آئی تو با اس کے بھڑک دار کپڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کپڑوں کی کیبن میں وہ جوتے، ہینڈبیگ، سب چھوڑ کر آئی تھی۔ بالکل ہلکی پھلکی ہو کر۔

با نے اور ما نے ساحل پر مونگ پھلیاں کھائیں۔ بانہہ میں بانہہ ڈال کر فوراً اترنے والی تصویر کھنچائی۔

تصویر میں با اور ما نے اپنے آپ کو دیکھا۔ با کے چہرے پر شرمندہ سی بزدلی کا تاثر۔ اور ما کے بھڑک دار کپڑوں کو بالکل مائنس کرتا ہوا اس کا چہرہ، جس پر نامرادی کی پھٹکار پڑ رہی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر دونوں شرمندہ ہو گئے۔ با نے تصویر بٹوے میں ڈال لی۔

ما پانی میں چلنے لگی۔
شپ شپ، شڑاپ شڑاپ۔
اس نے مڑ کر با کی طرف دیکھا۔
"آؤ..."
اس نے کہا۔
"کپڑے بھیگ جائیں گے۔"
"بھیگ جائیں؟"
"بٹوا ... بٹوا بھی تو بھیگ جائے گا۔ جوتے کہاں رکھوں؟"
"یہیں کنارے پر چھوڑ دو سب کچھ۔"

با نے پتلون کے پائنچے چڑھائے، جوتے ہاتھ میں تھامے، اور ما کے ساتھ ساتھ آنے لگا۔ ما کو با کی حالت پر افسوس ہوا۔ اس کے پاس بہت بوجھ تھا، اور وہ اپنا بوجھ کسی چھوٹے سے خانے میں تالا لگا کر کنارے پر چھوڑ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ما پانی میں دوڑ لگانے لگی۔

وہ ہاتھ لہرا کر گانے لگی۔ اس نے اسی پل ایک گانا جوڑا تھا۔

"سمندر کی طرف آؤ
تو کچھ ہاتھوں میں مت لانا
سمندر تم کو
کچھ نہ کچھ دے گا
نہیں تو
کچھ نہیں دے گا"

یہ آخری حقارت بھری دھمکی ما کی طرف دیکھ کر۔

"ممبئی میں ملو گی مجھ سے؟"
"جی ہاں ضرور۔"
"تھوڑا گھومیں گے۔ ساتھ [illegible] گے۔ جوہو چلیں گے۔"
"اور... اب تم سوگی؟"

ما سو نہیں رہی تھی۔ ما تو صرف آنکھیں موندے دیوار کی طرف منھ کیے لیٹی تھی۔ ما سے ملنے آنے والی منحنی لڑکی سے با جو باتیں کر رہا تھا ما سب سن رہی تھی۔

"ما؟ اس کا کیا ہے۔ یہ تو مجھے اپنے پلو سے باندھے رکھنا چاہتی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

ما نے با کو غور سے دیکھا۔ کیا وہ اسے اپنے پلو سے باندھے رکھنا چاہتی ہے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ پھر پانی اچھالتے ہوئے محسوس کیا کہ بالکل! وہ ایسا ہی چاہتی ہے۔
کیوں؟

پانی اب اس کی کمر کمر تک آ گیا تھا۔ لہریں زور پکڑ رہی تھیں۔ وہ جی جان سے پانی کو اپنے بدن سے لپ لپ ٹکراتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ ایک بڑی لہر کو اس نے اپنے پیٹ سے جھپاک سے ٹکراتا محسوس کیا۔ اس کے پیر پھسل گئے۔ بانہیں بڑھا کر اس نے با کو تھاما۔

نظر اٹھی تو با کی نگاہوں میں اسے ایک غیرمتوقع حسرت نظر آئی۔ ما نے نظریں جھکا لیں۔

با جوہو آنا چاہتا تھا۔ اس کے بغیر۔ وہ زندگی کا لطف لینا چاہتا تھا۔ اگر ما کے بدلے وہ اس انجانی لڑکی کے ساتھ آتا تو شاید اپنے جوتے اور بٹوا اسنان گھر کی کیبنٹ میں خود بند کر

Scanned with CamScanner

کے آتا۔ وہ ما کی نگاہوں سے دور، بےفکری سے لہروں سے کھیلتا۔ آج جو اپنے بوجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔ با کا سب سے بڑا بوجھ تو وہ خود ہے۔ خود ما۔ ما با کے شعور پر ایک بھاری بوجھ ہے۔۔۔ کیوں؟

اس نے با کی طرف مڑ کر دیکھا۔ فولاد سے مضبوط، مگر شیشے سے بھی شفاف، کسی انسانی آنسو کی دیوار کے پیچھے کھڑا تھا با۔ یوں ہی کھڑے تھے وہ دونوں۔۔۔ شفاف شیشے کے آرپار ایک دوسرے کو تکتے، مگر کبھی پار نہ کرتے، نہ کر سکتے ہوئے۔۔۔

ایک بڑی لہر آئی۔ ما کو اپنی بانہوں اور بالوں سے ان گنت ننھی منی مچھلیاں پھسلتی محسوس ہوئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن سے با کا خیال محو ہو گیا۔ ایک ننھے سے پل میں اسے گوداوری کا خیال آیا اور اس کے تصور نے مرالھی کو، لمبی لاٹھی تھامے، سرخ پہاڑ پر چڑھتے دیکھا۔ لمحے بھر کو اس نے آشا کو تاریک کوٹھری کے دروازے سے سر ٹکائے، ستار جیسی ہنسی ہنستے سنا، جس کے عقب میں زرد روشنی میں دیوار پر گیرو سے بنے دیوی دیوتاؤں کے نقش چمک رہے تھے۔ سمندر کی اونچی نمکیلی لہر میں بہتا ایک سوکھا سا پودا اپنے سینے سے جدا کرتے ہوئے اس نے کچھ اور اہم باتوں کے بارے میں سوچا جن کا سمبندھ موت اور زیست سے تھا۔ اسے خیال آیا کہ کس طرح بڑکی اور ککلی اور جیکو کی پیدائش کے درد جدا جدا تھے۔ کوئی سا والا پیٹ میں الٹ گیا تھا اور خون کا دوران بڑھ جانے کی وجہ سے کوئی سا پیدائش کے وقت سے دو ہفتے پہلے رحم کا پانی توڑ کر پیدا کیا گیا تھا۔

لہروں میں شپ شپاتی ما کافی دور تک گئی۔ اکیلی۔

○○○○○

منتخب اردو کہانیوں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل تین مجموعے

انتخاب اور تعارف

محمّد عمر میمن

The Tale of the Old Fisherman
Contemporary Urdu Short Stories
Three Continents Press
Washington DC
1991

The Colour of Nothingness
Modern Urdu Short Stories
Penguin Books (India) Ltd.
New Delhi
1991

Domains of Fear and Desire
Urdu Short Stories from the Indian Subcontinent
TSAR Publications
Toronto
Expected publication date: Spring 1992

Scanned with CamScanner

یادنامہ

صغیر ملال کی بےوقت موت نے اس سے محبّت کا رشتہ رکھنے والوں کو ایک دوہرے صدمے سے دوچار کر دیا ہے۔ زندگی سے بھرپور، خوش مزاج اور دردمند رفیق کے جدا ہو جانے کے دکھ کے علاوہ یہ ان تخلیقی امکانات کے خاتمے کا صدمہ بھی ہے جنھیں صغیر ملال کے قریبی دوست اور پڑھنے والے وجود میں آتا دیکھ رہے تھے اور جو اب اس کے خاکی وجود کے ساتھ مٹی میں مل گئے ہیں۔

موت کی سادہ اور سفّاک حقیقت کے مقابل انسان کی بےبسی اور کم حیثیتی صغیر ملال کے لیے اضطراب کا ایک مستقل محرک تھی۔ زندگی کی ناپائیداری کا یہ شدید احساس ہی شاید اس کے زندگی سے اور لوگوں سے بےپناہ لگاؤ کا سبب تھا۔ شاید اسی باعث ایک حساس انسان اور ادیب کے طور پر اسے بےبضاعت اور حقیر سمجھے جانے والے چھوٹے لوگوں سے ہمیشہ ہم دردی رہی اور انسانی ذہن کے بڑے سوالوں سے متواتر سروکار رہا۔ اس نے صاف دل، کھلے ذہن اور زندگی سے بےحد پیار کرنے والے شخص کی سے بےریا تجسّس کے ساتھ دنیا کے وسیع تجربوں کا سامنا کیا اور بھرپور، گو مختصر، زندگی گزاری۔ اس کی محبوب شخصیت کی یہی خوبیاں اس کے ادبی کام میں بھی ظاہر ہوتی ہیں جو وسیع، عمیق اور پُرلطف مطالعے، سیکھنے کی بےپایاں لگن اور فنّی تکمیل کی مسلسل جستجو سے عبارت ہیں۔ افسوس کہ یہ کام نامکمّل رہ گیا۔

صغیر ملال کے ان ذہنی میلانات اور ان کی عمدہ فنّی پیشکش کی جھلکیاں آپ کو اس کی ان چھ منتخب کہانیوں میں نظر آئیں گی جو اگرچہ پہلے شائع ہو چکی ہیں لیکن اس کے مزاج کی درویشی کے باعث پڑھنے والوں کے بڑے حلقے تک رسائی نہ پا سکیں۔ ہیئت کا ناقدانہ شعور، موضوع سے گہری تخلیقی دلچسپی اور پُرخلوص کوشش سے حاصل کی جانے والی کامیاب نثر اس کی تحریروں کی وہ نمایاں خوبیاں ہیں جو آج کل کمیاب ہیں۔

صغیر ملال نے ۱۵ فروری ۱۹۵۱ کو راولپنڈی کے قریب ایک گاؤں میں جنم لیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۹۲ کو دنیا کے اس بھرے میلے سے قبل از وقت رخصت ہوا۔ اس کی شائع شدہ کتابوں میں نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "اختلاف" (۱۹۸۱)، کہانیوں کے دو مجموعے "انگلیوں پر گنتی کا زمانہ" (۱۹۸۳) اور "بےکار آمد" (۱۹۸۹)، دو ناول "آفرینش" (۱۹۸۵) اور "نابود" (۱۹۹۰)، اور دنیا کی منتخب کہانیوں کے ترجمے اور تعارف پر مشتمل "بیسویں صدی کے شاہکار افسانے" (۱۹۹۱) شامل ہیں۔

موت کے بعد صغیر ملال کے کاغذوں میں آلڈس ہکسلے کے ایک اقتباس کا ترجمہ دستیاب ہوا جسے یادگار کے طور پر یہاں درج کیا جا رہا ہے:

OOO

وہ بہت دیر تک لائبریری میں بیٹھا رہا۔ کیا ہو چکا تھا؟ کیا ہونے والا تھا؟ اسے اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل رہا تھا۔ اگر اس کے خیالوں کا بھیانک ہی سچّا ثابت ہوا تو۔۔۔ تو موت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آمڈ آئے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اسے زندگی

انتخاب

صغیر ملال

rekhta

Scanned with CamScanner

سے شدید محبت تھی۔ اس حیران کی دنیا میں کتنی ایسی جگہیں تھیں جہاں وہ اب تک نہیں جا سکا تھا۔ کتنے دل چسپ اور عجیب و غریب لوگ تھے جن سے آج تک اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کیسی کیسی خوب صورت عورتیں تھیں جنھیں ابھی اس نے نہیں دیکھا تھا۔

بیلوں کی جوڑیاں، اپنی آنکھوں کے ساتھ، ویران راستوں پر اپنا بوجھ یوں ہی ڈھوتی پھریں گی۔ چنار کے درخت آسمان کی طرف رخ کیے یوں ہی ستونوں کی طرح بلند ہوتے رہیں گے۔ سب کچھ یوں ہی ہوتا رہے گا، لیکن وہ یہ سب کچھ نہیں دیکھ پائے گا۔ اور انوکھے ذائقوں والی شرابیں اور حضرت عیسیٰ کے آنسو اور کم طرف ساتھیوں کی بیوفائیاں ۔۔ دوسرے لوگ انھیں محسوس کریں گے۔ اور وہ نہیں ہو گا۔ گردآلود ادب سونگھتے ہوئے، انوکھے سرورق دیکھتے ہوئے، گمنام ادیبوں کو دریافت کرتے ہوئے، دوسرے لوگ لائبریریوں میں کتابوں کی قطاروں کے درمیان چلیں گے۔۔۔ جب کہ وہ زمین اوڑھ کر سو چکا ہو گا۔ کیوں؟ کیوں؟ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کائنات میں انصاف موجود ہے۔ ماضی میں وہ کھلنڈرا اور لاپروا رہا تھا، اور اب تقدیر اسے اپنا کھلنڈرا پن دکھا رہی تھی، اس سے لاپرواہی برت رہی تھی۔ یہ عمل کا ردعمل تھا۔ اور شاید، خدا وجود رکھتا تھا۔

000

صغیر ملال

آثار

اُس پر نظر پڑتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے سڑک کے کنارے ابھرے ہوئے کسی پتھر سے اسے ٹھوکر لگی ہو۔ کسی نادیدہ چیز سے لگنے والی وہ ٹھوکر عام ٹھوکروں سے اس طرح مختلف تھی کہ اگر کوئی اسے دیکھ رہا ہوتا تو قسم کھا کر کہتا کہ اس کی پیشانی کسی جُھکی ہوئی ٹہنی سے ٹکرائی تھی یا ہوا کے دوش پر لہراتا ہوا مکڑی کے جالے کا کوئی تار اس کے ہونٹوں سے لپٹتا چلا گیا تھا یا کوئی کیڑا پتنگا پلک جھپکنے سے پہلے اس کی آنکھ کے مرکزی نقطے سے ٹکرا گیا تھا، اس لیے کہ وہ بجائے جُھکنے کے پیچھے کی طرف جُھول گیا تھا اور سُپر مارکیٹ کے برآمدے میں سجے ہوئے پوسٹروں اور پی آپس کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا تھا جیسے اس نے "کٹی" کی آواز سن لی ہو اور اب کائنات کی تخلیق کا منظر دیکھ رہا ہو۔

وہ جادوگری کی حد تک خوب صورت تھی۔ اسے یوروپ کے تاریک زمانوں کے عیسائی پادریوں کا خیال آیا جو چڑیلیں جلاتے تھے۔ اس کے کانوں میں کُھدبُد ہوئی، جیسے کوئی بانڈی اُبل رہی ہو۔ "بڑی آنکھوں والیاں حیا کرنیاں گوریاں، خیموں میں رہنیاں۔" اسے بارشوں کے موسم میں پہاڑوں پر وقوع پذیر ہونے والی لینڈ سلائیڈ کا خیال آیا جس کی زد میں آ کر بڑی بڑی چٹانیں اور فلک بوس درخت کیسے شورشرابے اور کتنی آسانی اور مزے کے ساتھ لڑھکتے جاتے ہیں، لڑھکتے جاتے ہیں، حتیٰ کہ وادی میں بہنے والے دریا میں ایک گونج کے ساتھ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور بتدریج ماند پڑتی بازگشت میں پانی کی تہہ سے جا لگتے ہیں، اور چٹانیں پُراسائش سکونت اختیار کرتی ہیں اور درخت بےحد اطمینان اور آرام سے اپنی طاقت کا ایک ذرّہ صرف کیے بغیر بہنے لگتے ہیں۔ ہر پہاڑی سلسلے کی وادیوں میں ایک دلکش، غصیلا اور مستقل مزاج دریا ہوتا ہے۔

ہرچند کہ اُس کے بالوں کی چمک دمک اور لہروں نے اسے مٹھیاں بھینچنے پر مجبور کر دیا تھا، مگر اس کے یقیں کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ اس کا معاملہ شک کی حدود تک پہنچانے کی ذمّےدار اُس کی آنکھیں تھیں۔ مصوّروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز اور ان کے رنگ پرنٹس نے ہمیشہ اس کے خون میں شدید ارتعاش اور جھنجھلاہٹ پیدا کی تھی۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر

Scanned with CamScanner

پوسٹر کے کونے پر لکھی تحریر پڑھی اور پیشانی پر پڑنے والی اُسی نادیدہ چوٹ کے اثر سے لڑکھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ فوٹوگراف تھا۔ دوبارہ اُس کی آنکھوں والے حصّے پر نظر ڈالنے کے لیے اسے اپنا دل مضبوط کرنا پڑا، اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے ناول کا خیال آیا جس کی تکمیل کے نزدیک اسے نئے رائٹنگ پیڈز خریدنے کے لیے گھر سے نکلنا پڑا تھا۔ تینوں کرداروں پر خاموشی چھا چکی تھی، اس لیے کہ گفتگو ایک مرتبہ اپنا دائرہ مکمّل کر کے راستوں میں گم کر دینے والے موضوع کی طرف چلی گئی تھی۔ اسی موضوع پر ایک بار پہلے اس کا سانس اکھڑ چکا تھا اور وہ قلم ہاتھ سے دھر کر کئی دنوں تک پرانے شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھومتا رہا تھا اور قدیم روایتوں سے آشنا بوڑھوں سے باتیں کرتا رہا تھا اور اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات سنتا رہا تھا۔ تینوں کردار خاموش ہو چکے تھے کہ ایک مرتبہ پھر پاگلوں اور پیغمبروں کی ظاہری اور باطنی نزدیکیاں اور دوریاں زیرِبحث آ گئی تھیں۔ آفاقی شعور پیدا ہونے کے بعد عام سطح پر ہوش مند رہنے کے امکانات کا جائزہ۔ کیا انسانی ذہن کوسمک کونشس نس کا متحمّل ہو سکتا ہے؟ کیا سنس آف بیونڈ کا بوجھ فقط اولیا کی ہمّت اور طاقت ور شخصیتیں سہار سکتی ہیں؟ اس نے اپنے کرداروں کو اُن بےپناہ آنکھوں کی نمی میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ وہ غرقابی سے پہلے اپنے سوالات اُس کی اِن پلکوں کی طرف اچھال رہے تھے جن کی خم دار انتہائیں کائنات کے ہر پہلو میں دوردور تک پیوست تھیں۔ اس کے دل میں بےاختیار خواہش پیدا ہوئی کہ تیز ہواؤں کے جھکّڑ چلیں اور اس کی پلکیں دُھول سے اٹ جائیں اور آنکھیں غیرپاکیزہ چہروں سے بھر جائیں۔ اسے الہامی کتابوں میں درج بددعائیں یاد آئیں اور پیغمبروں کی مجبوریوں کا اندازہ ہوا۔

اُس کے ہونٹ ایک بےحد شوخ اور مبہم اور پُراسرار اور سراسیمگی طاری کر دینے والی مسکراہٹ کی دھوپ چھاؤں میں نہائے ہوئے تھے اور تمام اعضائےرئیسہ کے بےروک ٹوک کام کرنے کی نشان دہی کرتے تھے اور بدن کی قوّتوں کی کھلی فتح کے آئینہ دار تھے اور زندگی کے احساس سے شرابور تھے۔ اسے پہاڑوں پر بودوباش رکھنے والی آبادیاں یاد آئیں اور اُن بچّوں کا خیال آیا جو برف باری کے دوران گھروں سے باہر، زمین کی رگیں نچوڑ دینے والے موسموں سے بےنیاز، اپنے کھیل میں منہمک رہتے ہیں۔ اِن کے چہرے تازہ اور حرارت بخش خون کی بہتات سے میدانوں کے کھلے آسماں پر چمکتے سورج کی سبب چاک کر دینے والی دھوپ میں نموپذیر سرخ گلابوں کی طرح دمکتے ہیں اور وہ برف کے پُتلے بناتے ہوئے باربار اپنے ہونٹ اپنی زبان سے چاٹتے ہیں جس سے اِن کے ہونٹوں پر ایک ایسی چمک، ایک ایسی خوش نما سُوجن نمودار ہوتی ہے جو پاس سے گذرتے، پناہ گاہوں کی تلاش میں بدحواس اور ہوش گم کردہ، مکّار عمروں والے لوگوں کے قدم روک لیتی ہے اور وہ موم کی طرح پگھل پگھل کر وہیں منجمد ہوتے رہتے ہیں۔ اسے دہکتے ہوئے سرخ انگارے یاد آئے جو جلال اور جمال کے درحقیقت ایک شے کے دو رُخ ہونے کا بھید اتنی آسانی سے اور اتنے وقار کے ساتھ ذہن نشین کرا دیتے ہیں کیوں کہ وہ خود فاصلے سے جمال کا مظہر ہوتے ہیں اور چھونے پر جلال کی مثال بن جاتے ہیں۔ اسے اتنی سرخ رُوئی کس بات پر حاصل ہوئی؟ شاید یہ سمجھ گئی ہے کہ ماہ و سال کا وجود فقط زمین والوں کی نسبت سے ہے اور ماضی اور مستقبل انسان کا ذاتی مسئلہ ہے، کیوں کہ خلا میں "وقت"

نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ لیکن اس حقیقت سے آشنائی کسی کے لیے مسرّت کا پیغام کیوں کر بن سکتی ہے؟ اس کے جی میں آئی کہ وہ بڑھ کر اُس کا منھ نوچ لے اور اس مکروہ مسکراہٹ کا خاتمہ کر دے جو حقیقت کے ادھورے اور خام ادراک سے جنم لیتی ہے اور ناپختہ ذہنوں کو احساسِ کمتری کے عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے اور اِن میں ناتمامی کا شعور بیدار کرتی ہے جس کا خوابیدہ رہنا انسب ہے اور افضل ہے اور موجودات کی حکمتِ عملی کے عین مطابق ہے۔

آگہی چند بےحد مخصوص اور منتخب ذہنوں کی میراث ہوتی ہے جو نیک و بد کے معیاروں سے بلند ہو کر معصوم ہو جاتے ہیں اور غم اور خوشی کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہتے ہیں۔

اُس کی بانہوں اور ہاتھوں پر نگاہ ڈال کر وہ ایک مرتبہ پھر یوں متحرک ہوا جیسے اس کے قدم کسی ٹھوکر سے بےترتیب ہوئے ہوں اور پیشانی کسی دیوار سے ٹکرائی ہو۔ وہ لڑکھڑاہٹ کے جھکاؤ کو ساتھ لیے پیچھے کی طرف جھُول گیا اور پھر جم کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایسی بانہیں تھیں جو زندگی بھر کوئی وزنی چیز نہ اٹھانے سے تشکیل پاتی ہیں۔ اِن ہاتھوں کو دیکھ کر لفظ "مشقّت" اپنے یکسر تضاد کے باعث یوں یاد آ جاتا تھا جیسے چکاچوند پیدا کرتی روشنی میں اندھیرے کا تصور اُبھرے یا جیسے ساحل پر ریت کے گھروندے بناتے ہوئے سمندر کی وسعتیں جہازرانوں کی داستانیں یاد دلا دیں اور اچانک سچیں کی جانی پہچانی "زمین" زندگی میں پہلی بار "خشکی" کی حیثیت سے متعارف ہو۔ اُس کی انگلیوں کی ساخت نے اسے شدید انتشار میں مبتلا کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے خدوخال والیاں عام طور پر خودکفیل ہونے کے ایک ایسے ادبی احساس کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں کہ اِن میں کسی گہرائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حُسن زیادہ تر اپنے وجود کا اظہار نہیں بلکہ اعلان کرتا ہے جو اعلیٰ ترین سطح پر شوخی اور چنچل پن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی انگلیاں دیکھ کر کسی ساز کے بےحد باریکیوں کے ساتھ مچلتے ہوئے تاروں اور موسیقی کی انتہائی لرزہ خیز نزاکتوں کا خیال آتا تھا۔ اس نے اندرونی انتشار اور دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے چند گہرے اور تیز سانس لیے۔

جب ناگواری کی حد تک گہرے سُرخ رنگ اور چمکتے ہوئے ونڈبریکر کپڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے لڑکے نے اپنی اسپورٹس موٹرسائیکل ایک جھٹکے سے پچھلے پہیے پر اٹھائی تو سُپرمارکیٹ کے سیڑھیوں نے پہلی مرتبہ اُس ادھیڑ عمر شخص کو دیکھا جو برآمدے میں دھری رنگین پن اپ تصویروں اور فریم کیے ہوئے رنگ پرنٹس کے سامنے کھڑا تھا۔

شام گہری اور سرد ہو رہی تھی۔ نوجوان لڑکے اکادکا اور ٹولیوں کی صورت میں جنرل اسٹورز اور کپڑوں اور جوتوں کی دکانوں کے سامنے ڈیرے ڈال چکے تھے اور ہر وہ حرکت کرنے میں مصروف تھے جس سے شاپنگ کے لیے نکلے خاندانوں کی نوجوان نسوانی مخلوق کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ پچھلے تین دنوں کی مسلسل ابرآلود فضا اور وقفے وقفے سے ہونے والی بارش نے موسم پر خوش گوار اور دکان داری پر منفی اثر ڈالا تھا، جس کی وجہ سے آج جوتیں دِن خریدنے اور سجنے والے دونوں فریق عام دنوں سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر

Scanned with CamScanner

رہے تھے۔ شاہراہ کے مخصوص فقیر بھی ٹیں ڈی نک روزینے سے محروم رہنے کے بعد اپنے کام میں تن دہی سے مصروف تھے، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ سپرمارکیٹ کے اس سیلزمین نے، جس کی نوکری، اس کی چرب زبانی کے باوجود، تقریباً ہر ڈپارٹمنٹ میں سیلف سروس رائج ہو جانے کے باعث خطرے میں تھی، تصویروں کے سامنے کھڑے اس شخص کو بھیک مانگنے والے اُس گروہ کا فرد جانا جو اپنے گونگے بہرے ہونے اور دیگر معذوریوں اور مجبوریوں کی داستان ایک سے زیادہ زبانوں میں چھپے ہوئے کارڈوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں اور اپنے تقسیم کیے ہوئے کارڈ واپس اٹھاتے ہوئے ان پر پڑی ہوئی رقم باوقار طریقے سے جیب میں منتقل کرتے ہیں اور کوئی دعا دیے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں۔ وہ عمر کی اس منزل پر تھا جہاں سر کے درمیانی بالوں کی اکثریت اپنی جگہ خالی کر چکی ہوتی ہے اور کنپٹیوں کے اطراف پر محفوظ رہ جانے والے بال کہیں کہیں سے سفید ہونے لگتے ہیں۔ لیکن داڑھی اور مونچھیں حسب سابق گھنی اور کھری سیاہ ہوتی ہیں۔ اس کے لباس پر کئی جگہ قلم کی سیاہی کے دھبے تھے اور چند انتہائی چھوٹے چھوٹے بھورے رنگ کے سوراخ تھے جو چرسیوں یا لاپروائی سے سگریٹ پینے والوں کی قمیصوں پر پائے جاتے ہیں۔ محدب عدسوں والی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں عجیب طرح سے روشن اور خواہ مخواہ متاثر کرنے والی لگتی تھیں۔ مجموعی وضع قطع کے اعتبار سے وہ اُن لوگوں سے بھی مماثلت رکھتا تھا جو سرکس اور نجی محفلوں میں اپنی فنکاری سے جادو کے کمالات دکھاتے ہیں اور "پروفیسر" کہلاتے ہیں۔

وہ پتا نہیں کتنی دیر سے اُس غیرملکی ٹی وی اسٹار اور اسٹیج سنگر کی تصویر پر نظریں گاڑے ہوئے تھا جو نئی نسل میں بےحد مقبول تھی، اور اپنے ملک کے ایک مشہور سیاسی لیڈر سے اس کا "معاملہ" کئی دنوں تک دنیابھر کے اخباروں کی زینت بنتا رہا تھا اور اُس سیاست داں کی بدنامی کا باعث ہوا تھا۔

موٹرسائیکل کے کرتب دکھانے والا لڑکا اس مرتبہ سیٹ پر لیٹ کر، دونوں ہاتھ ہینڈل سے اٹھا کر اپنی گردن کے پیچھے لے گیا تھا، اور اب کاروں کے اندر بیٹھ کر فروٹ چاٹ کھانے والی لڑکیاں اپنی پلیٹوں سمیت باہر نکل آئی تھیں اور ان کے والدین بھی اگلی سیٹوں سے سر اٹھا اٹھا کر اس نظارے سے محظوظ ہو رہے تھے۔

سیلزمین نے دیکھا کہ وہ بدستور تمام ہنگامے کی جانب پُشت کیے ہوئے تھا اور اب تک اُس پوسٹر کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور اُس بات سے بھی بےخبر معلوم ہوتا تھا کہ تمام کمرشل ایریا کی بتیاں جل چکی تھیں اور اب وہ تمام تصویریں برآمدے کے سب سے بڑے بلب کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔

جب وہ آہستہ آہستہ جھکنا شروع ہوا تو دنیا کے دھندوں اور روزمرہ کی مکروہات میں الجھے ہوئے سیلزمین کو، جو شاپ لفٹرز کو موقعے پر پکڑنے میں مہارت رکھتا تھا، احساس ہوا کہ مشتبہ حلیے کا وہ آدمی پوسٹر چرانے کے بجائے اسے پھاڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر بات یہی ہوتی اور یہیں تک رہتی تو وہ خود اسے دبوچ لیتا۔ مگر جب جھکتے جھکتے رکوع کی حالت میں جانے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ بجائے تصویر کی طرف بڑھانے کے زمین پر ٹیک دیے اور ایسا

انداز اختیار کر لیا جیسے کوئی سجدے میں جانے والا ہو یا سجدہ کرنے کے بعد اٹھ رہا ہو، تو اسے اچانک یاد آیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چند ہفتے قبل ان کی دکان پر ایک زمانے سے پڑا ہوا، گوتم بدھ کے ڈھانچے والا قیمتی ڈیکوریشن پیس خرید کر لے گیا تھا، اور اسے یہ بھی یاد آیا کہ خریداری سے پہلے وہ دیر تک اس مجسّمے کا منہ چڑاتا رہا تھا۔ اور اس کے بارے میں سب کچھ یاد آ جانے کے بعد سیلزمین کو خیال آیا کہ ان چند ہفتوں میں اس کی داڑھی بےتحاشا بڑھ چکی تھی۔

Scanned with CamScanner

صغیر ملال

بکری کا بچہ

ایسا نہیں ہوا تھا۔

ایسا نہیں ہوا تھا کہ اندھیری رات میں طوفانی بارش کے دوران اس کا پاؤں کسی بیٹھی ہوئی قبر پر جا پڑا ہو اور اس نے انسانی ڈھانچے کو بجلی کے لشکارے میں کیچڑ اور جنگلی جھاڑیوں کی جڑوں میں لتھڑے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ اور ایسا بھی نہیں ہوا تھا، جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے، کہ سواریوں سے لدی ہوئی کوئی بس، چلانے والے کی لمحہ بھر کی غفلت سے، کسی کم گنجائش اور تیکھے پہاڑی موڑ سے الٹ گئی ہو۔ اور نتیجتاً اس نے مسخ شدہ چہروں اور کچلے ہوئے بازوؤں اور ٹانگوں کو گھاٹی کی چٹانوں سے چپکے ہوئے یا وادی میں بہتی ندی کے بلند آواز سے ماتم کرتے ہوئے پانی میں دور تک تیرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ ایسے حادثے کے بعد برسوں تک چرواہوں کو دشوارگذار راستوں اور کھائیوں سے مرنے والوں کے بکسوں کی ٹین اور تالے اور ہڈیاں اور دانت اور چوڑیاں اور سکے وغیرہ ملتے ہیں، اور وہ دبا دینے والی چیزوں کو دبانے اور جمع کرنے والی اشیا کو اپنے کسی کام نہ آنے والے خزانے میں جمع کرتے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور جو کچھ ہوا تھا وہ یوں تھا کہ جب وہ رات کے کھانے کے بعد سونے سے پہلے کتّے کو ساتھ لے کر کھیتوں میں آخری پُشکارا لگانے گیا تو اس نے ڈاک خانے والے پہاڑ کی چوٹی سے ہوا میں بھنور پیدا کر کے نیچے آتی ہوئی انسانی آواز سنی تھی۔

کوئی اس کے گاؤں والوں کو کسی کے مرنے کی خبر دے کر تجہیزوتکفین کے وقت سے مطلع کر رہا تھا۔

وہ اواخر اگست کی ایک انتہائی خوش گوار رات تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا اور پوری وادی اَن گنت ستاروں کی پلکیں جھپکا دینے والی سفید روشنی سے بھری ہوئی تھی۔ ماحول میں بھادوں کے ابتدائی دنوں کا مخصوص سکوت اور حبس پھیلا تھا۔ خاک کی چادر تلے زندگی بسر کرنے والی مخلوق، رات کے اندھیرے کی آڑ ملنے پر، جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں سے لپٹی، تازہ ہوا میں سانس [illegible] تھی اور مٹی کی مار ڈالنے والی نمی سے نجات ملنے پر مترنّم سرسراہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شروع تاریخوں کی باریک گولائی کا چاند میدانوں پر اب تک چمک رہا تھا، مگر فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ علاقے کی واحد سالانہ فصل تیاری کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ بچوں والے گھرانوں نے کمروں کے اندر کھانا پکانا شروع کر دیا تھا، مگر زیادہ تر خاندان ابھی تک صحن والے چولھے استعمال کر رہے تھے۔ بڑے بوڑھے رات کے کھانے کے بعد چولھوں کے گرد بیٹھے، میدانوں میں ہونے والی ساون کی بارشوں کی تباہ کاریوں کو موضوعِ گفتگو بنائے ہوئے تھے۔ دور دور سے کتوں کے بھونکنے اور فصل کو نقصان پہنچانے والے جانوروں کو ڈرانے اور بھگانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ خود ابھی ابھی نادیدہ ریچھ کو اپنے خون پسینے سے سینچی ہوئی مکئی کی اکلوتی فصل سے پرے رکھنے کے لیے چیخا اور ناچا تھا، اور دوبارہ شور مچانے کے لیے سانس درست کر رہا تھا، کہ پہاڑ کی آبادی والی سمت سے وہ انسانی آواز سنائی دی تھی جو کسی کے مرنے کی خبر دریا کے دہانے کے ساتھ بسنے والے دیہاتوں تک پہنچا رہی تھی۔

جواب میں اس کے گاؤں کے ایک معتبر آدمی نے کسی اونچی آواز والے کے ذریعے پیغام پہنچانے والے سے رابطہ قائم کیا تھا اور اس سے جنازہ اٹھنے کے وقت کے سلسلے میں بات کی تھی۔

اس نے مکئی کی فصل میں کھڑے کھڑے منھ اونچا کر کے دونوں آوازیں سنیں۔ اس کی آنکھوں کے عین سامنے ستارے ناچ رہے تھے۔ فضا میں آوازوں کے معدوم ہو جانے کے بعد بہت دیر تک وہ ساکت و جامد، یوں ہی چہرہ اوپر کی جانب کیے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گردن میں خم آ جانے کے خوف سے جھرجھری لی اور سیدھے ہو کر اپنے کتّے پر نظر ڈالی جو دوردراز کے دوسرے سہمے ہوئے کتوں کے ہمراہ رات کے اس لمحے انسانی آوازوں کے غیرمعمولی تبادلے پر اب تک پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ مرنے والے کو بخوبی جانتا تھا۔

اس کے بچپن میں ایک مرتبہ ڈاک خانے والے پہاڑ کی پرلی سمت بسنے والے، برف باری کے دوران ہرنوں کا تعاقب کرتے ہوئے، نیچے کے پہاڑوں پر اترے تھے تو نچلے دیہاتوں کی تمام مردانہ آبادی نے ناکہ بندی میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ شدید برف باری کے خوف سے مائیں اپنے بچوں کو دُہائیاں دے کر روکتی رہ گئی تھیں۔ مگر ان میں سے اکثر تو چاول کے پودے کی رسّیاں بھی پاؤں کے گرد لپیٹنے کے لیے نہیں رکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ برف باریوں کے دنوں کے علاوہ ہرن کبھی وادیوں میں نہیں اترتے، اور چوٹیوں پر شکار کو جانے کے لیے ابھی ایک عمر کا انتظار باقی تھا۔

تمام جنگل برف سے اٹا ہوا تھا اور زمین اور آسمان کے بیچ سفید کے علاوہ دوسرا کوئی رنگ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ندی کے اوپر جمی برف پر چلتے نکلے تھے کہ اس موسم میں چوٹی کی طرف جانے والا واحد کھلا راستا وہی رہ جاتا تھا۔ ابھی وہ جھنڈے والی پہاڑی کے عقب میں پہنچے تھے کہ ہرنوں کی ڈار چوکڑیاں بھرتی ان کے سامنے آ گئی تھی۔ سوائے ایک زخمی ہرنی کے جو تین ٹانگوں پر دوڑ رہی تھی، باقی سارے ہرن بندوق کی گولیوں کی طرح سنسناتے ہوئے ان کے پہلو سے گذر گئے تھے، اور ان کی گئی برف پر قلابازیاں کھا کر رہ گئے تھے۔ خود کو انتی

Scanned with CamScanner

کتّوں اور پاگلوں کی طرح شور مچاتے انسانوں میں گھرا دیکھ کر معذور ہرنی کا دل خوف سے پھٹ گیا تھا اور وہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے مُردار ہو گئی تھی۔

اس ہنگامے میں اس نے مرنے والے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنے قدوقامت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے دیار کے درخت جیسی کوئی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر شکار کا شرعی مسئلہ بیان کیا تھا اور تصدیق کی تھی کہ گولی اللہ کا نام لے کر چلائی گئی تھی اور اس کے بعد مسلسل تعاقب کیا گیا تھا اس لیے ہرنی حرام موت ہرگز نہیں مری تھی۔

آج مر جانے والے کو اُس دن دیکھ کر اسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ پہاڑوں جتنا قدیم اور اٹل ہے، اور اس کی آواز سن کر یوں لگتا تھا جیسے سڑک بنانے والے بارود لگا کر چٹانیں اڑا رہے ہوں۔ اس نے مُردار ہرنی کی گردن پر اپنا چُھرا پھیر کر اسے ذبح کرنے کی رسم ادا کی تھی اور پھر اسے گاؤں کے موچی کے کندھوں پر ڈال کر اپنے گھر پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ موچی کو اس نے "چمڑے کی اولاد" کہہ کر مخاطب کیا تھا، جس پر سب لوگ دل کھول کر ہنسے تھے۔ اور ان ہنسنے والوں میں موچی کے اپنے بیٹے بھی شامل تھے۔ اس نے انھیں بتایا تھا کہ دراصل وہ بنجر چوٹی پر جا کر مارخور کا شکار کرنے گھر سے نکلا تھا مگر ہرن اس کے راستے میں آ گئے تھے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے اسے وادی میں اترنا پڑا تھا۔

جب وہ ندی کے منجمد پانی پر پاؤں دھرتے پلٹے تھے تو انھیں اس جاں لیوا سرد ہوا کا سامنا کرنا پڑا تھا جو جاتے ہوئے چڑھائی کی مشقت اور شکار کے ہنگامے کی وجہ سے پس منظر میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے، جو اس دن مرنے والے کے سامنے بےحد کم حیثیت ہو کر رہ گیا تھا، پوچھا تھا کہ وہ، جو مارخور کے پیچھے بنجر چوٹی کی سمت روانہ ہو گیا تھا، رات کے وقت برفانی طوفان کا مقابلہ کیسے کرے گا، اور اس بات پر اس کے باپ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت پیدا ہوئی تھی اور اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے ہرگز بعید نہیں کہ وہ بنجر چوٹی سے اپنے لیے ساتویں بیوی شکار کر لائے۔ اس کے بعد گھروں کو پہنچنے تک اس کے بارے میں تمام لوگوں نے حیرت انگیز روایات بیان کی تھیں جنھیں اس کا ذہن ایک سنسناہٹ کے ساتھ قبول کرتا چلا گیا تھا، اور اس رات سونے سے پہلے اس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اس ناقابلِ تسخیر شخص کے ساتھ زندگی گذارے گا۔

اسے خیال آیا کہ اُس دن گاؤں کے جتنے معتبر لوگ اس کے ساتھ گاؤں کو لوٹے تھے، اس کے باپ سمیت سب کے سب مر چکے تھے۔ اور وہ تمام عورتیں جو اُس دن اپنے بچوں کے قدموں سے لپٹ کر انھیں برف باری میں باہر نکلنے سے روک رہی تھیں، اپنے گھروں کو نئے آنے والوں کے حوالے کر کے خود گھروں سے نکل گئی تھیں۔ اور آج وہ بھی جسے دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ وہ پہاڑوں جتنا قدیم اور اٹل ہے، مر گیا تھا، ختم ہو گیا تھا۔ اپنے خیال کی شدّت اور نوکیلےپن سے دہل کر وہ تیزی سے پلکیں جھپکا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پہاڑوں کے نشیب و فراز ستاروں کی بہتی ہوئی سفید روشنی میں یوں واضح تھے جیسے سردیوں میں دریا کے شفاف پانی کی تہہ میں بھیانک چٹانیں نظر آتی ہیں اور آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ تہہ میں

اتنی مہیب چیزیں ہونے کے باوجود سطح کیسے ہموار ہو جاتی ہے۔ ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی ریچھ انھی چوٹیوں سے نیچے اترا تھا اور ہزار تدبیروں کے باوجود گاؤں کی واحد سالانہ فصل کو تہس نہس کر گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے اتنے سکون اور اطمینان سے فصل کو اجاڑا تھا جیسے یوں تباہی پھیلانا اس کا پیدائشی حق ہو۔

یہ سوچتے ہوئے اس کے سانس کی آمدورفت اور دانتوں کے کچکچانے کی آواز اتنی بےربط اور بلند ہو گئی کہ اس کا کتا حیرت اور خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں غرانے لگا۔

یک لخت تمام وادی ایک خیرہ کن روشنی سے بھر گئی تھی اور اس نے دیکھا تھا کہ تمام خلقِ خدا اس کا فیصلہ سننے کے لیے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ لیکن ملکہ مکھی مجبور تھی، کیونکہ ریچھ کے تہہ در تہہ اور کھردرے بالوں پر اس کی وعایا کی تمام زہریلی قوتیں بےکار ثابت ہو چکی تھیں اور وہ بھیانک آواز کے ساتھ اندر جاتے ہوئے سانس کی قوت سے انھیں یکے بعد دیگرے نگلتا جا رہا تھا اور ان کی جان توڑ شب و روز کا حاصل اس کی کنڈیالی زبان پر شہد کی صورت میں ٹپک رہا تھا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر ہوا میں اُچھلا اور چیخا "جا تیری تو بڑے ریچھ کی ایسی کی تیسی" اس کی آواز اور اچھل کود اتنی تند اور وحشی ہوئی چلی گئی کہ اس پاس کے درختوں پر رین بسیرا لیے ہوئے پرندے شور مچاتے ہوئے ہوا میں منڈلانے لگے۔

جب خاندان کے افراد اس کی مدد کو پہنچے تو وہ اپنا چہرہ ستاروں کی طرف کیے، بھنچی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ ہوا میں اچھل اچھل کر چیخ رہا تھا، "تیری تو بڑے ریچھ کی ایسی کی تیسی"

صبح تک گردونواح کے تمام دیہاتوں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ وہ رات کو آخری پہرے کے دوران ریچھ کے قدموں کی آہٹ سن کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔

وہ وقفے وقفے سے آنکھ کھولتا اور دروازے پر ریچھ کو کھڑا دیکھ کر لرزنے لگتا۔ اس نے ہر شخص کو خدا کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ وہ کسی طرح ریچھ کو وہاں سے بھگا دے۔ اس کو گرمی پیدا کرنے والی چیزوں کے بعد جگر ٹھنڈا کرنے والی غذائیں استعمال کرائی گئیں، مگر اب ریچھ دروازوں کے علاوہ روزنوں اور کھڑکیوں سے بھی داخل ہوتا اور چھت کی کڑیوں اور دیوار کی کارنسوں پر دھرے برتنوں کے پیچھے سے جھانکتا تھا۔ اس نے عامل مولوی کو بھی ریچھ سے بچنے کا مشورہ دیا اور لحاف سر پر ڈال کر چارپائی کے اوپر ہی سجدے میں چلا گیا اور اوندھا پڑا پڑا گاؤں کے اُن لوگوں کے نام لے کر رونے لگا جو مدّت ہوئی مر چکے تھے۔ اس کے رونے کا انداز اتنا بھیانک اور لرزہ خیز تھا کہ کمرے میں موجود لوگوں کے دل دہل گئے اور برامدے میں کھڑی عورتوں نے سہم کر بچوں کو اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ مولوی صاحب چونک کر پیچھے ہٹے اور کاندھے پر پڑی چادر سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے، خبیث ارواح سے بچنے کی دعا پڑھنے لگے۔

ایک لڑکے نے تحصیل کے ہائی اسکول میں تمام ہم جماعتوں کے سامنے اس کے بیٹے سے کہا، "تیرا باپ بکری کا بچہ ہے کہ ریچھ کا نام سن کر خوف سے رسّی تڑانے لگتا ہے" اور اس کا بیٹا ذلت اور شرمندگی کی انتہا سے مغلوب ہو کر رونے لگا۔

Scanned with CamScanner

علاقے میں میسّر بہترین علاج کی فراہمی کے باوجود اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ وہ ہر ملنے والے سے اس کے بزرگوں کا ذکر کرتا، ان کی خصوصیات اور اوصاف بیان کرتا، اور ان کی موت کے ذکر تک آتے آتے یوں ہچکیاں لینے لگتا کہ اکثراوقات اس کی مزاج پُرسی کو آنے والا خود سُرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں لیے اپنے گھر کو لوٹتا۔ حکیم کے جواب دینے کے بعد ایک مرتبہ پھر اس کا علاج گھریلو خوراکوں اور ٹوٹکوں کے ذریعے نہایت دلجمعی اور توجہ سے کیا گیا، لیکن افاقے کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر خاندان کی عورتوں نے چند دن تک اس کے بستر کے گرد بیٹھ کر رونے کی رسم ادا کی اور پھر اس کا معاملہ، احتیاط اور پرہیز کے مضبوط عزم کے ساتھ، اللہ توکلی پر چھوڑ دیا۔

صبح ہوتے ہی اس کی چارپائی صحن میں اخروٹ کے درخت کے نیچے ڈال دی جاتی، جہاں سے وہ دن بھر گاؤں کی طرف خالی خالی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ بلکتے ہوئے بچے، شور مچاتی مائیں، سروں پر گھڑے اور بالٹیاں اور لمبی رکھے پانی کے پھیرے لگاتی مختلف عمروں کی لڑکیاں، کاندھوں پر کلہاڑیاں اور سروں پر جلانے کی سوکھی لکڑیوں کے گٹھے اٹھائے، جنگل سے آتے لڑکے، کھیتوں کے اطراف کانٹےدار جھاڑیوں کی باڑھ بناتے مرد، ان جھاڑیوں اور پتھروں کی دیواروں کو پھلانگ کر پکی ہوئی فصل پر حملہ آور ہوتی بکریاں اور ان کا پیچھا کرتے کتّے، ساون کے مہینے کا سربلند اور گھنا سبزہ کھا کر مست ہو کے سینگوں سے مٹی اٹھاتے اور آپس میں زوراوری کرتے بیل اور صحنوں میں بندھی، یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتی، نمناک آنکھوں والی مسکین گائیں۔

اسے دور کی آوازیں نزدیک سے اور، بعض اوقات، نزدیک کی آوازیں دور سے آتی سنائی دیتیں اور وہ ان کا موازنہ اور تجزیہ کرتا رہتا۔ اُن اجنبی پرندوں کی آوازیں جو صرف برسات کے موسم کی وجہ سے اس علاقے کی طرف نکل آئے تھے اور ہر سال کی طرح ان دنوں چوٹیوں سے دھیرے دھیرے اترتے جاڑے کے قدموں کی دھمک محسوس کر کے میدانوں کی سمت واپسی کے لیے پر تول رہے تھے اور روزبروز تعداد میں کم ہوتے جا رہے تھے۔ جنگلی مرغوں کی بانگیں جو گھریلو مرغوں کی اذانوں سے زیادہ بلند اور لوچ دار ہوتی ہیں اور جن کی آوازوں میں اس مخصوص جلال کی آمیزش ہوتی ہے جو اُن نسلوں کا خاصّہ ہے جنھیں اپنے ہم جنسوں کی طرح انسان کی پناہ میں آنا منظور نہیں ہوتا۔ چارپائی کے آس پاس گھومتی، چوزوں والی مرغی کی مسرت اور خوف کی آوازیں۔ کھیتوں میں بولتے تلئیر اور بٹیر۔ درختوں کی شاخوں پر چہکار مچاتی گھگیاں اور گٹاریاں۔ شکاریوں کے منھ میں پانی بھر لانے والے تیتروں اور چکوروں کے زمزمے۔ اپنے تسلسل اور پیچیدگی سے سر چکرا دینے والی ترڈیوں کی آوازیں۔ فصلوں کا سر جھکا کر گذرتی ہوا کی سرسراہٹ۔ اور ان ساری آوازوں کے پس منظر میں پگھلتی برف سے بھری پہاڑی ندیوں اور وادی میں بہتے تُندخو دریا کا مسلسل شور۔ یہ سب کچھ دیکھنا اور سننا اسے اچھا لگتا اور وہ ایک گہری طمانیت کے احساس میں شرابور ہو کے، لہک لہک کر بہت بولنے لگتا۔

ایک دن اسے یوں گاتے دیکھ کر نمبردار نے اس کی بیوی سے سرگوشی کے انداز میں کہا،

"جب ریچھ اس کے دھیان سے ہٹتا ہے تو یہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اسے کسی طرح یقین دلا دو کہ اس سال نیچے اترنے والے ریچھ کو جنگل کے سپاہیوں نے ہلاک کر دیا ہے۔ اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔"

وہ اس وقت بہت خوش ہوتا جب ضلعے سے آنے والی بس سرخ مٹی والے پہاڑ کے عین وسط میں نمودار ہوتی اور اس کے گاؤں کے لوگ اس کی چھت سے اپنے تھیلے اور بوریاں اتارتے ہوئے، کیڑے مکوڑوں کی طرح چھوٹے چھوٹے نظر آتے۔ بس کچھ ہی دیر میں ڈگمگاتی ہوئی روانہ ہو جاتی اور گھوم کر پہاڑ کی دوسری سمت چلی جاتی، اور اچانک سرخ مٹی والے پہاڑ کے درمیان میں کھنچی ہوئی سڑک کی لکیر اس کی توجہ مبذول کر لیتی اور پہاڑ کی گولائی پر لپٹی ہوئی وہ کالی سڑک اسے یوں لگتی جیسے کسی تھانےدار نے اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر پیٹی باندھ رکھی ہو۔

ایک دن بس جونہی پھیرا لگا کر سرخ مٹی والے پہاڑ کی اوٹ میں اوجھل ہوئی، اسے تھانےدار گلفروش یاد آ گیا جو ایک مرتبہ کسی ضلعی مفرور کا سُراغ لگانے ان کے گاؤں میں آیا تھا۔ واپسی پر وہ ندی پار کرتے ہوئے، اونچائیوں سے اچانک آ جانے والے بارانی پانی کے ریلے کی زد میں آ گیا تھا۔ اور کئی دنوں بعد جب باڑھ کا پانی اترا تھا تو اس کی لاش پانی پر جھکی کانٹےدار جھاڑیوں میں اس طرح الٹی لٹکی ہوئی ملی تھی کہ اس کا کنارے کی طرف جھولنے والا بازو گیدڑ اور نیولے کھا گئے تھے۔ اس کے باوجود لوگوں نے شکر کیا تھا کہ لاش کا زیادہ حصہ پانی میں ہونے کی وجہ سے جانوروں کی پہنچ سے باہر رہا تھا، ورنہ جنگل میں حادثوں کا شکار ہو جانے والے دوسرے افراد کی طرح گلفروش کی لاش کو بھی گیدڑ اور نیولے گھسیٹ کر لے جاتے اور ضلعی حکام مفرور کی حمایت میں تھانےدار کو قتل کرنے کے الزام میں مقامی لوگوں پر عذاب نازل کر دیتے۔

تھانےدار گلفروش جیسے بھاری بھرکم اور توانا شخص کی پھولی ہوئی مسخ لاش کی یاد سے اس کے بدن میں جھرجھری آ گئی اور اس نے کراہت سے فرش پر تھوک کر اتنی بلند اور کپکپاتی ہوئی آواز سے ہوا میں گالی دی کہ صحن میں گھومتی مرغی نے کٹکٹا کر اپنے چوزے پروں تلے دبا لیے۔ اس کی بیوی نے چولھے کی لپائی چھوڑ کر اس کی طرف جست لگائی اور اسے گارے سے بھرے ہاتھوں سے تھام کر تسلی دی تو وہ اس کے بازوؤں میں کسمساتے ہوئے بولا،

"شہر والے ریچھ کا دھیان پڑتا ہے۔ نہ قد نہ بُت۔ آدمی کے اشارے پر ناچتا تھا۔ وہاں کے لوگ تو اسے کوئی بھلامانس جناور ہی سمجھیں گے۔"

اس رات اسے دو دن کے وقفے کے بعد دورہ پڑا تھا۔ حسبِ دستور اس کا سارا بدن لکڑی کی طرح اکڑ گیا تھا اور آنکھوں کا کالا حصّہ یوں کپکپاتا ہوا پپوٹوں میں گھستا چلا گیا تھا جیسے کیچوے سورج کی روشنی سے پریشان ہو کر، اپنے بدن کو حیران کن حد تک پھیلا کر دائرہ وار گیلی زمین کی تلاش میں منھ مارتے ہیں اور نمی محسوس کرتے ہی اپنے لرزتے ہوئے لجلجے وجود سے مٹی کو چیرتے ہوئے زمین کے اندر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کی بیٹی اس کے منھ سے اُبل اُبل کر نکلنے والا جھاگ صاف کرتے ہوئے رو پڑی تھی، اور اس نے دونوں ہاتھوں سے

Scanned with CamScanner

اپنے بال نوچ نوچ کر اسے ریچھ سے پناہ مانگنے کی تلقین کی تھی۔

اس کے بیٹوں اور بھتیجوں نے رات کے وقت اپنے کھیتوں میں کھڑے ہو کر آوازے لگانا اور ٹین کھڑکانا چھوڑ دیا تھا، اس لیے کہ اس کے خوفیانے کے پہلے دن ہی حکیم جی نے اس کے بڑے بیٹے کو نصیحت کی تھی، "سخت دھیان کی ضرورت ہے۔ اب اگر تیرے باپ کے کان میں ریچھ کا نام پڑ گیا تو یا وہ چارپائی پر دم توڑ دے گا یا اس کے بدن کے جوڑ اکڑ جائیں گے اور وہ ساری عمر کے لیے تختہ ہو جائے گا۔" گاؤں والے اس سے پہلے خوفیا جانے والے کئی مردوں اور عورتوں کو بھگت چکے تھے، اس لیے انھوں نے حکیم کی نصیحت سے بغیر ازخود احتیاط برتنی شروع کر دی تھی اور اپنے ان ڈوغوں کو تقدیر پر چھوڑ دیا تھا جو اُس کی زمینوں کے ساتھ لگتے تھے اور جہاں سے فصل تباہ کرنے والے جنگلی جانوروں کو کھدیڑنے کے سلسلے میں مچائے جانے والے شور کے اس کے کمرے میں جانے کا خدشہ تھا۔ ہرچند کہ اس کے خوفیانے کے بعد سے ریچھ دو مرتبہ چوٹیوں سے اتر چکا تھا لیکن دونوں مرتبہ دریا کے ساتھ والے کھیت اس کی خباثت کا نشانہ بنے تھے اور نشیب میں واقع مکانوں سے بلند ہونے والی چیخ پکار دریا کے شور میں دب کر رہ گئی تھی۔

ایک دن اس نے اپنی فصل کی کٹائی کے لیے آنے والے لیتروں سے مخاطب ہو کر کہا، "بات یہ ہے کہ ریچھ سے کسی صورت نہیں بچا جا سکتا۔ یہ دنیا کی ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس لیے کہ کوئی جانور گوشت خور ہے تو زمین سے اُگنے والی چیزیں اس کے لیے ڈھول مٹی کے برابر ہوتی ہیں، اور کوئی جڑی بوٹیوں پر منھ مارنے والا ہے تو ڈھورڈنگروں کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ایسی بلا بنائی گئی ہے کہ کیڑا پتنگا، دانا تنکا، کچھ بھی اس کے لیے حرام نہیں۔ یہ ہر چیز کا خاتمہ کر دیتا ہے۔"

ایک رات کسی کم ذات نے اگلے موسم میں گھاس کی پیداوار گھنی کرنے کے لیے جنگل کو آگ دکھا دی۔ صبح تک آگ کے شعلے سرخ پہاڑ کی چوٹی کے جنگل کو خس وخاشاک کی طرح راکھ میں تبدیل کرتے ہوئے، ڈھلانوں میں اتر آئے۔ چیڑھ، دیار، ٹاہلی، کئو اور دھمّی کے بلندوبالا درختوں کے بعد گرینڈے، اخی، بھکڑ اور سنتھے کی سخت جان جھاڑیاں بلاامتیاز تڑتڑ جلنے لگیں۔ پہاڑ کے دامن میں محکمۂ جنگلات کے تنخواہ دار، شدتِ غضب سے لرزتی ہوئی آوازوں میں آگ لگانے والے کو گالیاں دینے لگے اور انتہائی مستعدی سے، جلد بھڑک اٹھنے والی خشک جھاڑیاں اور درخت کاٹ کاٹ کر آگ کے راستے سے ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔ سپاہیوں کی وردیاں بہت جلد گھاس کے تنکوں، خشک پتوں اور کانٹوں سے اٹ گئی تھیں اور ان کے جوتے پہاڑ کی سرخ اور گیلی مٹی سے لت پت ہو گئے تھے۔ جنگل کا حوالدار، جو چھوٹی ندی کے پانی کی سطح والے پتھروں سے پھسل کر وردی پھڑوا چکا تھا، اب اپنے بدن سے کیچڑ صاف کرتے ہوئے باربار اعلان کر رہا تھا کہ آنے والے موسم میں کسی گناہ آلود زندگی بسر کرنے والی ماں کا بیٹا ہی گاؤں والوں کو سرکاری زمین سے گھاس کاٹنے کی اجازت دے گا۔

سرخ مٹی والے پہاڑ کی سورج طلوع ہونے والی سمت سے کالا ریچھ گھیرے جنگل کو روندتا ہوا، قبرستان والے پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اس کے غار میں دھواں بھر گیا تھا۔

گاؤں کے مرد آگ سے دہکتے پہاڑ سے منسلک اپنے کھیتوں سے پلنار ہٹا رہے تھے۔ ان کا گذشتہ تجربہ گواہ تھا کہ فصل اجاڑنے والے جانوروں کی راہ روکنے کے لیے سوکھی ہوئی کانٹےدار جھاڑیوں سے تعمیر کی جانے والی یہ حفاظتی دیواریں بہت جلد آگ کی انگلی پکڑ کر اسے گھروں تک لے آتی ہیں۔ آگ کے دائرے کے گرد اڑتے ہوئے پرندوں کی سراسیمگی اور دہشت دیکھ کر اولاد والی ماؤں کا اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب بھی کوئی درخت تڑتڑاتا ہوا گرتا، پرندے اپنا گھربار شعلوں سے نکال لے جانے کے لیے آخری کوشش کے طور پر اس پر جھپٹتے اور آگ کی حدت محسوس ہونے پر یوں ہوا میں اچھل جاتے جیسے زمین سے کوئی فوارہ پھوٹ نکلا ہو۔

سرخ مٹی والے پہاڑ کے بھڑک اٹھنے کے سبب آج نشیبی گھروں والوں نے بھی اپنے ڈھورڈنگر قبرستان والے پہاڑ کی سمت ہانک دیے تھے، اور اس وقت بےشمار مویشی سر جھکائے، پائمال اور بےترتیب قبروں کے درمیان اُگنے والی گھاس چرنے میں مصروف تھے۔ وقفے وقفے سے کوئی جانور منھ میں اکٹھی آ جانے والی سخت گھاس کو زمین سے اکھاڑنے کے لیے اپنے سر کو معمول سے زیادہ جھٹکتا تو اس کی گردن میں پڑی گھنٹی بہت دلکش انداز میں بج اٹھتی۔ اس کے علاوہ تہہ در تہہ بنے ہوئے پہاڑی قبرستان میں مکمل خاموشی طاری تھی۔

سائے طویل ہونے پر جنگل کے سپاہیوں کی جان توڑ کوششوں کے طفیل تین سمتوں سے آگ کی پیش رفت کے راستے مسدود ہو چکے تھے اور چوتھی طرف بارش اور پگھلتی برف کے پانی کی، اپنے کناروں سے چھلک کر بہتی ہوئی ندی آگ کے لیے قدرتی رکاوٹ تھی۔

گاؤں کے معتبر اور سرکاری املاک سے دلچسپی رکھنے والے بوڑھے گھروں کو آنے سے پہلے، رات کے وقت ہوا کی طاقت سے اچانک بھڑک کر دور جا گرنے والی چنگاریوں کا مقابلہ کرنے اور بگڑی ہوئی صورت حال سے نمٹنے کے سلسلے میں اپنے خاندان کے اُن نوجوانوں کو ہدایات دینے میں مصروف تھے جنھیں وہ رات بھر کے لیے وہیں چھوڑ کر جا رہے تھے، کہ اچانک قبرستان والے پہاڑ سے کسی بڑے مویشی کے ڈکرانے کی انتہائی بھیانک آوازیں بلند ہوئیں۔

دوسری جست میں ریچھ بوڑھے بیل کی پشت پر پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب اس کے کوہان سے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں بیل کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ آخری مرتبہ اپنے پھیپھڑوں میں ہوا روک کر لرزہ خیز آواز میں ڈکرایا اور ریچھ کو کمر پر لیے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

سڑک کے مزدوروں نے، جو بلندی پر ہونے کے سبب دور دور تک دیکھ سکتے تھے، ہوکے لگا کر گاؤں والوں کو مطلع کیا کہ ریچھ پکّے مکان والوں کے بُھورے کا نقصان کر گیا ہے۔ مزدوروں کی آوازیں ہوا میں بھنور پیدا کرتی چاروں طرف پھیل گئیں۔ پکّے مکان والیاں پچھاڑیں کھانے لگیں اور ان کا باپ، جو سرخ مٹی والے پہاڑ کی آتش زدگی پر صبح سے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور آئندہ ساون میں وہاں اُگنے والی گھنی اور اعلیٰ گھاس کے تصوّر میں مست تھا، اچانک اپنے خول سے نکل آیا اور گاؤں کے اُن لوگوں کی عورتوں سے بلند آواز کے ذریعے ناجائز تعلقات قائم کرنے کی دھمکیاں دینے لگا جو رائفلیں خرید کر گھروں میں ڈال لیتے

Scanned with CamScanner

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے
ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

Scanned with CamScanner

ہیں لیکن پھر کارتوسوں کے لیے رقم خرچ کرنے سے گھبراتے ہیں۔

وہ اس تمام ہنگامے سے بےخبر، اپنے بستر پر لیٹا کمرے کی دیواروں پر چسپاں پرانے اخباروں کے رنگین صفحوں کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اس دن وہ تمام وقت تاثرات سے عاری چہرہ لیے کھڑکی سے سرخ مٹی والے پہاڑ کے جنگل کو راکھ بنتے دیکھتا رہا تھا۔ اور اس لمحے اپنی خلا بھری آنکھیں دیوار پر گاڑے، اُبلتے چاولوں کی پیچ تیار ہونے کا انتظار کر رہا تھا، کہ اچانک اس کی فصل کی کٹائی پر ڈھول پیٹنے کے لیے ڈاک خانے والے گاؤں سے آنے والے میراثی نے اس کے بڑے بیٹے سے اپنے مخصوص مزاحیہ لہجے میں کہا، "پکّی دیواروں والے اگر اتنا شور قبرستان جا کر مچا دیتے تو مُردے اٹھ کر ایک طرف کو بھاگ پڑتے اور ریچھ دوسری طرف کو..." اس کے بیٹے نے گھبرا کر آنکھ کے اشارے سے اسے صورت حال کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا، مگر میراثی اپنی دُھن میں رواں ہو گیا تھا۔ ہنستی ہوئی چھڑی لہراتے ہوئے بولا، "ہاتھ میں خدا کا نُور ہے۔ اپنے کانوں سے سن کر آیا ہوں۔ ڈھول سے اونچا بج رہا ہے بڑی پگڑی والا۔ ریچھ سن لے تو بیل سموچا اُگل دے۔ ابھی تو اس نے پورا ہضم بھی نہیں کیا ہو گا۔"

اس کی آنکھیں میراثی کی باتوں کی کڑیاں جوڑنے کے عمل میں پھٹتی چلی گئیں اور پھر اس کی چیخ نے گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔

سب دم بخود ہو کر ریچھ کو ایک پکّی قبر پر بیٹھے، پنجے چاٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس کے کھردرے بال خون میں لتھڑ جانے کے بعد گچھوں کی صورت میں بدن سے لٹک رہے تھے۔ اگر وہ وقفے وقفے سے جمائی لینے کے انداز میں منھ کھول کر اپنے بھیانک دانتوں کی جھلک نہ دکھاتا تو فاصلے سے دیکھنے والے اسے جنگلی اناروں کا ایک ایسا درخت سمجھتے جو بجائے بیساکھ کے ساون میں سرخ شگوفوں سے لد گیا ہو۔

شام تیزی سے گہری ہو رہی تھی۔ سورج چند لمحے پیشتر دیار کے درختوں والی چوٹیوں پر سرخ آسمانی آنکھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا، مگر اب پیڑوں کی پشت پر پہنچ کر شاخ در شاخ تقسیم ہو گیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ رَجا ہوا ریچھ آج تازہ فصلوں کی پروا کیے بغیر، اندھیرا چھاتے ہی بادلوں اور برف کی دائمی اوٹ میں رہنے والی اُن چوٹیوں کا رخ کرے گا جہاں انسانوں کی عمل داری باقی نہیں رہتی۔

پکّے مکانوں کے مالک، بڑی پگڑی والے پر رک رک کر جنونی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ گولیاں نہ رکھنے کے سلسلے میں تمام گاؤں والوں کو گالیاں دیتے دیتے تھک گیا تھا، اور اب عورتوں کی طرح اپنے نُھورے بیل کی صفتیں بیان کر کے رو رہا تھا۔ "میں کہتا ہوں...." اس کی آواز اس کے بدن کی طرح کانپ رہی تھی۔ "اگر تحصیل کے میدان میں دریاپار کے ٹس کی چھت والے اس کے جواب میں اپنا کوئی جانور نہیں لا سکے تھے تو وہ سارے گاؤں کو شاباشی ہوئی یا نہیں؟"

وہ اندھادھند بھاگتا ہوا اب پگڈنڈی پر آ گیا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر ٹھوکریں لگنے سے اس کے پاؤں کے کئی ناخن اُکھڑ گئے تھے۔ خاردار جھاڑیوں اور نوکیلے پتھروں سے تعمیر کی ہوئی چاردیواریوں کو وہ یوں روندتا اور پھلانگتا چلا آیا تھا کہ اس کے کپڑے تارتار ہو گئے تھے

اور بدن جگہ جگہ سے اُدھڑ گیا تھا۔ اس کے گھر کی عورتیں اور بچّے بےپناہ شور مچاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگے چلے آ رہے تھے اور اسے رک جانے کی قسمیں دے رہے تھے۔

گاؤں والوں نے اسے اُس وقت دیکھا جب وہ پہاڑ کے نشیبی علاقے سے پتھروں کی دیوار پھاند کر قبرستان میں داخل ہو چکا تھا۔

جب اس کی بیوی بڑی پگڑی والے کے قدموں میں گری، اسے بچا لینے کی التجا کر رہی تھی، وہ ریچھ کو برابھلا کہتا، اسے مکّے دکھاتا، اس کی سمت بھاگا چلا جا رہا تھا۔ سوائے اس کے بیٹوں کے، جو دیوار کود کر اندر چلے گئے تھے اور پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اسے واپس آنے کو کہہ رہے تھے، بقیہ تمام لوگ اپنی اپنی جگہ پتھر بن چکے تھے۔

فاصلہ کم رہ جانے پر اس نے ریچھ کو پتھر مارے اور اسے حقیر اور ناچیز اور کم ذات کہہ کر مخاطب کیا، اور پھر دنیا کی ہر گندی اور غلیظ اور فحش بات کہتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی سمت بڑھنے لگا۔ اس نے ریچھ کے دانتوں اور بالوں اور پنجوں کو الگ الگ گالیاں دیں۔

آسمان پر ادھر اُدھر ستارے نمودار ہو رہے تھے اور رات کے تیزی سے گہرے ہوتے اندھیرے میں اب وہ دونوں پرچھائیاں سے نظر آ رہے تھے۔

نزدیک پہنچ کر وہ بلند آواز سے روتا ہوا ریچھ سے لپٹ گیا۔

درندے کا پنجہ ہوا میں لہرایا اور اس کا وجود کئی حصّوں میں تقسیم ہو کر اس پاس کی قبروں پر بکھر گیا۔

Scanned with CamScanner

صغیر ملال

شناخت

جب ایک دن اور ایک رات کے بعد کمر کے پیچھے لے جا کر چھت کے کنڈے کے ساتھ بندھے ہوئے اس کے بازو کھولے گئے تو وہ تھوڑی دیر سر سے پاؤں تک لرزتا رہا اور پھر کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر یوں بےحس وحرکت بیٹھ گیا جیسے اگلی سزا جھیلنے کے لیے ہمہ تن تیار ہو گیا ہو۔ پچھلے ایک ہفتے کے دوران وہ اپنے اوپر کیے جانے والے تشدد کو کچھ اس طرح برداشت کرتا رہا تھا کہ اگر اس معاملے میں اسپیشل پولیس شامل نہ ہو چکی ہوتی تو تھانہ سی ڈویژن کا انچارج اسے اب تک آزاد کر چکا ہوتا۔ لیکن اسپیشل پولیس کے حوالدار اکبر کو، جس کا ملزموں کو اقبالی کرنے کا ریکارڈ سو فیصد تھا، پتھر کی سی سختی اور نوکیلاپن رکھنے والے اس شکی الوجود اور مفلوک الحال ملزم سے ذاتی نوعیت کی ضد سی ہو گئی تھی۔

"تیرے ساتھ والے اپنا کھایا پیا اگل کر ایک طرف ہو گئے ہیں۔ تُو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے؟"

یہ بات حوالدار اکبر نے اُس وقت بھی کہی تھی جب اس نے اسے اُلٹا لٹا کر چمڑے کے سلیپر سے اتنا مارا تھا کہ اس کی کھال اُدھڑنی شروع ہو گئی تھی۔ اور یہی بات اس نے اُس وقت بھی دوہرائی تھی جب پیروں کے تلووں پر بید گھمانے کے دوران اس کی ناک سے اچانک خون اُبل پڑا تھا۔

شاہ روشنی چراغ کی پہاڑی سے گرفتار کر کے لائے جانے والے اس آخری ملزم نے حسب سابق اس مرتبہ بھی اسپیشل پولیس کے حوالدار اکبر خاں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

شاہ روشنی چراغ کی مقدّس پہاڑی پر چھاپا مارنے کے لیے حکام بالا کی خصوصی اجازت حاصل کی گئی تھی۔

شہر میں یکے بعد دیگرے متعدد ایسی ڈکیتیاں ہوئی تھیں جن کا بصدکوشش کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکا تھا۔ آخری واردات ایک پٹرول پمپ لوٹنے کی تھی جس میں کشمکش کے دوران کیشیئر کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ تمام وارداتوں کے عینی شاہدوں نے مجرموں کا جو حلیہ بتایا تھا وہ تقریباً یکساں تھا۔ اور ان شہادتوں سے عام توقعات کے مطابق کسی طور یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ مجرم چھوٹی عمروں کے راہ گم کردہ لڑکے ہیں جن کا تعلق

عام طور پر بااثر متموّل خاندانوں سے ہوتا ہے اور جو نوجوانی کے بلاخیز جذبوں کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو تشدّد کے ذریعے بھک سے اڑا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈکیتی میں قتل کی واردات شامل ہونے کے بعد کیس اسپیشل پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا جس نے اپنے مخصوص طریقۂ کار سے تحقیق کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ مجرم واردات کے فوراً بعد شہر کے بھک منگوں اور سڑکوں پر گھومنے والے مخبوط الحواس لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح شہر کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

جب تفتیش کی بنیاد ان خطوط پر استوار کی گئی تو شہر کے قبرستانوں اور مزاروں اور منشیات کے اڈوں سے مشتبہ حلیوں کے آدمیوں کو گرفتار کرنے کا سلسلہ چل نکلا اور آخرکار شہر کے نواح میں واقع اس مقدّس پہاڑی پر چھاپا مارا گیا جس کے غار میں، ایک روایت کے مطابق، شاہ روشنی چراغ نے کئی سو سال قبل چلّے کاٹے تھے اور تپسیا کی تھی۔ اور جہاں اب علاقےبھر کے چوراُچکّے اور بھک منگے اور مختلف نشوں کے عادی خود کو شاہ صاحب کا نام لیوا اور ملنگ ظاہر کر کے اپنا کام چلاتے تھے۔

پرچند کہ چھاپا تھانہ سی ڈویژن کے ایس ایچ او کی نگرانی میں مارا گیا تھا مگر پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے والوں میں حوالدار اکبر خاں پیش پیش تھا جو سادہ لباس میں ڈیوٹی دینے اور کرائم برانچ سے تعلّق رکھنے کے باعث "اسپیشل والا اکبر" کہلاتا تھا اور تھانہ سی ڈویژن کی حدود کے جرائم پیشہ افراد میں خوفناک شہرت رکھتا تھا۔

جب پولیس والے پہاڑی کے کونوں کھدروں سے تمام مشتبہ حلیوں والوں کو جمع کر کے نیچے لا رہے تھے تو یہی وہ شخص تھا جو اچانک قطار توڑ کر ایک طرف کو بھاگ گیا تھا اور، اس سے پہلے کہ کوئی ایکشن لیا جاتا، چھاپے کی بھگدڑ میں قدموں تلے روندے جانے والے ایک پھول دار پودے کو سیدھا کر کے دوبارہ قطار میں شامل ہو گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد اسپیشل والے اکبر خاں کی نظر اس پر گہری ہو گئی تھی۔ اس کا سابقہ ایسے متعدّد جرائم پیشہ افراد سے پڑ چکا تھا جو قانون کی گرفت میں آنے کے بعد خود پر پاگل پن طاری کر لیتے تھے اور اس طرح بعض اوقات عدالت سے اپنی سزا میں تخفیف کرانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر گرفتارشدگان کی چھانٹی کوئی ایسا مشکل عمل ثابت نہیں ہوا تھا۔ اُن میں سے زیادہ تر سابقہ اخلاقی مجرم ثابت ہوئے جنھیں علاقے کے پرانے سپاہی بخوبی جانتے تھے اور قانون کے محافظوں کا گذشتہ تجربہ اس بات کا گواہ تھا کہ اخلاقی مجرم کمینی اور سفلی طبیعتوں کے مالک ہوتے ہیں، اور کمینی طبیعتوں کے لوگ ڈاکازنی اور قتل و غارت کی طرح کے جرائم کرنے کی ہمّت کبھی نہیں کرتے کہ ان میں بہرحال ایک مخصوص قسم کی دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاقی مجرموں کو الگ کرنے کے بعد جو نو گرفتار باقی بچے تھے ان میں سے چند ایک دوسرے شہروں کے مفرور ملزم نکلے جنھوں نے ابتدائی زدوکوب میں ہی اپنے اصلی نام اور عرفیتیں اُگل دیں۔

Scanned with CamScanner

تفتیش کے اسی مرحلے پر وہ اسپیشل والے اکبر کے سامنے پیش ہوا تھا۔ جب معمول کے مطابق اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے خواب آلود لہجے میں جواب دیا:

"آفاق۔"

اس کے لہجے اور نام نے کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی طاری کر دی تھی۔

"پورا نام بتاؤ!" اکبر خاں نے چھڑی اس کی ناک کے بائیں نتھنے میں گھسا کر گھمائی تھی۔

"آفاق۔" اس کا لہجہ پریشان کی حد تک پُرسکون تھا۔

"عرف؟" اکبر خاں نے اس مرتبہ چھڑی کو اس کے نتھنے میں بجائے گھمانے کے اس طرح آگے کو حرکت دی تھی جیسے وہ اس کا نوکیلا سرا اس کی کھوپڑی سے باہر نکالنا چاہتا ہو۔

"آفاق۔" چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہونے کے باوجود اس کا لہجہ نہیں کپکپایا تھا۔

"تم پہاڑی پر قطار توڑ کر کیوں الگ ہوئے تھے؟" سی ڈویژن کے سب انسپکٹر نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے اکبر خاں کی جگہ سوال کیا تھا۔

"پھول دار پودا روندا جائے تو گھروں میں بچے رونے لگتے ہیں۔"

اس کے جواب پر تھانے کے انچارج کے ہونٹ سکڑ گئے تھے اور اس نے حیرت سے حوالدار اکبر کی طرف دیکھا تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی داڑھی اور مونچھوں کے گھنے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں بھینچ کر اتنی سختی سے جھنجھوڑا تھا کہ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز پیدا ہوئی تھی۔

"سیل میں لے جا کر اس کا حساب کتاب درست کرو۔" اس نے ملزم کی داڑھی کو جھٹکا دے کر اس کا رُخ سیل کی طرف کرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا تھا۔ لیکن باوردی کانسٹیبل کے ساتھ جانے سے پہلے وہ اکبر خاں کی جانب بڑھ کر اس کی قمیص کے کالر پر چھت سے اکھڑ کر آ گرنے والے چُونے کو اپنی انگلیوں کی ملائم حرکت سے صاف کر گیا تھا۔ اس کی اس حرکت نے کچھ لمحوں کے لیے کمرے میں ایک انتہائی نوکیلی خاموشی طاری کر دی تھی۔

رات کے وقت اسے دیگر تمام ملزموں سے الگ ایک سیل میں بند کر دیا گیا تھا اور وہاں اس سلوک کی ابتدا کی گئی تھی جس کے باعث گوشت پوست والے انسانی ناکردہ گناہوں تک کی ذمّےداری اپنے سر لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس نے تمام اذیّتیں سنگربزوں سے بنے ہوئے اپنے بدن پر اتنی جرأت داری اور خاموشی سے برداشت کی تھیں کہ قانون نافذ کرنے والوں کا شک و شبہ اور غصّہ بڑھتا چلا گیا تھا۔

چند دنوں بعد تنگ آ کر اسپیشل والے اکبر خاں نے سپاہیوں کو وہ حربے استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی جو ایذارسانی کے ساتھ توہین اور ذلّت کے انتہائی دردناک پہلو رکھتے ہیں۔

آخرکار وہ بول اٹھا تھا، لیکن جسمانی کرب کی انتہا پر پہنچ کر اس کے منہ سے بےساختہ نکلنے والے الفاظ نہ صرف یہ کہ اس کے اعضا کی ترتیب مسخ کرنے والوں کے لیے اجنبی تھے بلکہ شاہ روشن چراغ کی پہاڑی سے اس کے ساتھ گرفتار ہونے والوں نے بھی ان کے بارے میں مکمّل ناآشنائی کا اظہار کیا تھا۔

وہ ایسے الفاظ تھے جو ثقیل حروف ابجد پر مشتمل ہوتے ہیں اور جن کے معنی نہ جاننے

کے باوجود سننے والے محسوس کرتے ہیں کہ یہ الفاظ بےمعنی ہرگز نہیں ہو سکتے، اور انہیں ایک بےمعلوم سا احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کا مطلب نہ سمجھنا ایک لحاظ سے ان کے حق میں بہتر ہے، اس لیے کہ ایسے الفاظ بہرحال خوش کن چیزوں کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔

جب اسپیشل والے اکبر خاں کو پتا چلا تو اس نے خالی خالی نظروں سے سی ڈویژن کے انچارج کو دیکھتے ہوئے کہا:

"میرے خیال میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا مطلب کسی زبان میں آندھی، زلزلہ یا سیلاب وغیرہ ہو گا۔"

انچارج نے حوالدار اکبر خاں کی بات سن کر اسے بہت غور سے دیکھا اور پھر ایک گہری سانس بھر کر مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

خصوصی عقوبت خانے میں اس کی منتقلی کے تیسرے دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس کے بعد اسپیشل والا اکبر آفاق کے ذکر پر ہر بار چونک جاتا تھا اور پھر کچھ دیر تک ایک عجیب سی غائب دماغی اور خالی الذہنی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہرچند کہ اُس موقعے پر انچارج اور سب انسپکٹر بھی سیل میں موجود تھے اور سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے ہوا تھا، مگر اس واقعے کے بعد اکبر خاں کی ازخودرفتگی اور اس کی نظروں کا خالی پن اُن کی سمجھ سے باہر تھا۔

ہوا یوں تھا کہ جب ایک دن اور ایک رات کے بعد کمر کے پیچھے لے جا کر چھت کے کُنڈے کے ساتھ باندھے ہوئے اس کے بازو کھولے گئے اور وہ تھوڑی دیر سر سے پاؤں تک لرزنے کے بعد کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ایسے اُس میں بیٹھ گیا جیسے اگلی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو گیا ہو، تو اکبر خاں نے اس سے کہا:

"تیرے ساتھ والے اپنا کھایا پیا اُگل کر ایک طرف ہو گئے ہیں۔ تُو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے؟"

یہ بات حوالدار اکبر نے اُس وقت بھی کہی تھی جب اس نے اسے اُٹھا اُٹھا کر اتنا مارا تھا کہ اس کی کھال اُدھڑنی شروع ہو گئی تھی۔ اور یہی بات اس نے اُس وقت بھی دوہرائی تھی جب پیروں کے تلووں پر بید کھانے کے دوران اس کی ناک سے اچانک خون اُبل پڑا تھا۔ لیکن حسبِ سابق اس مرتبہ بھی وہ اس بات کا کوئی جواب دیے بغیر سامنے بیٹھے تین پولیس والوں کو اس طرح دیکھتا رہا تھا جیسے کوئی بہت دور کی اور دیر کی چیز پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ اچانک اپنے بازوؤں کے چٹختے ہوئے جوڑوں کو بصدمشکل سنبھالتے ہوئے اٹھا تھا اور انچارج کے نزدیک پہنچ کر جھک گیا تھا، اور اس وقت ان تینوں کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئی تھیں جب انھوں نے دیکھا کہ اس نے تھانےدار کی وہ چھڑی اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے اٹھا کر اس کی کرسی کے ساتھ دوبارہ انتہائی احتیاط سے کھڑی کر دی تھی جو اس کی بےدھیانی میں کسی وقت پھسل کر فرش پر جا گری تھی۔ حوالدار اکبر بہت جلد اپنی حیرت پر قابو پا کر اس کو سر کے بالوں سے پکڑ کر دوبارہ فرش پر پٹخنے والا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے توقف کرنے کو کہا تھا، اور اس اشارے میں پتا نہیں کیا اسرار تھا کہ اکبر خاں کے ہاتھ ہوا

Scanned with CamScanner

میں اٹھے رہ گئے تھے۔ اس مرتبہ وہ آہستہ آہستہ سب انسپکٹر کے قدموں پر جھکا تھا اور اس کا پاؤں ایک طرف ہٹانے کے بعد اس نے فرش سے ایک زخمی مکڑی اٹھائی تھی جو معلوم نہیں کب اس نے سب انسپکٹر کے جوتے تلے آتی دیکھ لی تھی، اور پھر اس مکڑی کو انتہائی احتیاط سے کوٹھڑی کی اپنی جالی کے ساتھ چسپاں کر کے چھوڑ دیا تھا۔

"یہ تُو کیا کر رہا ہے؟" اسپیشل والا اکبر خاں ایک مرتبہ پھر اسے چیرنے پھاڑنے کی تیاری کرتے ہوئے بولا تھا۔

"مکڑی کی ہزاروں آنکھیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے وہ صحیح آدمی کو پہچان لیتی ہے اور نازک موقعے پر جالا بُن دیتی ہے۔ اس کی عزّت کرنی چاہیے۔" اس نے نصیحت کرنے کے انداز میں جواب دیا تھا۔

اس بےتکی بات پر حوالدار اکبر خاں بک لخت اپنے اُس جلالی روپ میں آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ علاقے کے جرائم پیشہ افراد میں "قصائی کا بچّہ" کہلاتا تھا۔ اس نے بھاری بھرکم سپاہیوں کو اس پر اصلی اور بڑی ترکیب استعمال کرنے کا حکم دیا تھا، اور خود اس سے یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ اسے دوسرے دن تک اس کے بارے میں تمام معلومات مل جانی چاہییں، کہ وہ شاہ روشنی چراغ کی پہاڑی پر آنے سے قبل کہاں کہاں رہا تھا اور کن کن وارداتوں میں ملوّث تھا اور یہ کہ اس کا پورا نام کیا تھا۔

دوسرے دن جب اکبر خاں تھانے پہنچا تو عام توقعات کے مطابق زیرتفتیش ملزم کی کوٹھڑی میں جانے کے بجائے سیدھا تھانےدار کے کمرے میں چلا گیا اور تشویش ناک لہجے میں بولا:

"کل میں نے سائنس کے مضمون پڑھنے والی اپنی بیٹی سے یونہی آفاق کی بات کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ واقعی مکڑی کی آنکھوں کا حساب لگانا بہت مشکل ہے۔"

"مگر یہ اس نے کیا بکواس کی تھی کہ مکڑی صحیح آدمی کو پہچان لیتی ہے اس لیے اس کی عزّت کرنی چاہیے؟" تھانےدار نے اسپیشل والے اکبر خاں جیسے پختہ کار اور دلیر آدمی کو اتنی معمولی سی بات پر پریشان ہوتے دیکھ کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

"وہ کہہ رہی تھی کہ یہ تو ملزم نے یونہی آگے بات سے بات جوڑ دی ہے۔ مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ جنگل میں مکڑی کی ہزاروں آنکھیں گنتا رہا ہے۔"

"ہاں۔ مجرم تو وہ عجیب ہے۔" تھانےدار کو اس کی وہ حرکت یاد آ گئی جب اس نے ماریپٹ کے دوران فرش پر گری ہوئی چھڑی اٹھا کر دوبارہ سلیقے سے کھڑی کر دی تھی۔

اُس دن کے بعد سے اسپیشل کا حوالدار اکبر خاں، جس کا ملزموں کو اقبالی کرانے کا ریکارڈ سو فیصد تھا، آفاق کے ذکر پر ہر بار چونک کر اور پھر کچھ دیر تک ایک عجیب سی غائب دماغی اور خالی الذہنی کا مظاہرہ کر کے سی ڈویژن کے انچارج کو حیرت زدہ کرنے لگا تھا۔ اور آج جب اس نے ملزم کے منہ سے اصلی اور بڑی سزا کے دوران بےمعنی الفاظ کی ادائیگی کے بارے میں سنی کر ای کا مطلب اندھی اور زلزلہ اور سیلاب وغیرہ بتایا تو تھانےدار کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھ کر مایوسی سے سر ہلاتا رہا اور پھر یک لخت اس نے ملزم کو آزاد کرنے

کے بارے میں اس کی رائے طلب کی، جس پر اسپیشل والے کے چہرے سے سایہ گزر گیا اور وہ اس بچے کی طرح تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا جسے اچانک دو انتہائی شدید اور اہم خواہشوں میں سے کسی ایک کو پورا کر لینے کا اختیار دے دیا جائے اور گہری سوچ اس کی پیشانی پر وہ شکنیں ڈال دے جو اس کے معصوم چہرے کے لیے بےحد اجنبی اور نامانوس معلوم ہوں۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک بےاندازہ دکھ نے سر اٹھایا جو لمحہ بہ لمحہ تیز تر اور واضح ہوتا گیا، اور بالآخر اس نے کٹ کٹ کر شاخوں میں تقسیم ہوتی ہوئی آواز میں کہا:

"ہاں۔ ہمیں محمد آفاق کو روکنا نہیں چاہیے۔"

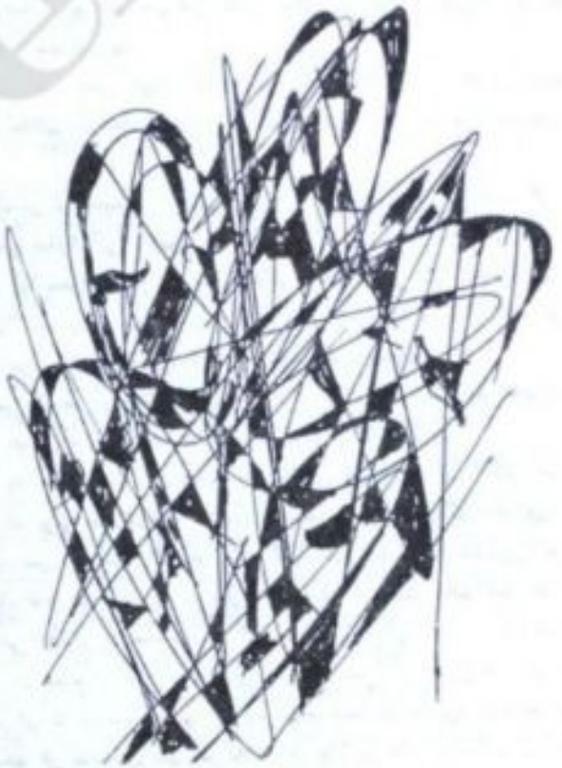

rekhta

Scanned with CamScanner

صغیر ملال

کج رو

دونوں مرغوں کو لڑتے ہوئے تین گھنٹے گذر چکے تھے۔

دونوں مرغوں کو لڑتے ہوئے تین گھنٹے گذر چکے تھے اور فضا پر ہولناک سکوت طاری تھا۔ دونوں حریف اب اس حالت کو پہنچ چکے تھے جب وجود میں زندگی کے آثار آہستہ آہستہ معدوم پڑنے لگتے ہیں اور اعضا میں موت کے سائے ناتوانی کی شکل میں پھیلتے ہیں اور اعلیٰ حسب نسب والے جانوروں کو احساس ہو جاتا ہے کہ مدمقابل بہت سخت جان اور ضدّی نکلا اور ان کی آخری خواہش یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خود مرنے سے پہلے اُسے بھی مرتے ہوئے دیکھ لیں۔ حملہ کرنے اور مدافعت کی تمام قوّت اور صلاحیت خرچ کر دینے کے بعد وہ ایک دوسرے کے سینے سے سینہ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ فقط حریف کے جُھکے ہوئے سر کے اٹھنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ دوبارہ حملہ آور ہوں۔ لیکن ان کی کانپتی ہوئی ٹانگوں اور باربار بدن سے جھک جانے والے پروں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اچھی نسل والوں نے پیٹھ دکھانے کے بجائے موت کو قبول کر لیا ہے اور اس طرح ایک مرتبہ پھر ثابت ہو جاتا ہے کہ اصیل جانور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کی نازبرداری کی جائے اور انھیں بہترین خوراک مہیّا کی جائے اور ان کی تربیت تجربہ کار ہاتھوں سے انجام پائے۔ زمین کو ان کے خون کے آخری قطروں سے رنگین ہوتے دیکھ کر ان کے مالکوں کا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح تماشائیوں کی آنکھیں بند ہو جائیں تاکہ وہ اپنے جاں نثار کو مرنے سے پہلے گود میں اٹھا سکیں اور اسے یقین دلا سکیں کہ اس کی تکلیف سے انھیں دکھ پہنچا ہے اور یہ کہ اس کی دلیری انھیں زندگی بھر یاد رہے گی۔

آس پاس کے باغوں میں بہار کی پہلی نشانی آلوچوں کے سفید پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو چکی تھی اور بکریاں پالنے والے خانہ بدوش میدانوں سے واپسی کا سفر اختیار کر چکے تھے اور ان دنوں حسب دستور راستے میں پڑنے والے قصبے کے نواح میں ڈیرے ڈال کر پہاڑوں پر لوٹنے سے قبل چوٹیوں کی برف پگھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

موسم کھلتے ہی شاہ پور کا کہربستہ سکوت ٹوٹ گیا تھا اور گھروں کے فرش اور دیواروں پر ایک مرتبہ پھر چونٹیوں کی قطاریں نمودار ہو گئی تھیں اور صبح دم چھتوں اور دریچوں سے

گھونسلے بناتی چڑیوں کی چہچہاہٹ زندگی کی سخت جانی کا ثبوت بن کر اُبھرنے لگی تھی اور ڈھولک کی تھاپ اور شادی کے گیتوں کی آوازیں راتوں کی خاموشی میں دور دور تک سنائی دینے لگی تھیں۔

ندی کے کنارے موسم بہار کے پہلے جوڑ کو شروع ہوئے تین گھنٹے گذر چکے تھے۔

لڑائی کے ابتدائی لمحوں میں بھی ایسی ہی خاموشی طاری ہوئی تھی جب خانہ بدوشوں کا "سنہرا" چھوٹتے ہی زورآوری کرتے ہوئے ریاست والوں کے "ست رنگے" کو دھکیلتا چلا گیا تھا، اور یوں محسوس ہوا تھا جیسے ست رنگے پر رقمیں لگانے والوں کے اندازے غلط تھے اور خانہ بدوشوں کے سنہری مرغے کا بھاری تن و توش چربیلا نہیں تھا۔

"قندھاری نسل ہے؟"

ایک بوڑھا چیخا تھا اور شاہ پور والوں کا ہذیانی شور یک لخت ماند پڑ گیا تھا۔ لیکن جب دوسرے ہُولے میں ریاستی اصیل نے اپنے گٹھے ہوئے بدن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انتہائی پھرتی سے پھینٹیاں مارنی شروع کیں تو خانہ بدوشوں کا بھاری بھرکم سنہرا چکرا کر الٹے قدموں زمین چھوڑتا چلا گیا تھا۔

"رامپوری خون ہے؟"

وہی بوڑھا چلایا تھا اور مجمع ایک مرتبہ پھر جھومنے لگا تھا۔

انھی اُچھالوں کے دوران ست رنگے نے ایک ایسی شست باندھی تھی کہ اس کے دائیں پنجے کے ٹوٹے ہوئے خار پر بندھا ہوا پیتل کا نوکیلا انگوٹھا خانہ بدوشوں کے مرغ کی بائیں آنکھ کو چھیدتا چلا گیا تھا اور بےگھروں کی ٹکڑی میں کسی نے زور سے "آ... ہا..." کہہ کر اپنا سینہ کوٹا تھا۔

"کانا پرندہ آدھا وجود ہوتا ہے۔" حکیم جی نے خوشی سے بےقابو ہوتے ہوئے ظہور سے سرگوشی کی تھی۔

"اب اسے اپنی اکیلی آنکھ سامنے رکھنی پڑے گی۔" ظہور کے ماموں نے ایسے سینکڑوں جوڑ دیکھے تھے۔

"اسی لیے کہتے ہیں کہ اندھا ہونے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ کانا ہونے سے بچا جائے۔" دوسرے ماموں نے اپنے سیانے ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا۔

ظہور احمد کا اڑا ہوا رنگ اس کے چہرے پر واپس آ گیا تھا۔

پہلا پانی کرانے تک ریاست کے ست رنگے نے خانہ بدوشوں کے شاندار مرغے کا سراپا بگاڑ دیا تھا۔ اس کی ضائع ہو جانے والی آنکھ کی جگہ پڑ جانے والے گڑھے میں باربار خون کا ایک جیتاجاگتا قطرہ تشکیل پا کر زمین پر ٹپک جاتا تھا۔

ہنگامہ پانیوں کی بات پر ہوا تھا۔

پانی کے وقفے کے بعد دیکھنے والوں کو ایک مرتبہ پھر یوں محسوس ہوا تھا جیسے بےگھروں کا سنہرا کچھ دیر میں ست رنگے کے پرخچے اڑا دے گا۔ اس نے پانی کے بعد چھوٹتے ہی گردن اونچی کر کے ریاست کے پرندے کو کلغی کے پیچھے سے پکڑ کر اوپرتلے ایسی پھینٹیاں

ماری تھیں جن سے ست رنگا لڑکھڑا گیا تھا اور مجمعے پر دوسری مرتبہ خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

"صدقے!" خانہ بدوشوں کی ٹکڑی میں سے کوئی بڑبڑایا تھا۔

"اوّل تو شاں پور والوں کو ریاست کے جانور کا جوڑ اپنے کسی پالتو سے کرانا چاہیے تھا۔" حکیم صاحب نے ظہور کے کان میں کہنے کی کوشش کی تھی۔ "ہم نے تو نہیں سنا کہ راجوں نے کبھی چنگڑوں اور بکربالوں سے جوڑ ڈالے ہوں۔"

"بکریاں پالنا پیغمبری پیشہ ہے، حکیم جی۔" ظہور کے ماموں نے حکیم صاحب کی بات سن لی تھی۔

"بکربال بیگھرے ضرور ہوتے ہیں مگر مُردار نہیں کھاتے۔ چنگڑوں سے ان کا کیا تعلق ہے؟" دوسرے ماموں نے کہا تھا۔

"مگر ریاست میں پانی ایک ہوتا ہے۔ جانوروں کے گرم ہونے کے فوراً بعد۔ پھر وہ ہوتے ہیں اور کھلا میدان ہوتا ہے۔ شاں پور والوں کی طرح ہم چار پانی نہیں کراتے۔ یہ زنانہ طریقہ ہے۔"

حکیم صاحب کے جواب سے ظہور سٹائے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ شاں پور بہرحال اس کی ماں کا قصبہ تھا۔

"حکیم جی، جو جانور چار پانیوں والے جوڑ کے لیے تیار کیا جائے اس کے لیے ایک پانی کی تکلیف تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ایک پانی کے عادی کو چار پانیوں سے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟" ظہور کے ننھیالی رشتےداروں میں سے کوئی بولا تھا۔

"ہم خدمت گار ساتھ نہیں لائے۔"

حکیم صاحب کے لہجے کی پریشانی چھپی نہیں رہی تھی۔ دوسرے پانی پر شاں پور والوں کے اپنے آدمی ریاست کے مرغے کی خدمت کے لیے حاضر ہو گئے تھے۔

لیکن پانی کے دوسرے وقفے کے بعد بھی خانہ بدوشوں کا مرغا ریاست والوں کے ست رنگے پر بھاری پڑنے لگا تھا۔

"یہ کیا بات ہے حکیم جی، کہ وقفے پر بےگھروں کا پرندہ ہمارے جانور سے زیادہ تازہ دم ہو جاتا ہے؟" ظہور حیرت سے بولا تھا۔

حکیم صاحب نے اپنا منہ ظہور کے کان کے نزدیک لا کر سرگوشی کی تھی: "خانہ بدوش اپنے ساتھ مرغی بھی لے کر آئے ہیں اور وقفے پر اپنے مرغے کو آرام دینے کے بجائے اسے مرغی کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے ان کے جانور کی طبیعت کھلتی ہے اور وہ پھر جان پکڑ جاتا ہے۔"

"لیکن ہم تو ایسا کبھی نہیں کرتے۔"

"یہ صرف ان زناکاروں کا طریقہ ہے۔" حکیم صاحب بڑبڑائے تھے۔

لیکن ریاست کے اصیل پرندے نے اپنے سے کہیں زیادہ بھاری حریف کے حملے جی داری سے برداشت کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اسے واپس رگیدنا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران اس کا سینہ چھلنی ہو گیا تھا، اور اب دیکھنے والوں کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ زمیں پر گرنے والا خون خانہ بدوشوں کے سنہرے کی پھوٹ بہنے والی آنکھ سے ٹپکا ہے یا ست رنگے

کے سینے اور گردن کی کٹی پھٹی شریانوں سے اُبل پڑا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لمحہ آ گیا جب دونوں جاندار ایک دوسرے کے لہولہان وجود سے یوں لپٹ گئے تھے جیسے اپنا بوجھ اپنے حریف کی ٹانگوں پر ڈالنا چاہتے ہوں۔

تیسرے پانی پر حکیم صاحب نے گڑ اور باداموں اور منقّا کا مرکّب تیار کر کے ست رنگے کی چونچ کے اندر دھکیل دیا تھا اور شاں پور کے خدمت گاروں سے اس کی ٹانگیں اپنی ہدایات کے مطابق دبوائی تھیں۔ اور جب گرم پھونکیں مارنے کی باری آئی تو انھوں نے ظہور کو ہٹا کر خود اپنا منہ اس کی پیٹھ سے جوڑ دیا تھا۔ اسی دوران موقع پا کر ظہور خانہ بدوشوں کی ٹولی کی طرف گیا تو اس کی فحش گالی اس کے تمام ننھیالی بزرگوں نے سنی تھی۔

خانہ بدوشوں کا مرغا سر سے پاؤں تک خون میں لتھڑا ہونے کے باوجود ایک چھوٹی عمر کی سفید مرغی سے کھیل رہا تھا اور اٹکھیلیوں کے دوران مرغی کے سفید چمک دار پَروں پر اس کے خون کی دھاریاں عجیب طرح کے نقش و نگار بنا رہی تھیں۔

شاں پور والوں کی خشک برساتی ندی میں بہار کے پہلے جوڑ کا دردناک حصّہ پانی کے تیسرے وقفے کے بعد شروع ہوا تھا جب بےگھروں کا سنہرا حسبِ سابق چھوٹتے ہی اپنے حریف کو مستقل پھسکاں مارتا ہوا دائرے کے وسط سے اس جگہ تک دھکیلتا چلا گیا تھا جہاں شاں پور کے گھبرو بھڑک دار کپڑے پہنے سگریٹ کی پھٹی ہوئی ڈبیوں کو الٹا کر کے اپنے گھٹنوں پر رکھے شرطوں کا حساب لگا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے اور وقفے وقفے سے اپنے رقم لگے مرغے کو بہ آواز بلند داؤپیچ بتا رہے تھے۔ ریاست والوں کے پرندے کا پانی کے وقفے کے فوراً بعد کمزور پڑ کر پیچھے ہٹتے چلے جانا وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے، مگر اس دفعہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی زمیں کو واپس حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا تھا اور تمام جوابی اُچھالوں میں اپنے حریف سے ہوا میں ٹکرانے کے بعد کچھ اور پیچھے کی طرف پلٹ کر گرا تھا اور آخرکار جب اس نے سانس درست کرنے کے لیے اپنی چونچ مدمقابل کے سینے میں چھپانے کی کوشش کی تو مجمعے پر ہولناک سکوت طاری ہو گیا تھا۔

اگر ریاست کے جانور نے مقابلے کے ابتدائی لمحوں ہی میں اپنے حریف کی آنکھ نہ ضائع کر دی ہوتی تو شاں پور والے کبھی اس پر بڑی رقمیں لگانے کی غلطی نہ کرتے۔

اس موقعے پر ظہور نے مقابلے کو دوبارہ بیچ میدان میں لے جانے کے بہانے چیل کی طرح جھپٹ کر اپنا مرغا اٹھا لیا تھا اور اس دوران مرغے کا منہ اپنے منہ میں ڈال کر اس کی آنکھ اور چونچ میں جم جانے والے خون کو چُوس کر صاف کرنے کی کوشش کی تھی، جس پر خانہ بدوشوں کی ٹولی سے دھیمی سی صدائےاحتجاج بلند ہوئی تھی۔

"پانی سے پہلے پرندے کو ہاتھ لگانا نہیں بنتا!"

اگر یہ بات خانہ بدوشوں میں سے کسی نے کہی ہوتی تو ظہور اس کا سر پھاڑ دیتا، مگر اعتراض کرنے والا اس کا بڑا ماموں تھا جو اصولوں کی اتنی کھلی خلاف ورزی کرنے پر شرما گیا تھا۔ یہ بات بچوں تک کے علم میں تھی کہ سوائے اس صورت کے کہ پرندے کی چونچ میں حریف کے بدن کا کوئی پَر پھنس جائے۔ لڑائی کے دوران اسے بازوؤں میں اٹھا لینا تو درکنار،

Scanned with CamScanner

ہاتھ سے تھپتھپانا بھی منع تھا۔

"میں چوتھا پانی کرا رہا ہوں۔" ظہور نے انتہائی خجالت سے جواب دیا تھا۔

ہجوم پر چھانے والا سکوت مزید ہولناک ہو گیا تھا۔ ریاست والوں نے پہلے چار پانیوں کے قانون پر اعتراض کیا تھا اور اب خود چوتھے پانی کے لیے مقابلہ رُکوا رہے تھے۔

آخری وقفے کے دوران، سوائے ان لمحوں کے جب حکیم صاحب نے مرغے کو کشتہ کھلایا تھا، بقیہ تمام وقت ظہور خود اپنے ست رنگے کے ساتھ لپٹا رہا تھا۔ اس نے سوئی دھاگے کے ساتھ اس کے سینے اور کلغی کے زخموں کو ٹانکے لگائے تھے اور اپنے منہ میں چبائے ہوئے کھوپرے کے ریزے زبان پر رکھ کر اس کا تمام بدن چاٹا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی دُم اٹھا کر منہ سے ٹھنڈے پانی کی پچکاریاں مارنے کا کام بھی اس نے خود انجام دیا تھا۔ اور تمام کاموں کے دوران وہ اس سے ہمدردی کی باتیں کرتا رہا تھا اور اپنی آنکھوں میں بار بار جمع ہو جانے والے آنسوؤں کو سر کے جھٹکے سے دائیں بائیں گراتا رہا تھا۔ ان تمام کاموں کے بعد بچ جانے والے وقت میں اس نے اپنے پالتو کو چادر میں لپیٹ کر بازوؤں میں اٹھا لیا تھا اور اسے گرم سانس کی پھونکیں مارنے کے ساتھ ساتھ پلکورے دیتا رہا تھا۔

جب حتمی مقابلے کے لیے ظہور نے اپنا پرندہ میدان میں اتارا تو وہ سر سے پاؤں تک لعاب دہن کے ساتھ چپکائے ہوئے کھوپرے کے سفید ٹکڑوں سے اٹا ہوا تھا، جب کہ خانہ بدوشوں کا سنہرا اسی طرح لہو میں لتھڑا ہوا واپس آیا تھا۔

"زناکاروں نے اسے اس دفعہ بھی صرف مرغی کے ساتھ چھوڑے رکھا ہے۔" حکیم صاحب پھر بڑبڑائے تھے۔

آخری پانی کے بعد بھی ابتدائی چند لمحوں میں خانہ بدوشوں کے قندہاری حسب نسب والے اصیل نے اپنے بھاری تن و توش سے ایک مرتبہ پھر فائدہ اٹھایا تھا، مگر اس مرتبہ اس کی کامیابی اتنی بھرپور ثابت نہیں ہوئی تھی اس لیے کہ ریاست والوں کا ست رنگا پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونے کے بعد انتہائی پھرتی سے جھکائی دے کر سنہرے کے حاوی ہوتے ہوئے پروں کے نیچے سے باہر نکل آیا تھا اور اس کے بعد اس نے میدانی علاقوں کی لڑاکا نسلوں کی مخصوص پھرتی سے کام لیتے ہوئے مسلسل کئی ایسے پینترے دکھائے تھے جس سے اس کے حریف کا سر چکرا گیا تھا اور ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ مقابلہ جو سنہرے کی طاقت اور ست رنگے کی پھرتی کے درمیان شروع ہوا تھا، اب فقط بہتر سانس کا مسئلہ ہو کر رہ گیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کون زیادہ دیر اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہتا ہے۔ شرط یہ تھی کہ کس کا دَم دیر میں ٹوٹے گا۔

دونوں مرغوں کو لڑتے ہوئے تین گھنٹے گذر چکے تھے اور فضا پر ہولناک سکوت طاری تھا۔ دونوں حریف اب اس حالت کو پہنچ چکے تھے جب وجود میں زندگی کے آثار آہستہ آہستہ معدوم پڑنے لگتے ہیں اور اعضا میں موت کے سائے ناتوانی کی شکل میں پھیلتے ہیں اور اعلیٰ حسب نسب والے جانوروں کو احساس ہو جاتا ہے کہ مدمقابل بہت سخت جان اور ضدّی نکلا اور ان کی آخری خواہش یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خود مرنے سے پہلے اسے بھی مرتے ہوئے دیکھ

لیں۔

آخرکار جب حملہ کرنے اور مدافعت کی تمام قوّت اور صلاحیت خرچ کر دینے کے بعد دونوں مرغے ایک دوسرے کے سینے سے سینہ جوڑ کر بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے تو شاں پور والوں کے چہروں پر آنے والے لمحوں کا خوف سائے سے ڈھل گیا، جب کہ خانہ بدوشوں کی ٹولی میں پہلی مرتبہ زندگی کی ہلچل نمودار ہوئی۔

دونوں ٹولیوں کی بڑی اور پہلی توقعات کے عین مطابق لڑائی کے اس مرحلے میں سنہرے نے جلد ہی، اپنی طویل القامتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، بغیر حرکت کیے اپنی چونچ کے نیچے کھڑے ست رنگے کی کلغی اور گردن نوچنا شروع کر دی تھی۔ جب ریاست کا نسلی پرندہ اپنی جان توڑ کوشش کے باوجود جوابی حملے کے لیے جست لگانے سے معذور رہا تو وہ خانہ بدوش بوڑھا جو کسی دائمی خزاں رسیدہ درخت کی طرح جگہ جگہ سے ٹیڑھا کھڑا ہوا تھا اور مقابلے کی ابتدا میں سنہرے کی آنکھ ضائع ہونے پر اپنا سینہ کوٹ کر ناتوانی اور صدمے سے زمین پر بیٹھ گیا تھا، بیاختیار اپنی ٹیڑھی ٹانگوں پر اچھل کھڑا ہوا اور چیخا، "جی او شیرا!"

بوڑھے کے بدبانی نعرے نے ایک لمحے کے لیے ظہور کی نظریں میدان کے وسط سے اکھاڑ دیں اور پھر اس کی آنکھیں انتہائی تیزی سے پھیلنے کے بعد سکڑ گئیں اور بوڑھے کی دائیں بغل پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جس میں اس نے خوب صورت سفید پروں والی نرم و نازک مرغی داب رکھی تھی۔

مرغی کے پروں پر سنہرے کے خون سے بنے نقوش بدستور موجود تھے اور وہ بار بار پلکیں جھپکا کر اپنے ساتھی کو حریف پر حاوی ہوتے دیکھ رہی تھی۔

ظہور کی پہلی چیخ اس پاس کے ٹیلوں پر سینہ پھلا کر کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے اصیل مرغوں کی غصیلی بانگوں تلے دب سی گئی تھی اور صرف حکیم صاحب کے کانوں تک رسائی حاصل کر سکی تھی، مگر دوسری مرتبہ وہ میدان کے وسط میں پہنچ کر اپنے مرغے کو اٹھاتے ہوئے چیخا تھا، "ٹھیک ہے، بڑے ماما جی! ٹھیک ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے، خون میں ڈوبے ست رنگے کو بازوؤں میں تھام لیا تھا۔

شام ڈھلے جب ظہور کی جیب حویلی کے صحن میں داخل ہوئی تو اس کی نئی نویلی دلھن اس کے بگڑے ہوئے تیوروں سے سب کچھ سمجھ کر سہم گئی اور اپنے دوپٹے کی اوٹ سے اسے حکیم صاحب سے علاج معالجے کے سلسلے میں مشورے لیتے دیکھتی رہی۔ حکیم صاحب کو رخصت کر کے وہ اپنا نیم مُردہ مرغا اٹھائے بیٹھاروں والے کمرے میں چلا گیا اور وہیں سے چیخ چیخ کر نوکروں کو مختلف مرہموں اور معجونوں کے لیے ادھر اُدھر دوڑاتا رہا۔ رات گئے وہ بیٹھاروں والے کمرے سے نکلا اور کپڑے بدلے بغیر بستر پر لیٹ کر خاموشی سے سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا۔ آدھی رات کو اس نے دفعتاً ساتھ لیٹی ہوئی دلھن کا کمبل کھینچ کر فرش پر پھینک دیا اور اس کے لمبے بالوں کو مٹھی میں لپیٹ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر کے اسے خواب گاہ کے مدّھم روشنی والے بلب کے نیچے تک گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ چند لمحوں تک وہ نیم تاریکی میں اپنی کانپتی ہوئی بیوی کا خوب صورت چہرہ غور سے دیکھتا رہا، اور پھر تحکّمانہ لہجے

Scanned with CamScanner

میں بولا، "اس وقت تُو بتھیاروں والے کمرے میں جا کر اُس کے ساتھ بیٹھ۔ صبح دوسرا انتظام ہو جائے گا۔"

صغیر ملال

معذور

"آج یہاں بہت بھیڑ ہے۔" کوڑھی فقیر نے شب بسری کی جگہ پہنچ کر اپنے برداشتے سے کہا۔

"ہاں، کچھ زیادہ ہی ہے۔" برداشتے نے کوڑھی کی ریڑھی اشتہاری بورڈ کے نیچے روکتے بےپروائی سے جواب دیا۔

جتنی دیر برداشتیا دن بھر کی کمائی نکال کر مختلف مالیت کے سکّوں کے الگ الگ ڈھیر بناتا رہا، کوڑھی کاروں کے لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے ہجوم کو حیرت سے دیکھتا اور اپنے مسخ شدہ چہرے کو ٹُنڈمُنڈ ہاتھوں سے سہلاتا رہا۔

"اتنی زیادہ بھیڑ؟ کیا وجہ ہے؟" کوڑھی سڑک کے کنارے کھڑی گاڑیوں کی بےتحاشا لمبی ہوتی قطار سے گھبرا کر ایک بار پھر بول اٹھا۔

"ہو گی بھیڑ، ہمیں کیا! تو میرا حساب نہ گڑبڑ کر۔" برداشتیے نے جھنجھلا کر جواب دیا اور پھر سے نوٹ اور سکّے گننے لگا۔

انہوں نے گذشتہ چند ہفتوں سے رہی بسیرے کی خاطر ڈسکوتیک کی بلڈنگ کے موڑ پر واقع یہ نیون سائن بورڈ منتخب کر لیا تھا اور سورج ڈوبتے ہی وہ اپنا دھندا ختم کر کے سیدھے یہیں چلے آتے تھے۔

ڈسکوتیک ایک فوراسٹار ہوٹل کی احیکسی میں واقع تھا، لیکن جیسے جیسے ڈسکو کی شہرت بڑھتی گئی تھی، ہوٹل کی انتظامیہ اس کے اشتہاری بورڈ کی طرف سے غفلت اختیار کرتی گئی تھی۔ اب اس کے اوپر کے بلبوں کی قطار میں صرف درمیان کا ایک بلب روشن ہوتا تھا جو رات بھر دھیمی نیلی روشنی ٹپکاتا رہتا تھا۔ بورڈ کے نچلے حصے سے بجلی کے الجھے ہوئے گردآلود تار لٹک آئے تھے جن سے مسلسل شرر شرر کی ہلکی آواز پیدا ہوتی تھی۔

شہر کے وسطی علاقے میں واقع ہونے کے باعث یہاں دن کے اوقات میں اس قدر ہنگامہ رہتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، مگر شام کے سائے طویل ہوتے ہی ساری دنیا سے رابطہ قائم رکھنے والے کاروباری مرکز بند ہو جاتے تھے اور ہر صبح اپنی ذیلی شاخوں سے دوبارہ منسلک ہو جانے والے دفاتر کے شیشے کے نازک دروازوں پر اپنی جالیاں اتر آتی تھیں۔

rekhta

Scanned with CamScanner

اس کے باوجود فٹ پاتھ پر سونے والے اس چوراہے کا رخ نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رات پڑتے ہی اس علاقے میں ذرا ذرا سے فاصلے پر موجود ہوٹلوں کے بال رُومز اور ڈسکوز آباد ہو جاتے تھے جہاں سے تمام رات تندوتیز موسیقی کی لہریں اُبھرتی تھیں اور وہاں آنے جانے والی کاروں کی روشنیاں رات کی تاریکی میں اچانک نمودار ہو کر سڑک کے کنارے سونے والوں کی آنکھوں میں شدت سے چبھتی تھیں اور یوں ان کی نیند میں سمعی اور بصری خلل پڑتا تھا۔

برداشتے نے کچھ عرصہ پیشتر اپنے تیں شاہ دولے کے چوہے بیچ کر یہ ایک کوڑھی خریدا تھا۔ اتنا مہنگا فقیر خریدنے کی وجہ فقط یہ تھی کہ چوہے ادھورے ہونے کے باوجود بہرحال تیں افراد شمار ہوتے تھے اور اس حساب سے ان کی رہائش کے اخراجات تکلیف دہ حد تک بڑھتے جا رہے تھے۔ تیں ناچیز منگتوں کی جگہ ایک بیش قیمت فقیر رکھنے کی خوشی سے وہ ابھی پوری طرح سرشار بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اچانک فٹ پاتھ کے ٹونکو نے ایک نیا قانون نافذ کر دیا تھا جس کے تحت کوڑھی فقیروں کی ریڑھیاں کھڑی کرنے کا الگ سے شیئہ دینا لازمی ہو گیا تھا۔

انھی پریشانی کے دنوں میں وہ ایک شام ٹھکانے پر واپس جاتے ہوئے اس جگہ دیہاڑی گننے کے لیے رکا تھا کہ یکایک اسے سڑک پار کی اونچی اور تیز روشنیوں کے نتیجے میں بورڈ کی پشت پر پیدا ہونے والا گھنا اندھیرا شب بسری کے لیے نہایت موزوں معلوم ہوا تھا۔

ابتدائی چند راتیں انھوں نے موسیقی کے شور اور وقفے وقفے سے گذرنے والی کاروں کی روشنیوں اور بورڈ کے تاروں سے آتی ہوئی شرر شرر کی آواز کے باعث بےآرامی سے گذاری تھیں، مگر انھیں ان تمام چیزوں کا عادی ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔

رقم کے حساب سے فارغ ہو کر جب بچھونا تیار کرنے کے لیے برداشتے نے اپنے فقیر کو اٹھا کر اس کے نیچے سے کمبل اور لوٹیاں نکالیں تو اس سے ایک بار پھر بولے بغیر نہ رہا گیا۔

"آج تو گاڑیاں ساتھ کی گلیوں تک پہنچ رہی ہیں۔ کہیں ہماری ریڑھی نہ اٹھوا دیں۔"

اس بات پر برداشتیا چونک گیا تھا اور اس نے پہلی مرتبہ گردن اونچی کر کے سنجیدگی سے دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی اور پھر ڈسکو کا دروازہ کھولنے والے مچھندر سے اصل بات معلوم کرنے کے لیے ہجوم میں گھستا چلا گیا تھا۔

واپسی پر اس کا چہرہ مسکراہٹ سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ آج پورا ایک سال ہو جائے گا۔"

"کس بات کو پورا ایک سال ہو جائے گا؟" کوڑھی نے حیرت سے بکھرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو تیرے باپ نے مجھے نہیں بتایا۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب انداز کا سردپن شامل ہو گیا تھا۔ "تُو اب سوئے گا۔۔۔" اس نے سسکاری بھرتے ہوئے بات مکمّل کی، "یا فٹ بال بننے کا ارادہ ہے؟"

خوف زدہ کوڑھی کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلی اور اس نے برداشتے کی نگاہوں سے بچنے کے لیے بورڈ کو گھورنا شروع کر دیا۔

اسے خیال آیا کہ سامنے سے دیکھنے پر کبھی کبھی بورڈ کے بلبوں کی اوپر والی قطار میں

واحد روشن بلب کسی آسمانی مخلوق کے ماتھے پر چمکنے والی تیسری آنکھ معلوم ہوتا تھا، اور اس نے خدا کا شکر کیا کہ وہ اس وقت بورڈ کے عقبی اندھیرے میں تھا۔ جونہی اس کی نظر بورڈ کے نچلے حصّے سے لٹکتے ہوئے تاروں پر پڑی، اسے وہ شخص یاد آ گیا جسے کئی سال قبل ایک بازاری لڑائی میں چاقو مار دیا گیا تھا اور وہ اپنے کٹے ہوئے پیٹ سے اُبل پڑنے والی آنتوں کو تھامے ہوئے اس کی ریڑھی کے آگے آ گرا تھا اور اپنے وجود کی پوری قوّت سے سانس لینے کی کوشش میں اس کے منھ سے ایسی ہی شرر شرر کی آوازیں نکلی تھیں۔

اس نے بوکھلا کر بورڈ سے نظریں ہٹائیں اور اپنا سر کمبل کے اندر گھسا لیا۔

سونے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے وہ اونگھنے کی حد تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے آس پاس کی عمارتوں میں داخل ہونے والے تمام لوگ پاگل ہو گئے ہوں۔

شدت اور کثرت میں حد سے زیادہ ہونے کے باوجود اب تک کوئی ایسی حرکت نہیں ہوئی تھی جو عام دنوں میں وہاں بالکل نہ ہوتی ہو۔ اور یہی وہ بات تھی جس کا خود کو یقین دلا کر اس نے ایک حد تک اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا۔ مگر دھماکے اور چیخیں اور بےشمار کاروں کے بیک وقت بجنے والے بھونپو سن کر وہ ایک بار تو یوں اچھل گیا کہ ریڑھی پر خود کو قائم رکھنے کے لیے اسے اپنے ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پاؤں چاروں کونوں میں اٹکانے پڑے۔

چند لمحوں بعد اندھیرے میں ڈوبی ہوئی عمارتوں کی روشنی تو واپس آ گئی، لیکن لوگ اب چیخ پکار کرتے اور غبارے پھوڑتے، باہر سڑک پر نکل آئے تھے۔

اس نے بدستور سوئے ہوئے برداشتے کی جانب منھ موڑ کر رشک اور حسرت سے لبریز آنکھیں جھپکائیں، اور ایک مرتبہ پھر کانوں پر ادھورے بازو دھر کر دوہرا ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک اپنے سامنے ایک ایسے شخص کو کھڑے ہوئے پایا جو پتا نہیں کب بورڈ کے سائے میں پہنچ گیا تھا اور اب ریڑھی کے ساتھ لگ کر نہایت اطمینان سے اپنی پتلون کے بٹن کھول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو ہلکا کرتا، اس نے کائنات کے اس گوشے میں اپنی موجودگی کا اعلان کیا:

"اولاد والو! معذور ہوں۔۔۔ مجبور ہوں۔۔۔"

پہلے تو اس شخص کو یقین نہیں آیا، اور جب یقین آیا تو وہ یوں اچھل پڑا جیسے اس نے کرتب دکھانے کے بعد سرکس کے جھولے کے نیچے تنے ہوئے جال پر چھلانگ لگائی ہو۔

"مائی گڈنیس؟" وہ ریڑھی پر لات مار کر چیخا، "آدھی رات کو بھیک مانگتا ہے، باسٹرڈ؟"

ریڑھی لڑھکتی ہوئی سوئے ہوئے برداشتے کے سینے سے ٹکرائی اور وہ گہری نیند سے یوں اچانک بیدار ہونے کے باوجود صورت حال کو فوراً سمجھ گیا اور اس کے منھ پر لاتیں مارتے ہوئے دہاڑا:

"کوڑھ مغزا یہ کون سا وقت ہے آواز لگانے کا؟"

Scanned with CamScanner

صغیر ملال

پیوند

"اگر پہاڑی بکری جھاڑجھنکاڑ چرتے ہوئے سانپ نکل جائے تو تیسرے دن اس کے منہ سے جھاگ نکلتی ہے۔ اسی جھاگ کا ایک قطرہ سوکھ کر منکا بن جاتا ہے جو زہرچوس کا کام دیتا ہے۔" پہلے نے کہا۔

"صرف بکری کیوں؟ گائے بھینسوں کے ساتھ بھی یہی ہو گا۔" دوسرا بولا۔

پہلا ہنس دیا۔ "زہریلی چیزیں ہضم کرنے کی صلاحیت بکری سے زیادہ کوئی مویشی نہیں رکھتا۔ عام سی بات ہے مگر تم نہیں جانتے۔"

دوسرے کا جی چاہا کہ وہ پہلے کی گردن اس طرح دبائے جیسے اس نے کچھ دیر پہلے سانپ کی گردن پر زور ڈال کر اس کا منہ کھول دیا تھا اور اس کے زہر والے اور خوراک کے دانتوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کی وضاحت کی تھی، اور پھر اس کی کھوپڑی پتھروں پر رگڑ رگڑ کر اسے چوہے کی موت مار دیا تھا۔

لیکن، دوسرے نے سوچا، اس نے سانپ کے منہ پر ریشمی رومال پھینک دیا تھا جس پر ڈنک مار کر وہ دانت الجھ جانے کے سبب بےبس ہو گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ کیا کروں؟

"گیدڑوں کے سردار کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں سفید گیدڑ کے ماتھے میں رسولی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کو گیدڑسنگی کہتے ہیں۔"

پہلے نے سانپ کو اُس وقت ہلاک کیا تھا جب دوسرا خوف کی شدّت سے اپنے گھٹنوں پر بیٹھ چکا تھا، اس لیے اب وہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے مسلسل بول رہا تھا۔

"اگر کہیں سے بُوٹی مل جاتی تو مارنے کے بجائے اس کے دانت کھٹے کر کے جیب میں ڈال لیتا۔" اس نے مُردہ سانپ کو اپنے بُوٹ سے مسلتے ہوئے بےپروائی سے بات جاری رکھی۔

"تم سپیرے کی اولاد ہو۔" دوسرے نے اپنے طیش اور جھنجھلاہٹ کی بہ نسبت بہت ہلکی بات کہی۔

"جتنے دن ہم نے لمبی گلی میں گذارے، مجھے تم دلّے کے بچے لگتے رہے۔"

دوسرے کے دھیان میں اس کے بچپن وقت تمہارے باپ کا چہرہ آ گیا جس کی نسبت پہلے نے یہ بات کہی تھی، اور وہ اپنے حلق سے ایک غیرانسانی آواز برآمد کر کے پہلے کا منہ نوچنے لگا۔

اس سے قبل وہ ایک مرتبہ لمبی گلی میں ہاتھاپائی کر چکے تھے۔

کچہری سے فرار ہونے کے بعد انھوں نے طےشدہ منصوبے کے تحت بائی جی کے گھر پناہ حاصل کی تھی۔ دوسرا جیل جانے سے قبل بائی جی اور ان کی نوچیوں کو سر سے پاؤں تک چوری کے زیورات سے لاد چکا تھا اور گرفتار ہونے پر بدن کے سارے ناخن اور بال کھنچوا دینے کے باوجود اس نے پولیس کو مسروقہ سامان کی برآمد کے سلسلے میں لمبی گلی کا رخ نہیں کرنے دیا تھا۔

جب وہ مفروری کے بعد بائی جی کے دربار میں اچانک حاضر ہوا تو اسے دیکھ کر بائی جی کا جلالی چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور خوف سے ان کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

"بائی جی جگرے والی عورت ہے۔" بعد میں دوسرے نے پہلے کو بتایا تھا۔ "اگر میں اکیلا ہوتا تو کبھی نہ ڈرتی۔ لیکن نئے آدمی کو ساتھ بندھے دیکھ کر بڑا بڑا جواں گھبرا جاتا ہے۔"

مگر دوسرے نے ویس کھڑے کھڑے بائی جی کا خوف اور شک شبہ دور کر دیا تھا اور انھیں بتایا تھا کہ دوہری پتھکڑی میں اس کے ساتھ بندھا ہوا شخص دیہاتی علاقوں کا مشہورومعروف اور انتہائی چابک دست نقب زن ہے اور یہ کہ جیل میں انھوں نے بھائی بندی کی قسم کھائی تھی اور ایک دوسرے کے سہارے بہت اچھا وقت گذارا تھا۔

بائی جی نے انھیں تماش بینوں کی نظروں سے بچانے کے لیے گلی کے پچھلے رخ پر واقع صندوقوں اور بکسوں سے بھرے ہوئے ایک نیم تاریک اور سیلن زدہ کمرے میں گھسا دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ پتھکڑی کاٹنے کے لیے وہ بہت جلد کسی اعتبار والے کاریگر کا انتظام کر دیں گی۔

چند دنوں تک وہ بکسے کھول کر رنڈیوں کے پرانے فیشن کے رنگ برنگے کپڑے نکال کر ان کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے اور لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے صندوقوں کے منہ کھول کر گرمیوں کے ایام میں بےکار ہو جانے والی ریشمی رضائیاں اور سویٹریں نکال لی تھیں جو مہینوں بعد بھی شہوت انگیز خوشبوؤں سے لبریز تھیں، اور ان سے لپٹ کر خود کو تفریح مہیا کی تھی اور خوش وقت ہوئے تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک دن تاریک کوٹھوں کوٹھڑیوں میں بڑے ٹوٹے پھوٹے گھنگھرو پاؤں سے باندھ کر ناچنے لگے تھے جس پر بائی جی بغیر دوپٹا اوڑھے، نیم تاریک اور سیلن زدہ اسٹورروم میں دوڑی چلی آئی تھیں اور انھیں ہوش میں آنے کی ہدایت کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر یقین دلایا تھا کہ پتھکڑی کاٹنے والے قابل اعتبار کاریگر کی آمد بس ایک دو دن کی بات ہے۔

اس نیم تاریک کوٹھڑی میں ازخود دوسرے کی بالادستی قائم ہو گئی تھی، کیونکہ پناہ دینے والی اس کی شناسا اور زیرباز احسان تھی۔ اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ پہلا قصبات اور دیہاتوں کا وارداتی تھا اور اس ماحول سے قطعی ناآشنا تھا جس میں دوسرا اور وہ مفروری کے دن کاٹ رہے تھے۔ دوسرے نے اسے عورتوں اور مردوں کی، ذلیل ڈول اور عادات و اطوار کے لحاظ سے، مختلف اقسام سمجھائی تھیں اور اپنے بارے میں اعلیٰ ترین کوک شاستری مرد ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور بائی جی کی اُس نوچی کو اپنا جوڑ بتایا تھا جسے دیکھ کر پہلے نے سوچا

Scanned with CamScanner

تھا کہ آخر اس قدر بھرے ہوئے جسم کو اتنے نازک پاؤں کیسے سنبھال لیتے ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کے دل میں اسے رقص کرتے ہوئے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی۔

ایک رات وہ خاموش بیٹھے، مکان کی بیٹھک سے آنے والی ناچ گانے کی آوازیں سن رہے تھے کہ پہلے نے اچانک دوسرے کو مخاطب کر کے کہا تھا، "جیل میں تم کہا کرتے تھے کہ رنڈیوں میں تمھاری بڑی عزّت ہے۔"

"تو یہ کیا تم اپنی ماں کے گھر بیٹھے ہو؟" اس روز دوسرے نے نرم بات کا جواب تلخی سے دیا تھا، اور نتیجتاً وہ دونوں پہلی مرتبہ ایک دوسرے کا سر پھاڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ بات باہم دست و گریباں ہونے سے آگے بڑھ کر خون خرابے تک پہنچتی، بائی جی اور ان دنوں نسوانی تکلیف میں مبتلا ہونے کے باعث گھر کے پچھلے کمرے میں آرام کرنے والی ایک نوچی بیچ بچاؤ کے لیے پہنچ گئی تھیں۔

اس رات سونے کے لیے بڑے صندوق پر بستر بچھاتے ہوئے پہلے نے کہا تھا، "دوبارہ گرفتار ہو گئے تو جیل میں کھولی بھی نہیں ملے گی۔ بند وارڈ میں ڈال دیے جائیں گے۔ الگ الگ۔ مفروروں کی سزا پتا ہے؟"

دوسرے نے خوف سے زرد ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اگلے دن وہ تمام وقت شدید جھنجھلاہٹ کا شکار رہے تھے۔ پہلے کا جی چاہا کہ جیل کی طرح کوئی اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو اور دیر تک سونے پر گالیاں دیتے ہوئے اسے کھاد کے ٹوکرے ڈھونے کے لیے لے جائے۔ اسے یاد آیا کہ فضلے کی بنی ہوئی کھاد سے اکثر جونکیں اُبل پڑتی تھیں اور بعض اوقات جسم کے کسی حصے کی خارش دور کرنے کے لیے لاشعوری طور پر ہاتھ بڑھایا جاتا تو انگلیوں سے کوئی جونک لپٹی چلی آتی اور وہ اپنی اُبکائیاں روکنے کی خاطر پاک صاف چیزوں کو دھیان میں لاتا تھا۔ ایک مرتبہ تو جونک اس کی پنڈلی سے اس طرح لپٹی کہ کھنچے جانے پر لمبی ہوتی چلی گئی لیکن الگ نہیں ہوئی۔ آخر اسے حوالدار کا سلگتا ہوا سگریٹ لگایا گیا، اور جب اس نے وہ سگریٹ واپس کیا تو حوالدار نے ڈنڈا اس کے ہاتھ پر مار کر کہا تھا، "یہ غلاظت اب تیرا باپ پیے گا؟" فوراً کئی قیدی اس سگریٹ پر جھپٹ پڑے تھے اور وہ متلاہٹ پر قابو پانے کے لیے سینہ تھام کر دوہرا ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح کا کام کرتے ہوئے ایک ایک لمحہ گن گن کر کاٹتا اور اس خیال سے خوش ہوتا کہ شام کو دوسرے سے ملاقات ہو گی جس سے اس کی شناسائی کی مدّت چند مہینوں سے زیادہ نہیں تھی، مگر وہ اس مختصر عرصے میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ بیگار پر جاتے ہوئے دوسرا اکثر اس سے اس سے کہتا، "اگر سبزیوں کے باغ میں کتّے خصّی کرنے کے لیے یہ حرامزادے تجھے بھی میرے ساتھ بھیج دیں تو ان کا کچھ نہیں بگڑتا، مگر ہمارا وقت تو چٹکیاں بجاتے گذرے گا۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟" دوسرے کے دل میں طویل خاموشی سے ہول اٹھنے لگا تھا۔

"تمھیں یاد ہے؟" پہلے نے کہا، "جیل میں جب وہ ہمیں الگ الگ بیگار پر لے جاتے تھے تو ہم دل میں انھیں کتنی گالیاں دیتے تھے؟"

"ہاں۔"

"اور آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ کہیں جا کر گندگی کے ڈھیر اٹھاؤں۔"

"اصل میں۔۔۔" دوسرا دہشت زدہ ہو کر بولا تھا، "تمھیں یہ خیال اس لیے آیا کہ ہم یہاں بھی قید ہو گئے ہیں۔"

اور پہلے نے فوراً اس سے اتفاق کا اظہار کیا تھا۔

"تو تم بائی جی سے اجازت مانگو۔ اتنے دنوں میں تو میں اپنے گاؤں کے لوہار سے یہ کام کرا سکتا تھا۔ اور پھر جب تک یہ کام نہیں ہوتا، کم از کم کھلے علاقے میں آزادی سے تو رہیں گے۔"

بائی جی نے انھیں رخصت کرتے ہوئے اپنے پیشے کے آداب کے مطابق انتہائی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا تھا۔ "تم جانتے ہو کاریگر کے ذریعے بات نکل سکتی تھی۔ کتنا اعتباری آدمی چاہیے! دوبارہ پکڑ لیے گئے تو؟"

"ہاں ہاں، جانتا ہوں۔" دوسرے نے انتہائی غضب ناک لہجے میں بائی جی کی بات کاٹی تھی، "اگر دوبارہ پکڑ لیے گئے تو وہ تیری ماں کے شوقین ہمیں بند وارڈ میں ڈال دیں گے۔ الگ الگ۔"

ایک لمحے کے لیے بائی جی کی حالت یوں ہو گئی تھی جیسے کوئی خاندار عورت گھر کا کام کاج کرتے ہوئے نادانستگی میں کسی چھپکلی کے بالکل سامنے آ گئی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے سے تمام حیرت اور خوف اور کراہت دور ہو گئی تھی اور انھوں نے عجیب طرح سے مسکراتے ہوئے کہا تھا، "تمھارے غصّے سے پتا چلتا ہے کہ تم کتنے خوف زدہ ہو۔" اور پہلا بائی جی کی مردم شناسی پر حیرت سے منھ کھول کر انھیں دیکھنے لگا تھا۔

لمبی گلی سے نکل کر انھوں نے تین دن آرام اور تین راتیں مسلسل سفر کیا تھا۔ ان کی منزل اب دوسرے ضلعے کی آخری تحصیل کا ایک دورافتادہ اور گمنام سا گاؤں تھا۔ یہ ضلعوں اور تحصیلوں کا چکّر بھی پہلے نے دوسرے کو سمجھایا تھا۔ اور یہیں سے پہلے کی رہبری اور برتری کی ابتدا ہوئی تھی۔ وہ جوں جوں بڑے شہر سے دور ہوتے گئے تھے، دوسرا کمزور پڑتا گیا تھا۔ اس کی یہ کمزوری روحانی اور جسمانی سطحوں پر واضح ہوتی چلی گئی تھی۔ اس نے ابتدا میں یہ حساب رکھا تھا کہ وہ اب کس تھانے کی حدود سے نکل کر کس تھانے کی عملداری میں داخل ہو گئے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ اس کے نیچے کی زمین اور اوپر کے آسمان کا رنگ بدلتا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی تھانوں کے نام قرب و جوار کے علاقوں کی طرح اجنبی اور نامانوس ہوتے گئے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کون سی جھاڑی کے خوفناک شکل و صورت کے پھلوں میں لذیذ اور بےضرر رس موجود ہے اور کس معصوم اور گھریلو نظر آنے والے درخت میں زہریلا مادّہ پایا جاتا ہے۔ اسے خوفناک طریقے سے سر کے اوپر جھکی ہوئی چٹانوں کے سائے میں سونے کا کوئی تجربہ نہیں تھا، جبکہ پہلا، جو وارداتوں کے بعد ہمیشہ جنگلوں میں روپوش ہو جاتا تھا، ایسی جگہوں پر بیٹھنے کے چند لمحوں بعد منھ کھول کر خرّاٹے لینے لگتا تھا جس سے دوسرے کو بڑی وحشت ہوتی تھی۔ اب اسے اس بات میں بھی پہلے کی سازش نظر آتی تھی کہ اس نے مفروری والے دن، عدالت میں پیشی کے لیے روانہ ہوتے ہوئے، مشترکہ ہتھکڑی میں اپنا بایاں بازو

Scanned with CamScanner

ڈالا تھا اور دایاں آزاد رکھا تھا، جب کہ دوسرے کو اپنا دایاں بازو قابو کرانا پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی موٹی جھڑپوں میں پہلا فوراً اپنا طاقتور بازو استعمال کر کے دوسرے کو اس طرح دبوچ لیتا تھا کہ اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔

جب وہ رات کی تاریکی میں شہر کی حدود سے باہر نکلے تھے تو پہلا خوشی سے بےقابو ہو کر اپنی غیرمتوازن آواز میں کوئی دیہاتی گیت گانے لگا تھا جو دوسرے کی سماعت پر مسلسل خراشیں ڈالتا رہا تھا۔ ویرانے میں داخل ہوتے ہی پہلے کو دو طرح کی آزادیوں کا بیک ساعت احساس ہوا تھا؛ یہ کہ وہ بائی جی کی کال کوٹھڑی سے نکل آئے تھے، اور یہ کہ شہر کی فضا سے نکلتے ہی وہ دوسرے کی بالادستی کے حصار سے بھی رہا ہو گیا تھا۔ اس نے صبح تک جنگلوں اور بیابانوں میں اپنی سابقہ روپوشوں اور پولیس مقابلوں کی داستانیں ایسے لہجے میں بیان کی تھیں جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دوسرے کے ماضی کو اپنے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ دراصل وہ کچہری سے فرار ہوتے ہی ایک ایسے ماحول میں داخل ہو گیا تھا جس کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا، اور یہی وجہ تھی کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں ناچیز ہوتا چلا گیا تھا۔ اور اب اپنی جانی پہچانی فضاؤں میں سانس لیتے ہی وہ بائی جی کے گھر میں گذارے ہوئے چند دنوں کے ردعمل میں لاشعوری طور پر پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے دوسرے کو اس علاقے کی بولیوں اور وہاں کے لوگوں کی عادات و اطوار کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ دوسرا جانتا تھا کہ پہلا یہ سب کچھ نیک نیتی سے ہرگز نہیں بتا رہا بلکہ اسے متاثر اور مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اب وہ ایسے دشوارگذار علاقوں اور پُرپیچ راستوں میں پھنس چکا تھا جہاں سے شہر لوٹنے کے لیے بھی اسے پہلے کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ دوسرے کی مبالغہ آمیز باتیں سنتا رہتا اور تائید میں سر ہلاتے ہوئے اکثر سوچتا کہ آخر وہ کون سی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر پہلا جیل کی چند دنوں کی رفاقت کے دوران اسے اتنا عزیز ہو گیا تھا کہ صبح کو بیگار پر جانے کے لیے اس سے جدا ہونے پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے، اور آخرکار انھوں نے ایک دوسرے کا مستقل قرب حاصل کرنے کے لیے فرار کا منصوبہ بنایا تھا اور بھائی بندی کی قسمیں کھائی تھیں۔

مسلسل سفر اور کم خوراکی کے باعث ان کی آنکھیں اندر کو دھنس گئیں تھیں اور چہرے کی ہڈیاں خوفناک انداز میں ابھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ بائی جی کے عطاکردہ کپڑوں کے جوڑے جگہ جگہ سے ادھڑ گئے تھے۔ اور اب ان کا واحد سہارا وہ چادر تھی جو دن کے وقت مشترک بستھکڑی چھپانے کے کام آتی اور رات کو مچھروں اور دوسرے زہریلے کیڑے مکوڑوں کے خلاف مضبوط دفاع ثابت ہوتی۔ انھیں اپنی اجڑی ہوئی حالت کا علم دوسرے کے سراپے پر نگاہ ڈالنے سے ہوتا تھا، اس لیے اب وہ ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھنے سے بچتے تھے۔

"اگر یہ بستھکڑی نہ ہوتی تو میں کہیں جا کر داڑھی منڈاتا اور خوب صابن مَل مَل کر نہاتا۔" ایک دن پہلے نے دوسرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

"اور میں کہیں جا کر پیٹ بھر کے کھانا کھاتا۔" دوسرے نے پہلے کی جلی ہوئی رنگت اور ڈھانچا بنے ہوئے وجود پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"بستھکڑی نہ ہوتی تو تم دیکھتے میں کیا کرتا۔"

"بستھکڑی نہ ہوتی تو میں تمھیں کیوں دیکھتا، خود کسی دھندے سے نہ لگا ہوتا؟"

پہلا خاموش ہو گیا تھا، اس لیے کہ وہ اب خود میں لڑنے کی کوئی خواہش نہیں پاتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ شہر کی فضا سے نکل کر جیسے جیسے دوسرے کی کمزوریاں نمایاں ہوتی گئی تھیں، وہ اسی حساب سے چڑچڑا اور کٹکھنا ہوتا چلا گیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ پہلے کا دایاں بازو آزاد تھا اور اسی کی مدد سے وہ چھوٹتے ہی دوسرے کو قابو کر لیتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے کے بتدریج نڈھال ہوتے ہوئے جارحانہ رویّے سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور اب شادونادر ہی ایسی کوئی بات کرتا تھا جس سے دوسرا خود کو مزید حقیر محسوس کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے کی ذہنی کیفیت اس حد تک ابتر ہو جائے کہ وہ کسی نازک جگہ پر چیخ پکار کر کے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔ دوبارہ گرفتار ہونے کی صورت میں مجرموں کو سزا کے طور پر تنہا قید کر دیا جاتا تھا، اور جیل میں مشہور تھا کہ چند دنوں تک اکیلا بند ہونے والا مجرم بہت کم اپنی کھوئی میں بقائمی ہوش و حواس واپس آتا تھا۔ پہلا ماضی میں کئی مرتبہ سزائیں کاٹ چکا تھا، مگر بند وارڈ سے جیل کے پاگل خانے میں منتقل ہونے کے بارے میں سوچ کر اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل جاتی تھی۔

برچند کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں بہتر حالت میں تھا، لیکن آج اس نے دیہاتی زندگی کے تجربے کو بروئےکار لاتے ہوئے ایک انتہائی ضرررساں سانپ کو آسانی سے ہلاک کر دینے پر دوسرے سے داد طلب کی تھی، جس پر دوسرے نے اسے "سپیرے کی اولاد" کہا تھا، اور یہ ایک ایسی کمینی بات تھی کہ جواب میں اسے بھی تلخ ہونا پڑا تھا۔

نتیجتاً وہ بہت شدّت سے لڑ پڑے تھے، اور آج دور دور تک کوئی بیچ بچاؤ کرانے والا نہیں تھا۔

پہلی مرتبہ ان کے درمیان بائی جی کے گھر کی کوٹھڑی میں زوراوری ہوئی تھی، لیکن اس کے بعد معاملہ ہمیشہ نوچ کھسوٹ اور چھیناجھپٹی تک محدود رہا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ناہموار راستوں پر چلتے ہوئے دوسرا عموماً زیادہ تھک جاتا تھا اور آزاد دائیں بازو کے ساتھ پہلے کے لیے اسے فوراً زیر کر لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن آج دوسرے نے لڑائی کو کشتی میں تبدیل نہیں ہونے دیا بلکہ ابتدا ہی سے دست بدست لڑائی کے اصول برتے تھے، اور اسٹریٹ فائٹنگ میں اس کا تجربہ بےحد وسیع تھا۔

اس سے قبل کہ پہلا اس سے گتھم گتھا ہوتا، دوسرے نے اپنے آزاد بائیں پنجے سے اس کے سر کے بالوں کی گرفت لے کر پوری طاقت سے جھٹکا دیا، جس کی وجہ سے وہ ایک لمحے کے لیے آگے کو جھک گیا، اور اس سے قبل کہ پہلا رکوع کی حالت سے واپس پلٹتا، دوسرے کے گھٹنوں کی ضربیں اس کے ہونٹوں اور آنکھوں کو مسخ کر گئیں اور وہ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ مزید آگے کو بل کھا گیا۔ پہلے کے چہرے کو خون آلود ہوتا دیکھ کر دوسرے کا غصّہ وحشت میں تبدیل ہوتا گیا اور اس نے یکے بعد دیگرے دایاں بایاں گھٹنا چلانے کے بجائے بیک ساعت دونوں گھٹنوں سے اس کے چہرے پر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ چند ہی لمحوں میں پہلا نیم جاں ہو

Scanned with CamScanner

کر زمیں پر ڈھیر ہو گیا اور اپنی کٹی پھٹی آنکھوں سے دوسرے کو یوں دیکھنے لگا جیسے چوزوں والی مرغی دور کہیں نیلی فضاؤں میں مکّاری سے چکّر لگاتی ہوئی چیل کو دیکھتی ہے۔

دوسرے نے پہلی مرتبہ مکمّل فراغت کے ساتھ اپنے حریف کے لرزتے ہوئے وجود کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اور یہی وہ لمحہ تھا جب اُس کے دل میں ایک وحشی خیال نے جنم لیا۔ اور ٹھیک اسی لمحے پہلا پیشہ ور چوروں کی مخصوص حسّیات کے ذریعے اس کے خیال کو بھانپتے ہوئے بھیانک آواز میں چیخا "نہیں، نہیں! اس طرح مت کرنا! ہم دونوں آج ہی آزاد ہو سکتے ہیں۔"

شام ڈھلے جب وہ اس دورافتادہ چوکی میں داخل ہوئے تو سپاہیوں نے اپنی ہانڈی سے حصّہ دے کر انھیں بولنے کے قابل بنایا۔ بیانات تحریر کروانے کے بعد جوں ہی انھوں نے علیحدہ علیحدہ بند کیے جانے کی درخواست کی، چوکی کے انچارج نے انھیں حوالات کے آہنی دروازے کے اندر دھکیلتے ہوئے کہا:

"تم ڈسٹرکٹ جیل کے مفرور ہو۔ تمھاری ہتھکڑی کی چابی سے ہمارا کیا تعلّق ہے؟"

صغیر ملال

قیمت : پچاس روپے

آج کی کتابیں
بی ۱۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

کلاسیک
شاہراہ قائداعظم لاہور

تامس اینڈ تامس بک سیلرز
صدر کراچی

Scanned with CamScanner